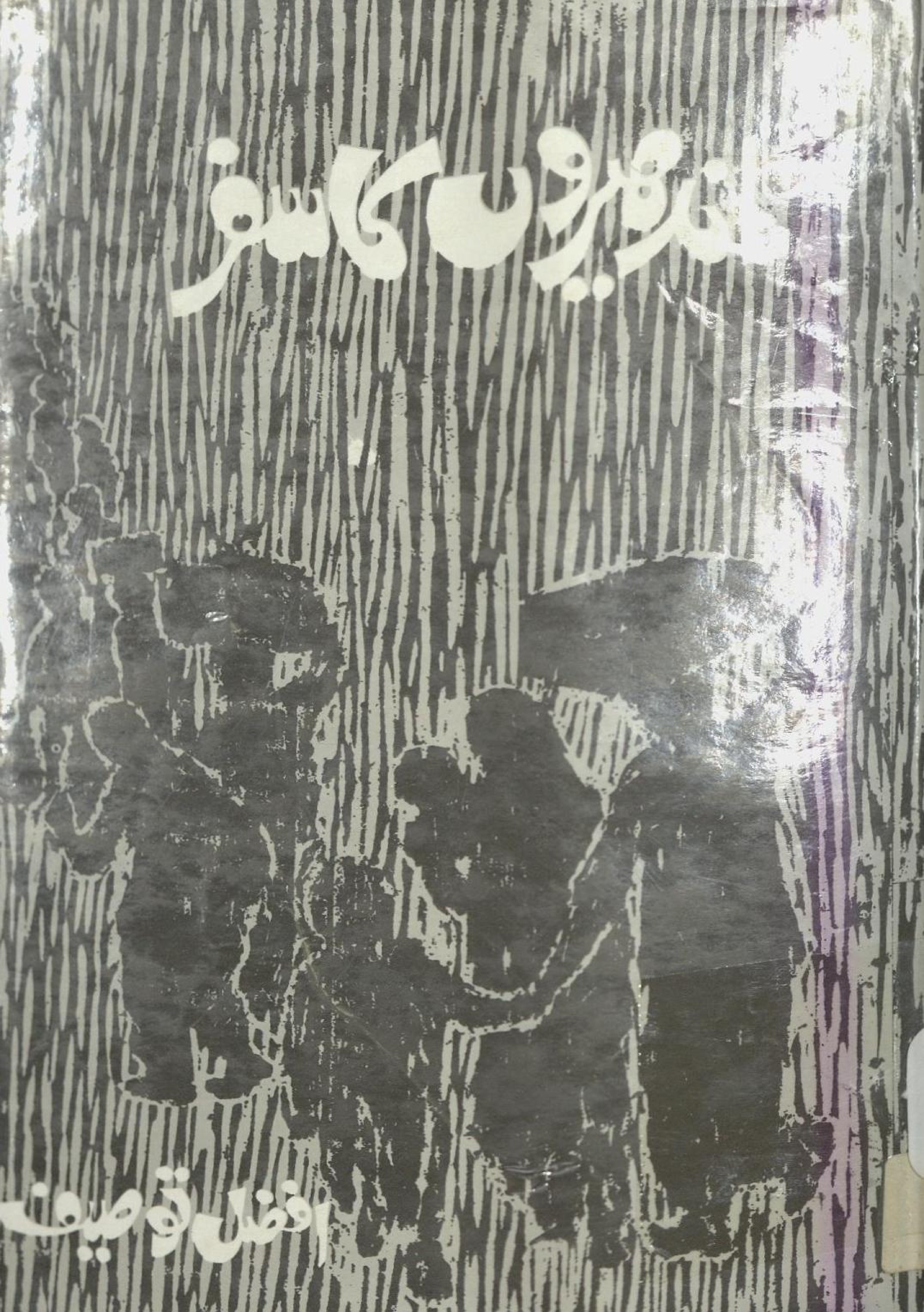

اندھیروں کا سفر
افضل توصیف

اندھیروں کا سفر

○

مُصنّفہ

افضل توصیف

○

نگارشات، میاں چیمبرز، ۳۔ ٹمپل روڈ، لاہور

نام کتاب .... اندھیروں کا سفر

مصنفہ .... افضل توصیف

ناشر .... آصف جاوید

باہتمام .... نگارشات میاں چیمبرز لاہور
۳، ٹمپل روڈ لاہور

طابع .... منہاج الدین اصلاحی

مطبع .... شرکت پرنٹنگ پریس
۴۳۔ نسبت روڈ۔ لاہور

قیمت .... ۵۰/- روپے

انتساب

ان سب کے نام ہے جو روشنی کی آس لگائے
گھور اندھیروں میں سفر کرتے رہے

فہرست مضامین

پہلی بات

جی یہ کتاب میں نے ہی لکھی ہے۔
کیسی لکھی ہے ؛ رائے دینے کا اختیار اور فیصلہ کرنے کا حق آپ کا ہے۔

کیوں لکھی ہے ؟
نام آوری کمانے کے لیے یا شوق پورا کرنے کے لیے تو نہیں لکھی۔ ورنہ اس سے پہلے بھی کبھی کچھ لکھا ہوتا۔ ویسے اپنے دل سے پوچھ کر تو دیکھیئے اس کتاب کی بنیاد میں جو بات ہے وہ کہیں آپ کی اپنی ہی بات نہ نکل آئے۔ رہی تقریر کی لذت والی بات تو جانے دیجیے ہر کوئی غالب تو نہیں ہوتا۔

اگر آپ نے ہمت کر کے سارے مضمون پڑھ لیے تو ان میں کتنے ہی تضادوں کا پتہ ملے گا۔ یہ بات تو ہے خود مجھے بھی اپنی سوچ کے تضادوں کا ٹھیک اندازہ ان مضامین کو ایک ساتھ پڑھ کر ہی ہوا۔ یہ صورت کچھ تو اس لیے ہے کہ ہم سب مجموعہ اضداد قسم کی شخصیتیں سنبھالے پھرتے ہیں، ہماری آدرشیں زندگیوں میں وجود نہیں پاتیں، بلکہ الفاظ کی بازگشت بنکر رہ گئی ہیں۔ ہم وقت سے بچھڑے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ بیسویں صدی کا آخری چوتھائی حصہ ہے دنیا میں انسان کی بقا اور عزتِ نفس کا تحفظ کرنے والے سماج کے عظیم تجربے ہو چکے ہیں۔ مگر ہم ابھی تک اٹھارویں صدی سے آغاز کرنے والے نوآبادیاتی سماج کے کھنڈروں میں سانس لے رہے ہیں۔ آزادی کے بعد بھی ہم نے اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ آج یہ سماج شدید قسم کے تضادوں کی بنیاد پر کھڑا لرز رہا ہے۔ اس کی استواری ختم ہو چکی ہے ٹوٹتی گرتی دیواریں گھر کے لوگوں کو زخمی کیے جاتی ہیں۔ زخمی ہونیوالے تبدیلی چاہتے ہیں مگر اپنے حصے کا کام دوسروں کے ذمے لگاتے ہیں۔ بوڑھی نسل جوانوں کو کوسنے دیتی ہے اور جوان بوڑھوں پر دشنام طرازی کرتے ہیں مگر دونوں کے پاس اِک حسرتِ تعمیر کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ جو ہونا چاہیئے محض خیالوں میں ہے اور جو ہے۔ اسے اکثر لوگ تو جانتے نہیں کہ اسی میں انکا مفاد مُضمر ہے ایک طرف علم کی کمی ہے دوسری طرف سچائی کا قحط۔ پھر میں تو یہ بھی سمجھتی ہوں کہ میری سوچوں میں یہ

تضاد بڑی حد تک میری طبقاتی حیثیت نے پیدا کر رکھے ہیں۔ میرا تعلق متوسط طبقے کی نچلی پرت سے ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو محنت کش طبقے سے قریب تر ہو کر بھی اس میں شامل ہونا نہیں چاہتا بلکہ اوپر اٹھنے کے چاؤ میں اپنے پاؤں تک زمین سے اٹھا لیتا اور پھر نیچے گر پڑنے کے خوف سے ہر وقت کانپتا لرزتا رہتا ہے۔ اب ایسی حالت میں کہ سر میں تو آسمانوں کا سودا سمایا ہو اور پاؤں کے نیچے زمین تک نہ رہی ہو۔ کیا ہوگا؟ تضاد ہی تضاد ابھریں گے نا! علاوہ اس کے قصہ اور بھی ہے میری اصل نسل دیہات کی ہے اور میں رہتی ہوں شہر لاہور میں۔ میرے اجداد ان گنت سالوں سے ہل چلاتے اور گندم بوتے چلے آ رہے ہیں اور میں سرکار کی نوکری کرتی ہوں۔ وہ لوگ سچے اور سمجھدار لوگ ہیں کہ ان کی دانش ان کے تجربے ہیں۔ محنت اور پیداوار آج دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے جب کہ میں پڑھی لکھی جاہل ہوں کہ کتابوں پر بھروسہ کرتی ہوں اور جھوٹ کا کاروبار۔ وہ باتیں جن پر عمل نہ ہو سکتا ہو جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ میرے اپنے لوگ جفاکش انسانوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی بولی میں آرام و آسائش کے لفظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ میں ہوں کہ بے عمل اور آرام طلب لوگوں کے گروہ میں آملی ہوں (پاکستان کے دانش کدوں میں پڑھانے والوں سے زیادہ بے عمل کون ہو سکتا ہے؟) وہاں سب کے لیے روٹی پیدا کرنے کی سرگرمی عمل ہے یہاں صرف اپنی ذات کے لیے سب سہولتیں حاصل کرنے کی نڈھال خواہشیں ہیں کبھی یہاں ہوں کبھی وہاں۔ یہ صورتِ حال خود کئی تضادوں کو جنم دینے والی ہے۔

بات جو کچھ امید افزا ہے وہ اتنی ہے کہ میں ایڑیاں اٹھا کر اوپر اٹھنے کا جنون نہیں رکھتی بلکہ اپنی دھرتی پر پاؤں جما کر آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ اپنی اصل کی طرف لوٹ رہی ہوں اور آگے بڑھنے والوں سے کچھ سیکھ بھی رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے اس عمل کے ساتھ میری سوچوں کے بہت سے تضاد ختم ہو جائیں گے.... اور میں آسان و سہل راستوں کی تلاش چھوڑ کر ان راہوں پہ چلنے کا حوصلہ پالوں گی جو بہت لمبی ہیں۔ بہت کٹھن ہیں مگر منزلوں کو جاتی ہیں یہ بات ختم نہیں ہوتی جب تک اس میں چند انسانوں کے

نام نہ آجائیں جو کسی نہ کسی حد تک اس کتاب کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں، اول تو ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف ہیں کہ جن کے قریب رہ کر نہ صرف میں نے وطن کے بارے میں سوچنا سیکھا بلکہ یہ بھی سیکھا کہ بڑے وقتوں میں اپنی چکنا چور انا کے گرد بنے ہوئے اندیشوں اور محرومیوں کے منحوس جالے توڑ کر ذات کے دکھوں کو وطن کے دکھوں میں ملا دینے سے جینے کا حوصلہ کتنا بڑھ جاتا ہے اور فنا کا خوف کتنا کم ہو جاتا ہے میرے وطن کے دکھ بہت پرانے ہیں نگران کے بارے میں ہماری بے حسی کا خول اس وقت چٹخا جب سقوطِ ڈھاکہ کی خبر آئی۔ یہ وقت وہ تھا جب پرانے زخم بھی جاگ اٹھے۔ کچھ لوگوں نے کرچیاں ہی چنیں، کچھ نے مداوا سوچا میں سوچتی ہوں پہلے وجوہ تلاش کر لیے جائیں.... ڈاکٹر صاحبہ نے میری بات کو پسند کیا اور یہ مجموعہ چھپوا دینے کی فرمائش بھی کی۔

جناب احمد ندیم قاسمی کا اصول یہ بھی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو دلاسہ دیا جائے۔ اسی اصول کے پیشِ نظر انھوں نے ان مضامین میں سے کئی ایک کو "فنون" میں جگہ دی اور پھر ان کے بارے میں قارئینِ فنون کی صرف اچھی رائے مجھ تک پہنچا کر اس خوش فہمی میں ڈال دیا کہ یہ کتاب چھپ جائے تو بے معنی نہ ہوگی۔

آخری بات یہ ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں کسی نے مدد نہیں کی، پروف تک خاکسارہ نے خود ہی پڑھے ہیں۔ ظاہر ہے غلطیاں بہت ہونگی۔

توصیف

۱۵، دسمبر، ۱۹۷۵ء

دوسری بات

کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے لیے دوسری بات لکھنے کی ضرورت تو نہ ہوتی، مگر ایک تبدیلی مضمون کی کرنا پڑ گئی۔ یہ تبدیلی وقت کی بھی ہے۔ پہلی بار ۱۹۷۶ء میں جو مضامین کتاب میں شیرازہ بند ہوئے وہ سبھی اُس دہائی میں لکھے گئے۔ کتاب کے چھپتے ہی اس کی اشاعت پر پابندی لگ گئی۔ کیونکہ اس میں وطن سے محبت کا اظہار کچھ زیادہ ہی تھا اور وطن دشمنوں کا تذکرہ بھی کم نہیں تھا۔ مگر پابندی کے باوجود کتاب بہت پڑھی گئی اور اُس پر تبصرے بھی بہت ہوئے پڑھنے والوں نے تعریف کے خط لکھے۔ مگر حاکموں نے پولیس بھیجی —— ہم دونوں ہی ڈر گئے —— میں بھی اور کتاب کا پبلشر بھی مگر بچ گئے۔ اس وقت حکومت میں کچھ لوگ سچ کی طرف کے ادیب کو ہتھکڑی لگنے سے بچا بھی لیتے تھے۔

پھر اس کے بعد جو وقت آیا اُس میں گونگی کتابوں پر بھی سنسر لگا چہ جائیکہ کوئی بولتی جاگتی کڑکڑ کرتی کتاب سامنے آتی۔ اس عرصے میں قصہ دار و گیر اس قدر طویل ہوا کہ آگے سوچنے یا پیچھے پلٹ کے دیکھنے کو مہلت ہی نہ ملی۔ مجھے تو بھول ہی گیا کہ میری کوئی کتاب بھی چھپی تھی۔ یہی ٹھیک بھی تھا۔ کیونکہ پہلے میری پٹائی اس لیے ہوئی تھی کہ میں نے ڈھاکہ میں عظیم الشان کارنامے انجام دینے والے

فوجی جرنیلوں کے لیے کچھ لکھ دیا تھا۔ کچھ زیادہ بھی نہیں لکھا تھا، اور فوجی راج اس وقت ختم بھی ہو چکا تھا لیکن ایک جرنیل بہادر ریٹائرمنٹ کے بعد عوامی حکومت کا وزیر داخلہ جو لگ گیا تھا۔ بس اُس نے بدلہ لیا۔ جرنیلوں کی یہ خرابی ہے۔ کینہ پرور ہوتے ہیں اور کمزور کو مارتے ہیں۔ حالانکہ اُسی زمانے میں فاتح ڈھاکہ کے لیے باہر کے لوگوں نے کیا کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر انہیں وہ کیا کہتے۔

اب اگر کچھ لوگوں نے پرانی کتاب کو تلاش کرنا شروع کیا۔ پبلشر نے کا پتہ نہیں ملا تو مجھ تک پہنچے اور مجھے احساس ہوا کہ کتاب ابھی گم نہیں ہوئی۔ مگر پورے دس سال بعد میں نے کتاب پہ نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ بہت سی باتیں سوچیں نظریے اور خیال گم ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بھی شاید ہی کوئی بچا ہو جو اس وقت اندھیروں کے مسافر بنے روشنی ڈھونڈ رہے تھے۔ ویسے تو میں بھی کہاں بچ سکی۔ مجھے بھی احساس ہو گیا بلکہ یقین کہ وہ راستہ روشنی کی طرف نکلتا ہی نہیں۔ تمناؤں سے دُنیا بدلتی ہے نہ منزل ملتی ہے۔ پھر تمنا کا دوسرا قدم ہے کہاں؟ دشتِ امکاں میں ایک قدم کا نقش بھی کب سے مٹ چکا۔ وہ ۱۹۷۰ء کی دہائی تک کی بات تھی جب ریت پہ نقش کفِ پا تلاش کرنے کا دور تھا۔ اگلی دہائی آگ پہ پاؤں دھرنے کا امتحان بنی۔ وہ کوئی سفر نہیں تھا، سراب تھا، اور آگے یہ دس برس فقط اندھیری کوٹھڑی تھی۔ جہاں اذیت تھی اور توہین۔ زندگی کے لیے، اور موت کے لیے بھی ذلت کا سامان تھا۔ اس دور میں آکر پچھلے اندھیرے بھی بھول گئے اور پچھلی اذیتیں بھی حافظے سے نکل گئیں۔

۱۹۷۱ء کے سال شہر ڈھاکہ فال ہوا تھا اور میں سرِعام روئی تھی۔ تب تو میں احیائے زندگی کے لیے ظلم کا جنگل پھونک ڈالنا آسان سمجھتی تھی۔ مگر بعد میں وہ وقت بھی دیکھا جب خود زندگی کا سقوط ہونے لگا۔ شہرِ دل کی محبت لٹی۔

شہر وفا کی آبرو پہ حملہ ہوا۔ احیاء کی کونپلیں کہ ابھی پھوٹ رہی تھیں جل کر راکھ ہوگئیں
بہت مایوس ہوئی۔ مگر آواز کے ساتھ آہ وزاری نہ کرسکی کہ آنسوؤں پر بھی پہرہ تھا کہ
بہت خوفناک مارشل لا تھا اُس ظلم نے دل عقیدے سبھی بدل ڈالے۔ آزادی اپنے
اپنے آپ سے بہت دور دکھائی دینے لگی۔ آزادی کا مفہوم بدل گیا تو میں نے کتاب کے
دوسرے ایڈیشن سے وہ مضمون ہی نکال دیا ہے جس کا عنوان تھا آزادی کا مفہوم
اسی لئے یہ وضاحت کرنی پڑی دوسری بات لکھنی پڑی۔ اس اعتراف کے ساتھ
کہ اُس وقت مجھے آزادی کا مفہوم ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ اس لئے کہ غلامی کی تمام
حالتیں اور سطحیں دیکھی سمجھی نہ تھیں۔ آج کہہ سکتی ہوں کہ وہ مضمون میں نے اس طرح لکھا
تھا جیسے کوئی بچہ کھیل کھلونے کی بندوق اُٹھا کر سمجھتا ہے اُس کی ٹھاہ سے کالا جن مر
جائے گا اور شہزادی اُس کی قید سے آزاد ہو جائے گی ـــــــ بڑی بے عقلی کی بات
تھی۔ آزادی کا مفہوم اوّل تو لکھ پڑھ کر سمجھا سمجھایا نہیں جاسکتا۔ ایک خوفناک بپھرے
ہوئے سانڈ کا پنسل خاکہ بناتے اور میدان میں اُتر کر اس کی سُرخ آنکھوں میں دیکھتے
ہوئے اُس بدمستؔ کے سینگ پکڑ لینے میں جو فرق ہے وہی فرق لفظ لکھنے اور
آزادی کا مفہوم سمجھ لینے میں ہے ـــــ اس مضمون میں دو خطرناک لفظ، قوم، اور، ہم
بار بار استعمال کیے۔ یہ بڑے گمراہ کن لفظ ہیں ـــــ قوم کا لفظ کتابوں میں ایک
ہزار معنوں میں لکھا گیا۔ لیکن ابھی پورے طور سے اس کا مطلب نکلا نہیں اور ہم
تیسری دُنیا کے لوگوں نے تو اس کے بہت ہی غلط معنی لیئے ہیں۔ بلکہ اس لفظ پر
بڑے دھوکے کھائے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے بغیر سمجھے کئی لفظ لکھے اور "یہ ہم"
اس کا مطلب تو نہیں لکھا ہی نہیں گیا۔ یہ تو لفظ کا بہروپ ہے جو زوال پذیر معاشرے
کے افراد اپنی ذات کے لیے استعمال کرتے رہے۔ لیکن اب عوام کو فریب دینے
کے لیے قوم والے استعمال کرتے ہیں۔ یا وہ لوگ جنہوں نے نفرتوں سے بالآخر

(COMPROMISE) کر لیا ہے ۔ میرے جیسے لوگوں سے یہ کوتاہی اس لیے ہو جاتی ہے کہ اپنے دیس کے لفظ آزاد نہیں ہیں ، اور مانگے کے لفظ لونے لکھنے پڑتے ہیں ، غلطیاں تو ہوں گی ہی ۔ تاہم میں اپنے اُس قاری کی شکر گزار ہوں جس نے میری اس کوتاہی کی نشان دہی کرنے میں میرا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا ۔

آزاد لفظوں کی پڑھائی میں ابھی پڑھ رہی ہوں ، اُس تحریک کے ساتھ ہوں جو دیس کی زبان کے لفظوں کی پوری آزادی چاہتی ہے ، شاید کبھی آزادی کا مفہوم درست لکھ سکوں ، اصل میں آزادی کے ہزاروں مقام ہیں اور قوم کی آزادی کے ساتھ سینکڑوں طبقات کی آزادی کا مسئلہ جُڑ کر چلتا ہے ۔ قوم کے عوامل اور عناصر بھی یہی سب تو بنتے ہیں کسی زمین پر صوبوں اور قومیتوں کی آزادی ، عوام کے درجہ بدرجہ دبے ہوئے طبقات کے حق حصے کی آزادی ، مزارع اور مزدور کی آزادی ، عورتوں کی آزادی ، بچوں کی آزادی ، لفظ خبر اور علم اور اطلاع کی آزادی ، ثقافتوں اور زبانوں کی آزادی ، عقائد اور عبادات کی آزادی ۔ سوچ اور فکر کی آزادی ، فن اور فن کار کی آزادی ، چھوٹے شہروں کی آزادی ، تنگ گلیوں کی آزادی اور دیہات کی آزادی جو شہروں کی لوٹ کا شکار ہو کر دن بدن مفلس ہوتے جا رہے ہیں ، پھر کرۂ ارض پر سمندروں اور سرحدوں کی آزادی ہے ۔ تیسری دنیا کی آزادی پہلی دوسری دنیا کے دباؤ سے اور استحصال سے ۔ جنوب کی شمال سے آزادی ، مشرق کی مغرب سے آزادی ۔ کیا کچھ اور نہیں ، یہاں پاکستان میں آزادی کا مفہوم ابھی برٹش کلونیل دور کے خاتمے تک ہی پہنچا ، اس کی چھوڑی ہوئی غلامی کے ورثے اور انسان کش نظام تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ نیو کلونیل دور آ پہنچا ، اور اب برٹش راج سے زیادہ خطرناک سامراج کی غلامی کا پھندا گردن پر تنگ ہو رہا ہے ، اب کیا ہے اصلیے ۔ بس اصلیے ہیں ۔ غلامیاں ہی غلامیاں ہیں ۔ اتنی غلامیوں کے نرغے میں آزادی کا مفہوم کہاں ملے گا ۔

تعداد کے لحاظ سے کتاب میں اب بھی اتنے ہی مضامین ہیں جتنے کہ پہلے ایڈیشن میں تھے اور وہی ہیں بجز ایک کے جس کا نفسِ مضمون بدل گیا ہے۔ الیکشن جمہوریت اور مارشل لاء یہ مضمون بھی ستر کی دہائی میں لکھا گیا اور جوں کا توں شامل کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون الیکشن جمہوریت اور مارشل لاء ادھورا ہے اس کا دوسرا حصہ بعنوان 'مارشل لاء' لکھا تو گیا ہے۔ مگر بہت طویل ہونے کی بنا پر اور دیگر وجوہات کی بنا پر ابھی لوہے کی الماری میں بند پڑا ہے۔ شاید کبھی الماری کھلے اور چھپ جائے۔

اندھیروں کے سفر کے لیے اب یہی کہوں گی کہ کتاب ابھی پرانی نہیں ہوئی۔ لوگ اسے ڈھونڈتے ہیں اور روشنی کو بھی۔ بہت گہرے اندھیرے والی کال کوٹھڑیوں میں دل والے دل جلا کر گئے ہیں کچھ لیکر ہی لوٹیں گے۔ ادھر چیونٹیاں ہیں کہ ہاتھیوں سے لڑے ہی جا رہی ہیں۔ ظلم کا جنگل پھل پھول رہا ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں اُس کی جڑ کاٹنے کا عمل بھی جاری ہے۔ کیمپ قافلے تو اس عرصے میں بہت ہی بڑھ گئے ہیں۔ بستیوں اور شہروں کی تعداد شاید کم ہو گئی ہے۔ رہے مرکزِ فکر و یقین، وہ تو بُری طرح بیٹھ گئے ہیں ان دس برسوں میں کیا کچھ اور ہو چکا ہے۔

دنیا اُنہیں دس برس میں کئی بار پیدا ہوئی ہے
کئی بار اپنی ولادت سے پہلے مری ہے۔ لیکن۔
لیکن سفر پھر بھی جاری ہے۔
آلِ آدم کے لیے ہونا یا ہو جانا مقامات سفر ہیں
اور یہ سفر صورت آدم کے لیے ہونے کی مجبوری ہے

افضل توصیف

۱۱ اپریل ۱۹۸۸ء

اندھیروں کا سفر

اس کا شمار پہلے بائیس خاندانوں میں تو ہوتا نہیں مگر دوسرے درجے پر آنے والے بائیس خاندانوں میں وہ یقیناً کسی مستحکم جگہ کھڑی ہے۔ اس کی دولت کی زیادہ تفصیل تو میں نہیں جانتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ دولت حاصل کرنے اور اسے بڑھانے کے جتنے ذریعے ملک میں رائج ہیں ان سب میں اس کے باپ کی، خود اُس کی اور اُس کے شوہر کی حصّہ داری ہے۔ زمیندار تو اس کے باپ دادا شروع ہی سے تھے اور دولت جمع کرنے کے عادی بھی۔ مگر پاکستان آکر کچھ ملیں اور فیکٹریاں بھی اُنھیں الاٹ ہوئیں۔ یہ ملیں اور فیکٹریاں بڑھتی رہیں۔ پھیلتی رہیں، وسعت میں بھی اور تعداد میں بھی۔ زمینوں پر بیلوں سے چلنے والے ہلوں اور کنوؤں کی بجائے ٹریکٹر اور ٹیوب ویل چلنے لگے۔ یوں دولت جمع کے فارمولے کی بجائے ضرب کے اصول سے بڑھنے لگی۔ آزادی سے پہلے یہ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ زائد دولت تجوریوں میں بند رکھتے۔ سونا چاندی بناتے یا پھر زمین خریدتے۔ مگر اب نئے ملک میں یہ لوگ جدّت پسند اور ماڈرن ہو چکے تھے لہٰذا دولت کے ڈھیر بڑی بڑی کوٹھیوں۔ محل نما کوٹھیوں۔ لمبی لمبی چمکیلی کاروں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ لباس۔ خوراک ہر چیز بدل گئی۔ دُودھ مکھن کھانے والے مردوں نے وسکی پینا شروع کر دی۔ چادریں اوڑھنے والی عورتوں نے جسم کی زینتیں نمایاں کر دیں۔ آزادی اور ترقی کی خاطر، ہر چیز میں برکت ہی برکت تھی۔ کاروبار بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھولتے ملک کی حدود سے باہر نکل کر

غیر ممالک کی حدود میں داخل ہو کر بہت دور تک چلا گیا۔ اب تو کراچی، لاہور، مری اور ڈھاکے میں کئی کئی محل نما کوٹھیوں کے علاوہ سُنا ہے بنکاک میں اُس کا لکڑی سے بنا ہُوا ایک محل ہے۔ دوسرا بیروت میں سبز اور نسواری رنگ کے اسی طرح کے سنگِ مرمر کا جو آزادی کے بعد ملک کی پہاڑیوں سے نکالا گیا اور پیرس میں تو سُنا ہے اس کا خالص شیشے کا گھر ہے، جہاں بہت پڑھے لکھے وردی پوش، خوش مزاج و خوش گفتار ملازم معزز مہمانوں کے لیے دروازے کھولتے ہیں اور سلوٹ مار کر انھیں الف لیلوی قسم کے اندرون خانوں میں بٹھا کر جانے کیسے کیسے مشروبات پیش کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ کہیں ٹک کر نہیں رہتی۔ بلکہ سال کا بیشتر حصّہ امریکہ جاپان اور یورپ کے ملکوں میں حسین ترین گوشے تلاش کرنے میں گزار دیتی ہے۔ اپنے آپ کو کاسمو پولیٹن سوسائٹی کا فرد تصوّر کرتی ہے۔ سارا جہاں اُس کا وطن ہے۔ ملّی و اسلامی معنوں میں نہیں بلکہ جدید معنوں میں تہذیب و تمدن میں اُس کا نظریہ کاروباری ہے۔ ساری دنیا مارکیٹ ہے۔ بلکہ سُپر مارکیٹ ہے۔ جہاں سے جو چیز پسند آئی خرید لی اور اپنا لی۔ جب آوٹ ڈیٹڈ ہو گئی پھینک دی۔ کسی خاص تہذیب یا زمین سے چمٹے رہنا اُس کے خیال میں جہالت ہے۔

شاید اسی وجہ سے وہ پاکستان آنے سے گریز کرتی ہے کہ یہاں اس کے باپ داداؤں کی جہالت کو جاننے والے بہت سے لوگ ابھی زندہ ہیں، ویسے اس کے اپنے الفاظ میں یہاں کوئی چارم ہی نہیں سوائے کاروبار کے اور چند دقیانوسی قسم کے رشتہ داروں کے جن کی خاطر کبھی کبھی آنا ہی پڑ جاتا ہے۔ اُس نے یہ بات کتنی بار کہی۔ ہر بار یہ سُن کر میں نے دعا مانگی۔ اللہ کرے اُس کے یہ دقیانوسی رشتہ دار بھی اُسی کی طرح ماڈرن ہو جائیں یا جلدی سے مر جائیں تاکہ اُس کا ناطہ میرے وطن کے ساتھ بالکل ہی ختم ہو جائے۔ یہ جونکیں وطن کی

رگوں سے خون چوسنے والی جونکیں ۔ یہ غیر ملکی دشمنوں سے بھی بد تر قسم کی مخلوق جو یہاں سے دولت سمیٹ کر مستقبل تعمیر کرنے امریکہ اور سوئٹزرلینڈ چلی جاتی ہے کاش ان جونکوں پر کوئی تمباکو چھڑک دے! نمک ڈال دے!

اُسے میری ان نفرتوں کا علم تھا۔ اسی لیے وُہ مجھے اپنے ذہن سے نکال نہیں سکتی تھی یا شاید نکالنا نہیں چاہتی تھی ۔ مجھے اذیت دینے اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے اس کے پاس بڑا مؤثر حربہ تھا خط لکھنا۔ صرف چند جملے لکھ کر وہ بہت دنوں کے لیے میرا ذہنی سکون متزلزل کر سکتی تھی۔ یہ حربہ آزمانے سے وہ کبھی باز نہ آتی ۔ اپنی ساری دنیاؤں اور مصروفیتوں کے باوجود کبھی نہ کبھی مجھے خط لکھنے کے لیے وقت نکال لیتی ۔ اُس کے ہر خط کے باہر ایک نیا پتہ لکھا ہوتا ۔ مگر میں اس کے خطوں کی زد سے نہ بچ سکتی ۔ نہ میرا پتہ بدلتا، نہ میں اس کے خط کھول کر پڑھنے سے باز رہتی ۔ میرے لیے پاکستان کے لیے اور ساری قوم کے لیے اس نے چند نظریے بنا رکھے تھے جنھیں وہ مکمل سمجھتی البتہ اتنا ضرور ہُوا کہ خود میری ذات کے لیے ایک مرتبہ اسے اپنے نظریے میں ترمیم کرنا پڑی ۔ پہلے اُس کا خیال تھا کہ مجھ میں ترقی کرنے کی صلاحیتیں تو ہیں مگر تنگ نظری اور پست ہمتی اور دقیانوسی قدروں نے جو میرے ماضی کا ورثہ ہیں، ان صلاحیتوں کا رستہ روک رکھا ہے ۔ مگر بعد میں یہ خیال اس کے بڑے سے سر میں جم کر بیٹھ گیا کہ مجھ میں ترقی کرنے کی صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں ۔ میں پیدا ہی پستیوں اور اندھیروں کے لیے ہوئی ہوں ۔ میرا خیال تھا اس مقام پر پہنچ کر وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے گی ۔ مجھ ایسے بے صلاحیت اور ترقی کے نااہل لوگوں کو دوست کہنا یا ان سے کوئی رابطہ رکھنا اپنے وقت اور حیثیت کا زیاں سمجھ لے گی اور اس طرح میری نجات ہو جائیگی ۔ مگر میرا یہ خیال بھی خیال خام ثابت ہُوا۔ وہ کسی حالت میں بھی مجھ سے رابطہ توڑنے کو تیار نہ تھی ۔ رابطہ بھی کیسا کہ ایک طرف کھُلی نفرت ، دوسری طرف طنز ۔ اور تحقیر کی شکل اختیار کیے ہوئے ۔

حالات اور وقت نے ہم دونوں کو کیسی متضاد شخصیتوں میں ڈھالا تھا، اگرچہ اس تضاد کی بنیاد ہماری پیدائش کے وقت ہی موجود تھی۔ میں اور شاہانہ اپنے اپنے طبقے کی پیداوار ہیں، مگر شروع کے کچھ سال ہماری خالص دوستی کے بھی رہے۔ پھر دوستی اور دشمنی گڈمڈ ہو کر رہ گئی۔ ایک وقت لاتعلقی اور بیگانگی کا بھی آیا، مگر آخر میں ہم دونوں اپنے اپنے طبقاتی شعور کی تکمیل کے ساتھ دشمن ٹھہرے۔ یہ رنگ بدلتا رشتہ بہت سے دنوں اور بہت سے واقعات پر پھیلی تاریخ کے ساتھ اُبھرتا ڈوبتا دراصل دوستی سے شروع ہُوا تھا اور یہ دوستی اس وقت شروع ہوئی جب ہم دونوں پاؤں پاؤں چلنا اور لفظ لفظ بولنا سیکھ رہی تھیں۔ آج ملک ملک پھرنے اور شہر شہر گھومنے والی شاہانہ کبھی میرے ساتھ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ یہ گاؤں وطن عزیز کی مشرقی سرحدوں کے اس پار آم کے باغوں سے گھِرا شاید اب بھی آباد ہو گا، گو اس کی آخری تصویر جو میری یادوں نے محفوظ کی، ایک اجڑی ہوئی جلی ہوئی بستی کی تھی جس کے آنگنوں میں اور گلیوں میں اپنے لوگوں کی.... بہت پیارے لوگوں کی آدھ جلی اور آدھ کٹی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ مجھے لگتا ہے وہ لاشیں اب تک ننگی پڑی ہوں گی۔ کسی نے انھیں دفن نہیں کیا ہو گا، کسی نے ان پر کپڑا نہیں ڈالا ہو گا۔ کتنی بار خوابوں میں شعور کے پہرہ دار کو غافل پا کر میں نے چادروں کا گٹھڑ اُٹھائے سرحد پار کرنے کی کوشش کی کہ جا کر ان لاشوں کو ڈھک دوں۔ مگر ہر بار سرحدوں کے محافظ جاگ اُٹھتے ہیں اور دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگتی ہیں، آگے اور پیچھے سے آتی ہُوئی گولیوں کی ٹھاہ ٹھاہ اور شائیں شائیں سے میں خود بھی جاگ اُٹھتی ہوں اور اس بھیانک خواب کا تجزیہ کرنے لگتی ہوں۔ ایک آخری لمحے کی خواہش — زندگی کی شدید ترین خواہشوں میں سے ایک تھی... میری دادی۔ میری چچی، میری بہن کی لاشوں کو کوئی ڈھک دے، انھیں کفن میں چھپا دے، زمین میں دفن کر دے۔

ہاں تو وہ بستی کبھی بہت آباد تھی۔ شاداب تھی۔ مَیں اور شاہانہ اسی میں رہتی تھیں۔ پاس پاس گھر تھے۔ فرق تھا تو اتنا کہ اُس کا مکان بہت بڑا تھا اور میرا گھر بہت چھوٹا سا تھا جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا کچھ فرق اور بھی تھے ہم دونوں کے گھروں میں۔ شاہانہ کے بابا بہت موٹے تھے اور میرے ابّا بہت دُبلے۔ اس کی ماں کہنیوں تک سونے کا چُوڑا اور گلے میں ست لڑا کنٹھا پہنے رنگیل پلنگ پر سارا دن بیکار بیٹھی رہتیں کہ ان کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لیے بھی نوکرانی موجود تھی، خود یہ نوکرانیاں بھی اکثر بیکار بیٹھی نظر آتیں۔ جبکہ میری اماں دن بھر کام میں جتی رہتیں۔ فرصت کے اوقات میں دری بچھا کر کپڑے سِیا کرتیں۔ مشین چلاتے وقت ان کے ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں بجتی رہتیں۔ اماں کا پسندیدہ مشغلہ ایک اور بھی تھا۔ کتابیں پڑھنا۔ سیف الملوک، یوسف زلیخا، بدیع الجمال، ہیر رانجھا اور کچھ دینی قسم کی کتابیں تھیں جنھیں وہ باقاعدہ جزدانوں میں لپیٹ کر رکھتیں۔ شاہانہ کی ماں اور میری ماں میں بھی بہناپا تھا۔ گویا یہ بات ذرا انوکھی سی تھی۔ شاہانہ کی ماں کے پاس جتنے زیور تھے میری اماں کی کتابوں میں اتنے ورق بھی نہ ہوں گے۔ مَیں نہیں جانتی میری ماں کو زیور پہننے کی اتنی خواہش تھی یا نہیں جتنی شاہانہ کی ماں کو انبیاء کے قصے، اولیا کی کہانیاں، بادشاہوں کی داستانیں اور عاشقوں کے فسانے سننے کی تھی۔ وہ اکثر ڈولی اور میراثن بھیج کر اماں کو بلوا لیتیں اور پھر ساری دوپہر یہ قصے کہانیاں چلتے۔ میرے ابا غالباً اس وقت بھی ترقی پسند تھے کہ ان کی شاہانہ کے ابا سے ذرا بھی دوستی نہ تھی۔ انھیں اس بات پر بڑا مان تھا کہ ہماری اپنی زمین تھی ہم کوئی چوہدری کے مزارعے نہیں تھے۔ بلکہ وہ امیروں سے دوستی رکھنے پر ہم دونوں ماں بیٹوں کا مذاق اُڑایا کرتے۔ ابا کو کچھ فخر اس بات کا بھی تھا کہ میں پڑھنے میں بہت ہوشیار تھی جبکہ شاہانہ بالکل نکمی۔ حالانکہ اسکول کے ماسٹر صاحب گھر جا کر بھی بہت دیر تک پڑھاتے تھے۔ مگر ابا کے بقول قدرت

کی رکھی ہوئی کمی کو ماسٹر صاحب کیسے پورا کرتے۔ ماسٹر صاحب بھی کچھ کم جمہوریت پسند نہیں تھے۔ اچھا سبق یاد کرنے پر غریب بچوں کو جتنی شاباش دیتے۔ نکمے امیروں کے اتنے ہی بید پڑے رہتے۔ "لائق صرف غریبوں کے بچے ہی نکلتے ہیں" وہ اکثر یہ فقرہ دہراتے۔

وقت بہت ہی نرم روی سے گذر رہا تھا۔ لوگوں کی زندگیوں میں سوائے موسموں کے اور کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہی باتیں، وہی گیت، وہی کھانا، وہی پینا، وہی تہوار اور وہی پرانے رسم و رواج۔ سوائے ان جھگڑوں فسادوں کے جو بقر عید، محرم اور دیوالی ہولی پر سر اٹھاتے۔ یہ بھی ایک طرح سے پرانے ہی ہو چکے تھے کہ ہر بار وہی وجہ ہوتی، وہی طریقہ واردات ہوتا۔ اسی طرح مقدمے چلتے۔ ویسی ہی قیاس آرائیاں ہوتیں اور اسی قسم کے فیصلے ہوا کرتے۔ مگر ایک سال ایسا آیا کہ ہر طرف عجیب قسم کی گہما گہمی پھیل گئی۔ ابا تڑکے سویرے اٹھ کر جاتے اور تین میل دور شہر سے اخبار لاتے۔ پھر شام کو ہر روز بیٹھک میں ان کے گرد لوگوں کا جمگھٹا ہوتا۔ وہ زمیندار کا پرچہ ہاتھوں میں سنبھالے خبریں پڑھ پڑھ کر سب کو سناتے۔ کچھ کچھ تبصرے بھی کرتے جاتے۔ پھر وہ دن آیا جب شاہانہ کے ابا کی حویلی میں بڑا سا جلسہ ہوا۔ اتنے لوگ جمع ہوتے کہ آج تک کسی برات میں نہیں آئے ہوں گے نہ مولوی کا وعظ سننے کبھی آئے تھے۔ اس دن صبح سویرے ہی بہت سے لوگ صاف ستھرے کپڑے پہن کر سٹیشن گئے۔ ان کے ساتھ کئی ٹوکرے پھولوں کے ہار تھے۔ دوپہر کو جب یہ لوگ لوٹے تو ساتھ میں بہت ہی معتبر سے آدمی تھے۔ ان تینوں نے کالی شیروانیاں پہن رکھی تھیں اور بگھی میں بیٹھے تھے۔ بگھی پھولوں سے سجی تھی۔ خود شاہانہ کے ابا بگھی کے آگے آگے پیدل چل رہے تھے۔ باقی سارے لوگ پیچھے پیچھے۔ اس روز یہ لوگ ایسے خوش تھے جیسے عید کا دن ہو۔ شام کو جلسہ ہوا تقریریں ہوئیں۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا

موقع تھا کہ مسلمان عورتیں اکٹھی ہو کر گھروں سے نکلیں اور حویلی کی چھت پر بیٹھ کر جلسہ سنتی رہیں۔ میں نے اور شاہانہ نے ساتھ ساتھ بیٹھ کر ایک ایک لفظ سنا۔ آخر میں ہمیں صرف تین لفظ یاد رہ گئے:۔ پاکستان قائدِ اعظم اور مسلم لیگ۔ پھر یہ تین لفظ ہمارا کلمہ بن گئے۔ دن رات صبح آنکھ کھلنے کے وقت سے لے کر رات کو سوتے وقت تک ان الفاظ کا ورد ہوتا۔ بچے مل کر اسی طرح جلسہ کرتے اور نعرے لگاتے پاکستان زندہ باد! قائد اعظم زندہ باد! لے کے رہیں گے پاکستان! بن کے رہے گا پاکستان! پھر ایک دن شاہانہ کے ابا نے ہندوستان کا بڑا سا نقشہ پھیلا کر اس پر پنسل سے کچھ نشان لگائے اور خوشی سے نعرہ لگایا۔ یہ بنے گی دنیا کی پانچویں بڑی سلطنت، سب سے بڑی اسلامی ریاست!!

جغرافیے کی گھنٹی میں ماسٹر صاحب کچھ اور نہیں پڑھاتے سوائے پاکستان کے۔ وہ بار بار بلیک بورڈ پر اس ریاست کا نقشہ بناتے اور خوشی سے کانپتی آواز میں بتاتے دیکھو بچو یہ ہے ہمارا ضلع، یہ رہا دوآبہ اور یہ ہے ہمارا گاؤں یہاں تک پاکستان بنے گا! تم لوگ خوش نصیب بچے ہو پاکستان میں جوان ہو گے۔ آزادی سے پھلو پھولو گے ترقی کرو گے اور پھر تاسف کرتے کہ ان کی ساری جوانی غلامی میں گزر گئی۔ اگلے سال پاکستان بن گیا۔ مگر ہماری خوشیوں کا جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا۔ ہمارا گاؤں نہ ہمارا ضلع پاکستان میں شامل نہیں ہوا تھا۔ ساٹھ فیصد کے قریب مسلم آبادی کے کئی ضلعے پاکستان سے کاٹ لیے گئے تھے۔ پتہ نہیں کیوں؟ یہ اُس وقت کی بات تھی، آج تو ہمیں پتہ ہے کیوں؟ یہ پہلی سازش تھی جو برطانیہ نے ہندوستان کے ساتھ مل کر مکمل کروائی۔ آج اس کے وجود کو دونیم کروانے والوں نے شروع دن سے اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ان کو بڑی ضرورت تھی، کشمیر کے لیے راستہ جو چاہیے تھا، کشمیر کی اہمیت جو ہم تو آج تک نہیں سمجھ سکے۔ دشمن اُسی وقت سے سمجھتا تھا۔ پاکستان کے جسم میں بہتے خون کی رگیں:۔ اس کے

دریاؤں کے منبع جو وہاں تھے ریڈکلف ایوارڈ نے پنجاب کے چند ضلعے نہیں کاٹے تھے۔ اس سوہنی نویلی دھرتی کے جسم کی رگیں کاٹ ڈالی تھیں۔ ہاں، تو اس وقت ہم جو آزادی کی راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑے تھے، آگ میں گھر گئے۔ دوآبے کی گل پوش راہیں انگاروں سے بھر گئیں۔ ستلج کے آبِ حیات میں زہر گھل گیا۔ بیاس کی اُجلی سطح لہو رنگ ہو گئی۔ آزادی ہم سے دور ہی رہ گئی تھی۔ ہمیں خود اس کی طرف قدم بڑھانا تھا۔ مگر راستے میں ظلم تھا۔ آگ تھی خوف تھا موت تھی۔ پھر بستیاں لٹیں، گھر اُجڑے، انساں قتل ہوئے، عصمتیں پامال ہوئیں، مگر قافلے آگے بڑھتے رہے۔ ہمتیں نہیں ٹوٹیں۔ حوصلے نہیں ہارے۔ اس لیے کہ ظلم خوف اور موت کے اس پار روشنی کی ایک لکیر تھی، سلامتی کی ایک نوید تھی۔ آزادی کی ایک پکار تھی۔ صاف اور واضح اس پکار پہ لوگ بڑھتے آتے اور امن کی سرحدوں تک پہنچے۔ یہ پاکستان کی سرحدیں تھیں۔ ہمارا پاکستان، ہماری پناہ، امن و سلامتی کا گھر ہمارا گھر۔۔۔ ہم لٹے اُجڑے زخمی اور دُکھی انسانوں کا گھر۔ ہم سب اپنے گھر آ گئے۔ دیکھنے والوں کو حیرت ہوئی، کیسے عجیب لوگ ہیں، کتنے سخت جان۔ آگ کے دریا سے گزر کر آ گئے۔ کیوں نہ ہوتا پاکستان کی سرحد جو سامنے تھی۔ منزل یوں سامنے کھڑی ہو تو آدمی موت کو بھی بچھاڑ دیتا ہے۔ اس زمین نے ہمیں پناہ دی جینے کا حوصلہ دیا۔ یہ نئی زمین تھی طلوعِ سحر کی طرح نورانی اور اُجلی امن کے پرچم کی طرح بے داغ، کعبے کی طرح مقدس۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے پاک زمین کا نام سن کر ہم نے اس پر قدم رکھنے سے پہلے اپنی پیشانیاں جھکائی تھیں۔ اس کی مٹی کو اُٹھا کر آنکھوں سے لگایا تھا۔ اس زمین کو دیکھتے ہی ہر شخص کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جنھوں نے اپنے پیاروں، اپنے بچوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتے دیکھیں۔ بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لٹتے دیکھیں۔ اپنے گھر جلتے دیکھے مگر یہ سب دیکھ کر بھی یہ آنکھیں صحراؤں کی

طرح خشک اور ویران رہی تھیں مگر اس مہربان زمین کو دیکھتے ہی پُرنم ہوگئیں اس موقعے پر شاہانہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ وہ پاکستان آئی ضرور تھی مگر نہ تو قافلوں کے ساتھ چلی تھی۔ نہ کیمپوں میں رُکی۔ وہ تو جیپ میں بیٹھ کر فوج کے تحفظ میں سیدھی شہر لاہور پہنچی تھی اور مہاجر کیمپ میں اُترنے کی بجائے کسی سجی سجائی کوٹھی میں اُتری تھی۔ اس کے باپ نے ایک جاگیردار کی روایتی خودغرضی سے کام لے کر اپنے خاندان اور اپنے سونے چاندی کو نکال لانے کا انتظام تو کر لیا تھا۔ گاؤں والوں کو جن کا وہ چوہدری بھی تھا اور لیڈر بھی درندوں کے حوالے کر آیا تھا۔ یہ بات مجھے یاد آتی ہے تو سوچتی ہوں کہ شاہانہ کے باپ نے اس وقت جو کیا آگے چل کر وہی یہاں کے سارے چوہدریوں اور لیڈروں کو لوگوں کے ساتھ کرنا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے میرے اور شاہانہ کے درمیان فاصلے بڑھے اور نفرت کا بیج پھوٹا۔ یہ بات میرے دل میں کانٹا بن کر گڑ گئی کہ شاہانہ مجھ سے پہلے پاکستان پہنچی اور پھر جس انداز سے وہ یہاں آئی تھی۔ اس کے لیے میں اُسے کبھی معاف نہ کر سکی۔ اس نے اس زمین کی تقدیس کو نہیں پہچانا اِس کی مٹی کو آنکھوں سے نہیں لگایا تھا، وہ ایسا کرتی بھی کیسے ؟ اس نے اس کے لیے کوئی دکھ نہیں دیکھا تھا، کوئی زخم نہیں کھایا تھا۔ اس کے لیے یہ محض ایک ملک تھا، نیا مُلک جہاں اس کے باپ کو جائیداد کے ساتھ وزارت بھی ملنے والی تھی، یہ اور ایسے کتنے لوگ تھے جو اس زمین کی پناہ میں نہیں آتے تھے بلکہ اس پر حکمرانی کرنے کے دماغ لے کر آئے تھے۔ ہمارا ان کا کیا جوڑ۔ ہمارے لیے تو یہ زمین پناہ بھی تھی اور ہمارا کعبہ بھی۔ اِسی لیے تو اس کی سرحدوں پر ہم نے سجدۂ شکر ادا کیا تھا، اپنی سلامتی کے لیے نہیں، اس کی دید کے لیے اور ہاں اس مسجد میں داخل ہونے سے پہلے وضو بھی کیا تھا، پانی سے نہیں ہم نے اپنے خون سے ہاتھ پاؤں دھوئے تھے کہ جب ارضِ پاک میں داخل ہوں تو ہم بھی پاک صاف

ہوں۔

نئے وطن میں آنے کے بعد میں نے پہلی بار شاہانہ کو دیکھا تو اس رنگ میں دیکھا کہ وہ شہر کی چند بیگمات کے ساتھ رفیوجی کیمپ میں کپڑے بانٹنے آئی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے اس کا قصور بھُول کر اس کی طرف بھاگی۔ یہ بتانے کے لیے کہ دیکھو شاہانہ میں بھی پاکستان میں ہوں۔ مگر وُہ میری بات سننے کی بجائے مجھے دیکھتی رہی سر سے پاؤں تک۔ اس وقت وہ مجھے اپنی پرانی سکھی کو نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ یہ دیکھ رہی تھی میرا کُرتا کتنا میلا اور پھٹا ہُوا تھا، میرے پاؤں ننگے اور سر میں دھول اَٹی تھی۔ میری دُکھتی آنکھوں میں چیچپاہٹ بھری تھی۔ شاہانہ نے یہ سب کچھ دیکھا اور بغیر کچھ کہے سنے واپس چلی گئی، اتنی جلدی کہ اس نے میری ماں سے پیار بھی نہ لیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ آئی۔ کپڑوں کی ایک گٹھڑی اُٹھائے وہ ایک گوری گوری بیگم کے ساتھ ہمارے پاس آئی۔ "تم اپنے لیے کپڑے لے لو، اس میں سے، اس نے گٹھڑی آگے بڑھائی۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کچھ لینے کے لیے کہا جا رہا تھا اور وہ بھی شاہانہ کہہ رہی تھی۔ مجھے پہننے کے لیے پُرانے کپڑے دے رہی تھی۔ غصّے سے میرے گال تپ گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ بھاری بھرکم بیگم میری ماں کی طرف بڑھی "لو مائی تم بھی اپنے لیے کچھ لے لو" یہ بیگم صاحبہ اور کچھ نہیں تو میری ماں سے ضرور پندرہ برس بڑی ہوں گی۔ مگر نہیں، گھر سے نکل کر نئے وطن آتے ہوئے ہم نے جو پندرہ بیس دن کیمپوں اور قافلوں میں چلتے ہوتے گزارے تھے وہ آدھی صدی سے کچھ کم تو نہ تھے۔ اس عرصے میں تو بچّے بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔ یقیناً میری ماں اس بیگم کے مقابلے میں بوڑھی ہی لگ رہی ہو گی۔ چند سال بعد شاہانہ سے میری دوسری ملاقات کوئٹہ میں ہوئی جہاں میرے ابّا ملازمت کرنے لگے تھے۔ وہ شاید وہاں گرمیاں گزارنے آئی تھی۔ لمبی نیلی شیورلٹ

جس کے پیچھے جوڑے جوڑے پنکھ سے بنے ہوئے تھے وہ خود چلارہی تھی۔ میں نے تو اسے پہچانا تک نہیں کہ وہ اچھی خاصی بیگم نما سی چیز بن چکی تھی۔ مگر اس نے مجھے پہچان کر کار روک دی۔ میں اُس وقت میٹرک میں پڑھ رہی تھی اور اعتماد کے ساتھ اپنی زمین پر قدم جما کر چلنا سیکھ چکی تھی۔ "آؤ بیٹھو تمہیں گھر چھوڑ آؤں" اس نے کار کا دروازہ کھول کر دعوت دی۔ نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ میں نے اچھی خاصی بے رُخی دکھائی۔ مگر وہ تو ڈھیٹ بن گئی "چلو نا بھئی۔ مجھے اپنا گھر ہی دکھا دو۔ میں خالہ جان سے ملنا چاہتی ہوں"۔ وُہ رہا سامنے میرا گھر" "اچھا میں کبھی آؤں گی" کہہ کر اس نے کار چلا دی مجھے یقین تھا وہ کبھی نہیں آئے گی اور یہی میری خواہش بھی تھی۔ مگر اگلی شام وہ معہ اپنی کار کے ہمارے دروازے پہ کھڑی تھی۔ مجھے اس کا آنا اتنا ناگوار نہیں ہوا جتنا اس کے سامنے اپنی ماں کا رویہ۔ اماں اس بات پر شرمندہ ہوتی جا رہی تھیں کہ ہمارا گھر مفلسی اور تنگی کی تصویر تھا۔ شاہانہ کیا کہے گی، جلدی سے سفید چادر نکال کر اس کے لیے بچھا دی اور اس کے بعد تو انھوں نے حد ہی کر دی۔ مہینے کے باقی دنوں کا جو خرچ رکھا تھا سارا نکال کر اس کے پھل، مٹھائیاں منگوا کر اُس نک چڑھی مہمان کے آگے سجا دیئے اور پھر پرانے وقتوں کو یاد کر کے اپنی اور اُس کی ماں کی باتیں کر کے روتی بھی رہیں۔

تیسری مرتبہ میرا اُس کا سامنا لاہور میں ہُوا، جب میں ایم اے کا امتحان دے رہی تھی۔ اُس کی شادی ہو چکی تھی۔ کچھ زیادہ ہی طویل و عریض کار میں مافوق البھڑک قسم کے کپڑے پہنے رنگ روغن سے مزین بیٹھی تھی۔ اب کی بار زیور سونے کی بجائے ہیرے اور پلاٹینم کے تھے وہ شاید اُنھیں کی نمائش کرنے میرے ہوسٹل چلی آئی تھی اور ایک بھدا سا آدمی بھی اس کے پہلو میں تھا۔ یہ اس کا کروڑپتی شوہر تھا، صورت سے سمگلر اور توند سے سیٹھ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ لوگ ہنی مون منانے بیروت جا رہے تھے۔

بیروت سُنا ہے لبنان کا دارالخلافہ ہے جہاں دنیا بھر کے دولت مند عیش لُوٹنے آتے ہیں۔ پاکستان کے دولت مند بھی وہیں جا رہے تھے۔ دولت لٹانے عیش لُوٹنے۔ کیوں نہ ہو، اس دولت کا کوئی مصرف اندرون ملک جو دکھائی نہیں دیتا۔

اور آخری مرتبہ میری اس کی ملاقات چند سال پہلے ہوئی۔ یہ وُہ وقت تھا کہ جب ایوب خان کی آمریت کا تخت اُلٹ رہا تھا۔ سرمایہ داروں کے مستقبل پر زوال کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی کوٹھیاں فروخت کرنے لاہور آئی تھی۔ "اس ملک کا کوئی مستقبل نہیں"۔ اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ اس ملک میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا البتہ کوئی مستقبل نہیں۔ میرے اس جواب پر اس نے کوئی بحث نہ چھیڑی۔ اس کے بعد وہ کبھی پاکستان نہیں آئی، مگر خط لکھنے سے باز بھی نہیں آئی۔ کچھ نہ کچھ لکھتی ضرور رہتی۔ اپنی مصروفیات، اپنی دنیا۔ اپنی ترقیوں اور ساری "ترقی یافتہ" دنیا کے بارے میں میری معلومات بڑھاتی رہتی۔ کبھی کبھی تو اس کا انداز ایسے ہو جاتا۔ جیسے کسی اندھے سے روشنی کی بات کر رہی ہو۔ البتہ اب اس نے مجھے زندگی بنانے کا اور ترقی کرنے کا مشورہ دینا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ سرے سے میری ذات کی نفی ہی کر دی تھی۔ خط میں صرف ایسے مضمون ہی چھیڑا کرتی۔ سناؤ کیا حال ہے تمہارے ملک کا، "قوم آج کل کیا کر رہی ہے۔ کشمیر کو آزادی کب تک دلوا رہے ہو تم لوگ۔ لال قلعے پر جھنڈا لگانے کا پروگرام بنے تو مجھے دعوت دینا نہ بھولنا۔ آئندہ ملک کا صدر بننے کے لیے کونسا جرنیل تیاری کر رہا ہے؟ تمہارے انقلابیوں کا کیا رنگ ہے اور ہاں وہ سرمایہ داروں کے پالتو اور سدھائے ہُوئے کمیونسٹ لیڈر۔ کیا خیال ہے کب تک اقتصادی انقلاب برپا کر لیں گے۔ مجھے امید ہے تم ان باتوں کا جواب نہ دو گی۔ اس لیے نہیں کہ تمہیں غصہ آ جاتے گا، بلکہ اس لیے کہ تمہارے پاس ان کا کوئی

جواب، ہو گا ہی نہیں تم صرف سوچتی ہو جانتی کچھ بھی نہیں۔، تمہارے افکار محض خواب ہیں۔ تمہاری اپنی تمناؤں کے چہرے ہیں۔ اِن کا وجود حقائق سے نہیں بنتا۔ حقائق تو کچھ اور ہیں جنھیں تم جاننا بھی چاہو تو نہ جان سکو۔ تمہارے شعور کے گرد دیواریں ہیں۔ ان دیواروں کے اندر بھی دیواریں کھڑی ہیں۔ آہ تم بیچاری! اور وہ تمہاری قوم!! اتنی ہمت کہاں کہ ان دیواروں میں کوئی چھید ہی بنا لو، حقائق کی روشنی تمہارے قید خانوں تک پہنچے تو کیسے"؟

یہ سچ ہے کہ یہ باتیں غلط نہ تھیں مگر یہ ہمیں سب کچھ کہنے والی وہ کون ہوتی ہے۔ میری سوچیں بے معنی ہیں، میرے ملک کا لیڈر سچا نہیں، میری قوم فریب خوردہ ہے مگر شاہانہ سے زیادہ غلط اور کون ہو سکتا ہے۔ جیب کترا ہمیں ہلکی جیب رکھنے کا طعنہ بھی دیتا ہے۔ چہ خوب! میں نے اس کی ان باتوں کا اکثر جواب نہیں دیا۔ اگر کبھی لکھا تو اسطرح کا جملہ لکھا: تم جیسے بے فکرے اور عیاش ذہنوں کی خرافات کا واقعی میرے پاس کوئی جواب نہیں اور پھر ہماری لاعلمی سے فائدہ کون اُٹھا رہا ہے، تمہارے عیش کس کی دولت پر ہیں؟ تم لوگ ہی سب سے بڑے مجرم ہو۔ یہ باتیں لکھ کر میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا اور آس بندھتی کہ وہ آئندہ کچھ نہیں لکھے گی۔

آج جب بہت دنوں کے بعد اس کا خط آیا تو میرے پاس اس خط کے لیے کوئی احساس نہ تھا۔ نہ کوئی ڈر نہ اندیشہ، نہ بیزاری نہ تجسس۔ خط کھولے بغیر ہی مجھے عبارت کا علم تھا۔ ہو گا، کوئی زہر میں بجھا تیر جس سے وہ میرا دماغ چھیدنے کی کوشش کرے گی۔ ایسے سو کانٹے بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اور پھر کس نے کمی روا رکھی ہے ہمارے ساتھ۔ قتل بھی ہمیں کیا ہے۔ قاتل بھی ہمیں کو پکارا ہے۔ اگلوں نے خنجر ہمارے سینے سے کھینچ کر ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ اور پھر اپنے پرائے سب نے کھڑے ہو کر تماشا دیکھا ہے۔ تالیاں پیٹی ہیں۔ گالیاں بکی ہیں۔ کسی نے ہمیں

سہارا نہیں دیا۔ کسی نے اتنا بھی نہیں کہا کہ تم بھی اپنا بیان دے دو۔ اپنا شک بتا دو۔ ساری گواہیاں ہمارے خلاف گئی ہیں۔ آج ہم سے زیادہ دُکھی کون ہو گا؟ کون اتنا بے بس ہو گا، ہم کہ رونا چاہتے ہیں اور رو نہیں سکتے۔ پوچھنا چاہتے ہیں مگر پوچھ نہیں سکتے۔ آخر ایسا کیوں ہُوا۔ ہمارے ساتھ یہ کیوں ہُوا۔ ہماری آزادی کا احترام کیوں نہ کیا گیا؟ کیا ہم نے اس کے لیے کم قربانی دی تھی، تھوڑا خون بہایا تھا؟ یا ہمیں اس کی قدر نہ تھی۔ ہم جو لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں، ہمارے پاس دولت نہیں غریب ہیں، ہم سیاست نہیں جانتے۔ سیدھے سادے انسان ہیں۔ ہمارا تو بس ایک ہی مان تھا۔ یہ ملک عظیم ہے ہمارا ہے۔ ہم اس کے ہیں! ہمارا یہ مان کیوں توڑا گیا؟ چند لوگوں کے اعمال کی سزا ہم سب کو کیوں دی گئی؟ دُکھ شکست اور ذلت ہماری جھولی میں ایک ساتھ کیوں ڈال دیئے گئے؟ یہ سب کچھ میں دن رات سوچتی ہوں۔ میرے دل دماغ جسم اور روح کے روئیں روئیں میں نشتر لگا ہے۔ یہ ایک خوفناک قسم کا عذاب ہے۔ میں ایک خوفناک دَور میں زندہ ہوں جبکہ بہت سے لوگ مَر چکے ہیں۔ مایوسی اور تاریکی کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ زندگی ایک بھیانک خواب بن چکی ہے۔ جیسے کسی اندھیرے غار میں بند ہو گئی ہو۔ باہر جانے کا راستہ جانے کب ملے۔ روشنی کی کوئی کرن تک نہیں۔ خدا جانے یہ اندھیروں کا سفر ختم ہو گا بھی یا اس سے پہلے زندگی دم توڑ جائے گی۔ ایسے میں اس خط کے کیا معنی ہیں۔ یہ شاہانہ ہے جو کبھی دوست تھی۔ آج دشمن ہے۔ شاید آخری بار میرا مذاق اڑانا چاہتی ہے۔ میرے اعتماد کو ایک ٹھوکر یہ بھی لگانا چاہتی ہے کیوں نہیں، زخموں پہ نمک پاشی کرنے کا اُسے بھی تو حق ہے۔ یہ بیوقوف نہیں جانتی ہم زہر پینے والے لوگ ہیں! ایک بے تعلقی کے ساتھ مَیں نے لفافہ چاک کر ڈالا۔ کیا یہ تحریر تو شاہانہ کی ہے مگر یہ الفاظ؟ مَیں نے لفافہ اُلٹ کر بھیجنے والے کی تصدیق کی۔ نام پتہ سب اُسی کا تھا۔ اُس نے یہ الفاظ لکھے تھے "وطن عزیز کے ساتھ جو کچھ ہُوا، اس دیارِ غیر میں

ہم نے جو سنا پڑھا اور دیکھا کاش اس سے پہلے ہم اندھے بہرے اور گونگے ہو چکے ہوتے۔ آج کے دن ہم زندہ نہ رہے ہوتے اور اگر ہوتے تو تمہارے ساتھ وطن میں ہوتے۔ آج ہماری آنکھیں کھلی ہیں کہ عزت و وقار تو وطن کے ساتھ ہوتا ہے۔ دولت ہمارے پاس آج بھی ہے۔ اس دولت سے ہم اشیاء خرید سکتے ہیں۔ آرام وعیش خرید سکتے ہیں مگر عزت وآبرو نہیں خرید سکتے یہ متاع تو کسی بازار میں بھی نہیں بکتی۔ یہ تو فقط وطن کی دین ہے قوم کی بخشش ہے۔ آج جب ملک پہ مصیبت آئی ہے تو یہاں کے لوگوں کی نظروں میں ہمارے لیے تحقیر کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہا۔ ہم لوگ جنگ میں شریک نہ ہوتے مگر شکست اور ہزیمت میں برابر کے شریک ہیں۔ ان غیر ملکیوں نے جس حقارت اور تضحیک کا نشانہ ہمیں بنایا ہے وہ کسی شکست سے کم نہیں۔ اچھے وقتوں میں ان لوگوں نے ہماری قومیت کی کرید کبھی نہیں کی تھی۔ مگر آج ہماری کل شناخت پاکستان کے نام سے ہے ... پاکستان جو ٹوٹ گیا ہے۔ پاکستان جسے شکست ہوگئی ہے۔ آج ہمیں اندازہ ہوا کہ قوم وملک کی آبرو ہی ہماری آبرو تھی۔" میں نے یہ الفاظ پڑھ لیے اور سوچتی رہی۔ ۲۵ سال بعد، اتنا کچھ بگڑ جانے کے بعد شاہانہ کو اتنی سمجھ تو آگئی کہ افراد کی ترقی یا تنزل آج کی دنیا میں کتنے بے معنی استعارے ہیں آج کی دنیا قوموں کی دنیا ہے۔ قومیں افراد بناتی ہیں افراد قومیں نہیں بنا سکتے۔ مگر میری سوچ تو ہمیشہ سے مختلف تھی، پھر میرا اور اس کا انجام ایک جیسا کیوں ہُوا۔ آج سے پچیس برس پہلے میں نے اور اس نے اپنا اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے منہ پھیر کر چلے تھے اور قطعی مخالف سمتوں میں چلے تھے۔ ایک طویل سفر کے بعد آج پھر آمنے سامنے کھڑے ہیں، اُسی نقطے پر۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم نے سفر نہیں کیا، محض ایک مدت گزاری ہے۔ ایک ہی دائرے میں گھومتے گھومتے ایک چوتھائی صدی گم کر دی ہے۔ ایک چوتھائی صدی! اتنی مدت میں تو ہمارے ساتھ کے لوگ سُپر پاور کے مقام تک جا پہنچے

ہیں۔

یہ ۱۹۷۱ء ہے وہ ۱۹۴۷ء تھا جب اِس مہربان زمین نے ہمیں پناہ دی تھی۔ تب ہم زخم زخم تھے شکستہ و خستہ و خوف زدہ تھے۔ موت ہمارے تعاقب میں تھی، ظلم ہم پہ جھپٹ رہا تھا، یہاں آکر ہم نے پکارا بھی نہیں تھا کہ اس مہربان ماں نے اپنے پر کھول دیئے۔ ہمیں تحفظ دیا، ہمارے زخم دھوئے، مرہم لگایا۔ ہمیں بھوک لگی تھی، اس نے روٹی کھلائی، گندم کی روٹی جس میں چونا اور کانچ نہیں ملا تھا۔ ہمارے حلق میں کانٹے پڑے تھے۔ پانی پلایا۔ ٹھنڈا ستھرا پانی جس میں زہر نہیں ملا تھا تب ہی تندرست و توانا ہو کر ہم سفر پہ نکلے۔ اپنی ماں کے لیے کچھ کمانے چلے۔ یہ ۱۹۴۷ کی بات ہے آج ۱۹۷۱ ہے ہم لوٹ آتے ہیں، کیا لے کر؟ خالی ہاتھ؟ نہیں کچھ ندامت کچھ پچھتاوے، ٹوٹے پھوٹے اعتماد کی چند کرچیاں ہمارے دامن میں ہیں اور وہ دھرتی ماں خود زخم زخم ہے۔ پناہ دینے والی اس مہربان زمین کے ٹکڑے ٹکڑے بکھرے ہیں۔ اسے دشمن قدموں نے روندا ہے۔ ٹینکوں سے پامال کیا ہے۔ توپوں سے داغا ہے اور بموں کی آگ برسا برسا کر جلایا ہے۔ یہ اناج دینے والی دھرتی ہے۔ یہ وہی پناہ دینے والی مہربان زمین ہے۔ پچیس سال پہلے ثابت و سالم تھی۔ پھر نہ جانے کب ہم اِسے بھول گئے۔ اپنے آپ میں کھو گئے۔ اس قدر احسان فراموش کیسے بن گئے تھے ہم؟ ہم نے اس زمین کا حق ادا کیوں نہ کیا۔ اس کا تحفظ کیوں نہ کر سکے؟ پچیس برس تک اس دھرتی نے ہماری پرورش کی۔ اتنے برسوں میں ہم نے اس کا کیا بنایا، کتنا کمایا اس کے لیے؟ لمبے چوڑے حساب تو میں نہیں جانتی، دوسروں کے بارے میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ اپنے اور شاہانہ کے بارے بتا سکتی ہوں کہ شروع میں تو سب ٹھیک تھا۔ ہم نے بڑی لگن سے نئی زمین پہ زندگی شروع کی تھی۔ اس وقت تو نیت بھی صاف تھی، ارادے بھی خوب تھے۔ اپنے ملک کے اچھے لوگ بننے کے لیے ہم سکولوں میں گئے۔ کتابیں پڑھیں، حساب

سیکھے ۔ اُن کتابوں میں جو لکھا تھا اچھی طرح یاد رکھا تاکہ امتحان میں پاس ہو سکیں اور زندگی میں بھی کامران ہوں ۔ مجھے یاد ہے میرے سکول کی کتابوں میں اپنی زمین کا قرضہ اتارنے یا اس کا مان بڑھانے کا کوئی سبق نہیں تھا۔ وہاں تو سارے سبق اپنی زندگی بنانے سنوارنے یا اپنی آن کی تسکین و تکمیل کے عنوان پر تھے۔ کوشش کرو تو بادشاہ بن سکتے ہو جیسے ظہیر الدین بابر نے کی۔ کوشش کرو تو ناکامیوں سے بچ سکتے ہو۔ جیسے رابرٹ بروس نے کی ۔ کوشش کرو تو ترقی کر سکتے ہو جیسے لقمان حکیم نے کی۔ کوشش کرو تو ملک فتح کر سکتے ہو جیسے سکندر نے کیے۔ کوشش کرو تو کھوئی ہوئی محبوبہ مل سکتی ہے جیسے پہلے درویش کو مل گئی تھی۔ کوشش کرو تو بدلہ لے سکتے ہو جیسے خواجہ سگ پرست نے لیا۔ کوشش کرو تو معاف کر سکتے ہو جیسے حضرت علی نے کیا۔ کچھ سبق خدمت اور حقوق کے تھے ۔ ماں باپ کے حقوق ، بیوی بچّوں کے حقوق ، ہمسایوں کے حقوق۔ دشمنوں کے حقوق ، دوستوں کے حقوق ۔ نیک بننے کا فارمولا بھی کچھ اس طرح کا تھا کہ پہلے کوشش کر کے جس طرح بن پڑے دولت مند بن جاؤ۔ پھر غریبوں کو زکوٰۃ دو۔ خیرات بانٹو اور اُن پر احسان اور اللہ پر احسان کرو۔ اس نتیجے پر کسی نے نہیں سوچا کہ جو دولت مند اللہ پہ احسان کرنے کی استطاعت رکھتا ہو گا ۔ وہ بندوں کے ساتھ اور ملک کے ساتھ کیا نہیں کر گزرے گا۔ ممالک غیر کے بارے میں جو علم ہم تک پہنچا وہ اس طرح کا تھا ۔ امریکہ کے ہالی وڈ میں فلمیں کمال کی بنتی ہیں ۔ فرانس کی خوشبوؤں کا جواب نہیں ، چین کا ریشم بڑھیا ہے اور جاپان کی کاریں بے مثل ہیں، یہ سب کچھ ہمیں حاصل کر لینا چاہیے ، پالینا چاہیے ۔ جس طرح بھی ہو سکے ۔ بڑی درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم تھی ۔ ڈاکٹر بننے ، پروفیسر بننے اور انجنیئر بننے کے پُورے پُورے موقعے مہیّا تھے جو جس کا جی چاہے بن جائے ۔ ملک بنانے اور قوم تعمیر کرنے کے کوئی ادارے ہماری راہ میں نہیں آئے ۔ ایسی کسی تربیت گاہ میں ہمیں داخلہ نہیں ملا۔ جہاں ذات

کو زمین پہ قربان کرنے کے Methods سکھائے جاتے ہوں۔ زندگی کے جو معیار سامنے آتے وہ اس طرح کے تھے۔ کہ اعلیٰ ملازمت سے حکومت ملتی ہے، تجارت سے خوشحالی، سمگلنگ سے دولت اور صنعت کاری سے ملک خرید لینے کی قوت۔ ایسے حالات میں ہم نے اپنے ہی فیصلے کیے، خود ہی اپنی راہیں چُنیں۔ شاہانہ کے اور میرے راستے بظاہر الگ ہو گئے۔ اس نے میری طرف پیٹھ کر لی، مَیں نے اس سے منہ پھیر لیا۔ وہ دولت سمیٹتی رہی اپنے لیے، میں درد جمع کرتی رہی وہ بھی اپنے لیے، اندھیرے میں ہم نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہاں کوئی سمتیں تھیں نہ فاصلے تھے سب کچھ ایک دائرے میں چل رہا تھا، دائرے کا مرکز ہر کسی کی اَنا تھی۔ اُس دائرے میں گھوم کر آج ہم دونوں سہیلیاں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ خالی ہاتھ و تہی دامن۔ اُس کی دولت بے وقعت ہے۔ میرے درد بے آبرو ہیں اور وہ دھرتی جس نے ہمارے بچپن کو اپنی کو پناہ دی، ہماری جوانیوں کی پرورش کی۔ ہمارے سامنے زخم زخم پڑی ہے ہمارے پاس اس کے لیے ذرا سا مرہم بھی نہیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کا حساب تو اتنا ہے۔ درمیان کے ۲۴ برس کیا تھے، کیا ہوئے؟ کن اندھیروں میں کھوئے گئے۔ ہم دونوں مِل کر بھی انھیں تلاش نہیں کر سکتیں کہ روشنی نہ اُس کے پاس ہے نہ میرے پاس۔ رہی منزل تو اُس کا تصور تک باقی نہیں۔ یہ مُلک کیوں بنا تھا اس کے لوگوں کی منزل کیا تھی؟ کچھ یاد نہیں۔ اس کا سراغ لگانے کے لیے تو ہمیں بہت دُور تک اُلٹے پاؤں چلنا ہو گا، اس مقام کی نشان دہی کرنا ہو گی۔ جہاں آج سے چوبیس برس پہلے مَیں نے اور میری ماں نے ایک ساتھ سجدہ شکر ادا کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی بہت پیچھے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے شاہانہ کی حویلی میں پہلی بار مُسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا ہے۔ قائدِ اعظمؒ کا پیغام پڑھ کر سُنایا جا رہا ہے۔ مَیں پاکستان کا نام پہلی بار سُن رہی ہوں۔

ایک انوکھی سی دنیا میرے تصور میں اُبھر رہی ہے۔ میں اس نام کو بار بار دہرا رہی ہوں۔ پاکستان، پاکستان، پاکستان زندہ باد!! اور اس سے ذرا آگے کیمپ لگا ہے۔ پناہ گیروں کا کیمپ۔ پاکستان جانے کے لیے لوگ بیٹھے ہیں، سہمے ہوئے خوف زدہ گولیاں چل رہی ہیں، شعلے لپک رہے ہیں یہاں کتنے باپ ہیں جن کے جوان بیٹے ساتھ نہیں آ سکے۔ کتنی مائیں ہیں جن کی بیٹیاں بچھڑ گئی ہیں، کتنے بچے ہیں جن کے ماں باپ کھوتے گئے ہیں بیویاں ہیں جن کے سہاگ اُجڑ گئے، کتنے لوگوں کی آنکھیں نکال دی گئیں، کتنوں کی زبانیں کاٹ دی گئی ہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے روٹی کا ٹکڑا تک نہیں۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے مگر کنوئیں میں لاشیں بھری ہیں۔ آس پاس گدھ منڈلا رہے ہیں۔ وہ سامنے کتا انسان کے بچے کا کٹا ہوا ہاتھ منہ میں دبوچے بھاگا جا رہا ہے۔ میں سہم کر سامنے دیکھتی ہوں، اپنے وطن کی سرحدوں کے نشان ڈھونڈتی ہوں۔ کہاں ہیں امن کی سرحدیں... پاکستان کی سرحدیں!! میرے دل سے پکار اُٹھتی ہے۔ میں خوف زدہ ہوں میرا تحفظ کر۔ اے سلامتی کی سرزمین! میں خطرات میں گھری ہوں مجھے پناہ دے۔ اے پاک سرزمین! میں آگ میں کھڑی ہوں مجھے اپنے گھنے برگدوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ جانے دے۔ اے مہربان! ماں! میری پشتیں تیرا احسان مانیں گی۔ میری نسلیں تیری شکر گزار ہوں گی۔ اے دھرتی ماں! اے پاکستان کی زمین!!!

دسمبر ۱۹۷۱ء

سانپ

اچانک اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور پھر سڑک کے ایک طرف لے جاکر روک دی، "منظر بے حد خوب صورت ہے"۔ اس نے اطلاع دی۔

ہوں... کہاں ؟ میں نے چونک کر پوچھا۔

"سامنے دیکھو"!

اور میں نے سامنے دیکھا۔ حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ ہرے بھرے کھیت اور باغ، درختوں کے جھنڈ، اس اُجلے نکھرے سبزے پر کہیں کہیں ملگجے دھبّے سے بھی نظر آرہے تھے۔ یہ کسان تھے جو میلے مٹیالے لباس اور پتھر کے سے بے حس چہرے لیے مصروف کار تھے... مگر اس یکرنگی میں کچھ رنگ بھی شامل تھے۔ یہ تھیں لال، پیلی، اودی، نیلی، گلابی اور کیسری اوڑھنیاں جو پھول اور تتلیاں بن کر اِدھر اُدھر لہرا رہی تھیں۔ یہ کوئی فلمی منظر نہ تھا بلکہ پنجاب کے کھیتوں کی وہی جیتی جاگتی، سادہ و رنگین سی تصویر تھی جیسے زندگی بھر سے دیکھتی چلی آرہی ہوں۔

مگر اس غیر ملکی لڑکی کے لیے یہ سب کچھ بہت ہی نیا اور انوکھا تھا۔ یہ محض میرا خیال ہی ہے کہ وہ اس منظر سے بہت متاثر تھی۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی قومی عادت کے مطابق محض بن رہی ہو یا مجھے بنانے کی فکر میں ہو۔ بہرحال یہ غیر ملکی لڑکی جو اس وقت میرے برابر بیٹھی سامنے کے منظر کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے ایک ہی کائیاں ہے۔ بظاہر سیاحت کو نکلی ہے اور مشرق کے حسن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کتاب لکھنا چاہتی ہے۔ کہنے کو اس کی دلچسپی یہاں کے جغرافیے تک محدود ہے مگر در اصل اس کے

مشاغل سیاست اور صحافت دونوں ہیں حسین نظاروں کی تحسین کے ساتھ ساتھ یہ یہاں کی تاریخ اور باطنی زندگی کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی لیے سامنے پھیلے ہوئے مناظر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ میرے ذہن میں بھی جھانکنے کی کی کوشش کرتی ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں ان یورپ والوں کو ایسے ڈھونگ رچانے کی ضرورت کیوں ہے؟ ان لوگوں سے ہمارا چھپا ہی کیا ہے؟ کیا ہم پر ان لوگوں کی تحقیق ابھی تک مکمل نہیں ہوئی؟ پچھلی دو صدیوں میں انھوں نے ہماری زمین سے لے کر ہمارے ذہن تک کی ایک ایک تہہ، ایک ایک سلوٹ کو کھول کر، اچھی طرح چھان پھٹک نہیں لیا ہے؟ اور پھر پاکستان میں جہاں انھوں نے مٹی کے ایک ایک ذرے کا جگر چیرا ہے۔ جہاں زندگی کے لاشعور میں پڑی ہوئی ایک ایک کنکری کے رنگ حجم اور وزن تک کو وہ جانتے ہیں۔ اِن کمبختوں کو تو یہ علم تک ہے کہ کون کون سے پاکستانی کے پیٹ میں کِس کِس رنگ اور کِس کِس سائز کے کتنے کتنے کیڑے ہیں اور کن لوگوں کے خون میں کیسی کیسی بیماریوں کے جراثیم نے انڈے بچے دے رکھے ہیں؟ یہ لڑکی اب یہاں سے اور کیا تلاش کرنا چاہتی ہے؟ یہ میرے ذہن میں بار بار جھانکنے کی کوشش کیوں کر رہی ہے؟ مگر مجھے یہ اعتراض بھی کیوں ہو؟ وہ ایک آزاد قوم کی بیٹی ہے۔ جمہوریت کی پروردہ ہے اس کی سوچیں آزاد، اس کی فکر بے باک اور اس کی خودی بیدار ہے۔ وہ کیوں دوسروں کی بات پر بے دیکھے ایمان لے آئے! کیوں نہ ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھے، اپنے ذہن سے پرکھے اور اپنے زاویے سے لکھے۔ وہ کیوں نہ اپنے نظریے قائم کرے جبکہ اس کا معاشرہ اسے نظریے قائم کرنے کا حق دیتا ہے۔ اسے اِس قابل بناتا ہے اور پھر اس کے نظریوں کو قبول بھی کرتا ہے۔ اس کی اتنی انفرادیت اس لیے ہے کہ اسے اپنے معاشرے کا اعتماد حاصل ہے۔

ٹھیک ہے بناولیم! تم کتاب لکھ سکتی ہو۔ اپنے منفرد نظریے قائم کر سکتی ہو۔

سکتی ہو۔ تمہارا اپنے معاشرے کے ساتھ کوئی تصادم نہیں۔ تمہیں اتنی فراغت بھی میسر ہے۔ تم نے اپنے گھر کا سارا کام نمٹا لیا ہے۔ اب تم میرے ملک اور میری قوم پر کتاب لکھ سکتی ہو اور میں ..... میں یہ سب کچھ اس لیے سوچ رہی ہوں کہ مجھے تم پر رشک آ رہا ہے۔ میں احساس کمتری کا شکار ہوں۔ میں بھی ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے بھی نظریے قائم کرنے کا بڑا شوق ہے۔ مگر مجھے اپنے معاشرے کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔ نہ میرے پاس تمہاری ایسی انفرادیت ہے۔ میرے نظریوں کو میرا معاشرہ تسلیم نہیں کرتا۔ میں خود بھی اپنے معاشرے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لیے کہ میں نے کوئی معاشرہ نہیں بنایا۔ اس معاشرے کی تعمیر میں میرا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ خود میری تعمیر میں بھی اس معاشرے کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی منشا کے خلاف زندہ ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور وحشی ہیں۔ ہم دونوں میں تصادم ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے غلط ہیں۔ میرے لیے یہ ایک جہاں مستعار ہے۔ جسے میں پھونک ڈالنا چاہتی ہوں، جلا دینا چاہتی ہوں تاکہ اس کی جگہ ایک نئی دنیا، ایک آئیڈیل معاشرے کی تعمیر اُبھرے۔ ایک نئی تعمیر جس میں میرا بھی حصّہ ہو۔ اِس دَور کے ہر فرد کا حصّہ ہو۔ یہ زندگی کا پہلا حق ہے۔ ہم اسی طرح اور صرف اِسی طرح زندہ رہ سکتے ہیں۔ فرد اور معاشرے کا تصادم اسی طرح ختم ہو سکتا ہے کہ ہمیں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا حق دیا جائے۔ ہمیں ان کھنڈروں کو مٹا کر نئی بنیادیں استوار کرنے کا موقع دیا جائے ..... یہ کھنڈر اِن محلات کے ہیں جنہیں ماضی کے انسان نے اپنی ضرورت، اپنے آرام کے لیے بنایا تھا، انھیں وقت نے مسمار کر دیا ہے۔ آخر ہم ان کھنڈروں میں رہنے پر کیوں مجبور ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان بوسیدہ اور فرسودہ کھنڈروں کی چھت ہمارے سر پہ آن گرے اور ہم کچلے جائیں۔ اگرچہ افراد کے کچلے جانے کا یہ عمل تو اب بھی جاری ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی فرد۔ نظریے قائم کرنے والا فرد کسی نہ کسی بوسیدہ دیوار سے ٹکرا کر

باہر نکلنے کا راستہ بنانا چاہتا ہے مگر خود ہی اس دیوار کے ملبے تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ یہ تضادوں کا شکار معاشرہ کہیں اتنا فراخ دل ہے کہ قاتل، خونی، مجرم، ظالم، غدار، وطن فروش غرض ہر کسی پر مہربان ہے، ہر کسی کا محافظ ہے اور کہیں اتنا تنگ نظر ہے کہ نظریے قائم کرنے والوں کو اُبھرنے سے پہلے ہی کچل ڈالتا ہے۔

مگر یہ غیر ملکی لوگ جو جی چاہے سوچیں جتنے نظریے چاہیں قائم کریں، چاہیں تو رد کریں، چاہیں تو تمسخر اڑائیں، چاہیں تو لعن طعن کریں۔ ان کے لیے بھی بڑی گنجائش ہے اِس معاشرے میں، اِن کے نظریے بھی قابل قبول۔ ان کی سوچیں بھی قابل اعتبار ہیں صرف اس لیے کہ یہ لوگ ملکی نہیں ہوتے غیر ملکی ہوتے ہیں —

اب یہ معمولی سی انگریز لڑکی، یہ نیتا ولیم بھی تو کتاب لکھے گی پاکستان پر۔ اس کی کتاب تو ہم بھی شوق سے خریدیں گے اور شوق سے پڑھیں گے۔ اس لیے کہ ہر غیر ملکی لکھنے والا پاکستان پر اتھارٹی ہوتا ہے۔ ہونا بھی چاہیے کہ ان لوگوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں عقل ہوتی ہے۔ ان میں کہیں بھی ڈولتی ہوئی چھتوں، گرتی ہوئی دیواروں اور بیٹھتی ہوئی بنیادوں کا مضمون نہیں ہوتا۔ ان پر "اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے" والی شرط بھی نہیں لگی ہوتی، نہ ہی ان لوگوں کی کتابیں "جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود" کے سبق دیتی ہیں۔ یہ لوگ سمجھدار ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے ایسی کتابیں نہیں لکھتے۔ لکھتے ہیں تو کچھ فائدے اور نفع کی باتیں لکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ کے کمرے کی دیواریں بوسیدہ ہو رہی ہیں۔ ان پر پلاسٹر پینٹ کروا لیجیے۔ ہم نے خاص کر آپ کی ضرورت کے لیے اس کے کارخانے کھولے ہیں، آپ صرف زرمبادلہ کا انتظام کر لیجیے اور بس۔ اور یہ آپ کے گھر کا فرش خراب ہو رہا ہے۔ اس پر بہت اچھا اور دبیز قالین مہیا کرنا ہمارا کام ہے۔ آپ صرف آرڈر دیجیے اور بس۔ اور آپ کے باغیچے کی زمین میں سیم لگ رہی ہے۔ ہمارے ماہرین کی خدمات حاصل کیجیے...

تو نیتا ولیم! تم ہمارا جائزہ لو اور بے فکری سے ہم پر کتاب لکھو۔ ہم زرمبادلہ

خرچ کر کے تمہاری کتاب منگائیں گے اور پڑھیں گے۔ تم بھی یاد رکھو کہ ہمارے ہاں ہر وہ چیز بڑی اہم ہوتی ہے جس پر زرِ مبادلہ خرچ ہوتا ہے اور ہر وہ شے بیکار ہوتی ہے جو یہیں کے کسی سرپھرے نے بنائی ہو۔ بہر حال ہمارا معاشرہ جلد ہی تمہیں پاکستان کے مسائل پر اتھارٹی تسلیم کر لے گا — ہاں تمہیں نیتا ولیم! مجھے نہیں!

اور میں نے ایک بار پھر رشک سے نیتا ولیم کو دیکھا جو سامنے دیکھ رہی تھی اور عین اُس وقت جبکہ اس کی برتری میرے احساسِ کمتری پر مسلّط ہو رہی تھی۔ میری خیالی اَنا مجھے سہارا دینے آگئی — پرواہ مت کرو! یہ عورت انگلینڈ سے آئی ہے تو کیا ہُوا؟ پاکستان آج بھی اسکے ملک سے کتنا بڑا ہے۔ اس کی تاریخ بڑی ہے! میری تاریخ اس سے بہت بڑی ہے! کیا ہے بھلا اس کی تاریخ؟ صرف ایک دَور کا حوالہ دے سکتی ہے نا! جب سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ہوں! کلونئیل ازم بھی کوئی فخر کی بات ہے؟ اور میری تاریخ صدیوں پر پھیلے ہوئے ایسے کئی ادوار رکھتی ہے۔ جب مشرق تا مغرب مسلمان ریاستیں پھیلی ہوئی تھیں — اسی ہندوستان پر اس کے باپ دادا نے دو سو سال راج کیا۔ میرے باپ دادا نے ہزار برس تک حکومت کی! — بہت خوب — بڑا صحیح مقابلہ ہے — تم جیت رہی ہو۔ یہ میری اصلی انا کی پکار تھی! تمہارا ماضی اس کے ماضی سے بڑا، تمہارے باپ دادا اس کے باپ دادا سے بہت اونچے۔ اب اور آگے بڑھو۔ اس لڑکی کے مقابل خود بھی آجاؤ۔ اب دیکھو کیا تم اس لڑکی سے آنکھیں ملا سکتی ہو؟ ذرا ناپو تو تمہارا قد کاٹھ اس کے مقابلہ میں کتنا ہے۔ نہیں نہیں میں اس سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے پاس اعتماد ہے، نظریے ہیں، آزادی ہے۔ یہ میرے ملک میں اپنے معاشرے کا اعتماد لے کر آئی ہے۔ یہ میری کمزوریوں سے واقف ہے۔ میرا تماشا دیکھنے چلی آئی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اس سے کمتر ہوں، مجھے

کسی کا اعتماد حاصل نہیں۔ میرا کوئی معاشرہ نہیں۔ میں نے کچھ بھی تعبیر نہیں کیا۔ میں نے ابھی تک آزادی بھی ٹھیک سے حاصل نہیں کی ہے۔! اور میرا جی چاہا میں نیتا ولیم کی نیلی نیلی آنکھیں پھوڑ ڈالوں، اس کا خوب صورت سا سر کچل کے رکھ دوں۔ اسے ٹھوکریں مار مار کر ملک سے باہر نکال دوں۔ آخر وہ کیا دیکھنے آئی ہے یہاں؟ یہی ناکہ ہم وحشی ہیں، درندے ہیں، ہمارے ہاں ابھی تک جنگل کا قانون لاگو ہے، ہم نے تہذیب کی ابھی پہلی سیڑھی پہ پاؤں نہیں رکھا اور کیا لکھے گی یہاں سے جاکر! بربادیوں کی وہی داستان جس میں تہذیب، انصاف اور جمہوریت کا قتل بھی ہوا — مگر میں کس کس کا سر کچلوں گی؟ صرف نیتا ولیم ہی تو نہیں، ساری دنیا میری تماشائی ہے، ساری دنیا میری بربادیوں کی داستان لکھ رہی ہے۔ پھر مجھ میں اتنا وزن ہی کہاں ہے کہ میں کسی کو کچل سکوں — میں تو صرف ٹکرا سکتی ہوں — ٹوٹ سکتی ہوں۔

مجھ میں اتنی ہمت ہوتی تو کیا میں ان سانپوں میں سے ایک دو کو نہ کچل ڈالتی جو اتنے برسوں سے میری ساری قوم کا خون پی رہے ہیں اور نت نئے سنپولیے پیدا کر رہے ہیں، جنھوں نے پوری ایک نسل کے وجود میں زہر گھول دیا ہے۔ اس زہر نے آج ساری کی ساری قوم کے اعصاب مفلوج کر دیئے ہیں۔ ان کے شعور کو مفلوج کر کے احساس کی روح کو قتل کر دیا ہے — اُف یہ موذی، یہ بڑے بڑے کوبرے، کالے ناگ — سُرخ سُرخ آنکھوں اور لمبی لمبی دوہری زبانوں والے خوفناک اژدہے — مَیں اُنھیں دیکھ رہی ہوں۔ مَیں اُنھیں پہچانتی ہوں۔ مَیں ان کے نام بھی جانتی ہوں۔ ان سب نے مل کر ہمارا اتنا خون پیا ہے، کہ نقاہت سے ہم کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ آج ان میں سے بعض مَر چکے ہیں۔ بعض پر لمبی نیند طاری ہے — مگر ہماری نجات کی گھڑی اب بھی دُور ہے کہ یہ سب اپنی نسل بڑھا کر اور اپنے قائم مقام چھوڑ کر مَرے ہیں۔ یہ چھوٹے سے قد کا پھرتیلا اور چمکیلا سانپ بھی اسی نسل سے تھا۔ اگرچہ اُس کا قد چھوٹا

تھا اور رنگ ذرا مختلف تھا تو بھی کیا فرق پڑا! زہر کسی رنگ کا بھی ہو سکتا ہے اور چھوٹا سانپ تو ہمیشہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ یاد نہیں وہ کہانی؟ پالی کی کہانی جس نے اپنی لاٹھی کے سرے سے ایک چھوٹے سے سانپ کو کچلنا چاہا تھا مگر لاٹھی ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر بکھر گئی تھی۔ سانپ نے لاٹھی کو ڈس لیا تھا اور یہ اتنا زہریلا سانپ تھا کہ لاٹھی ہی چور چور ہو گئی تھی ۔ یہ میری قوم بھی سانپوں کو پالتی ہے، دودھ پلا پلا کر ان کی پرورش کرتی ہے اور جب یہ جوان ہو جاتے ہیں تو یہ خون پیتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں انسانوں کا ان کے بچّوں کا ـــ مگر کسی میں اپنے خون کے تحفظ کے لیے غیرت نہیں جاگتی۔ کوئی ان کا سر نہیں کچل سکتا۔ ان سے تو بنی اسرائیل کی قوم ہی بہتر تھی کہ کوئی موسیٰ تو پیدا کر سکتی تھی اور وہ لوگ بھی جن کے بادشاہ کے دونوں کندھوں پر سانپ اُگ آتے تھے۔ یہ سانپ بھی انسانوں کا خون پیتے اور گوشت کھاتے تھے۔ ورنہ خود بادشاہ کو کاٹ کھاتے تھے۔ کچھ دنوں تک تو بادشاہ اور وزیر نے چوری چھپے ان سانپوں کو رعایا کا خون پلایا مگر جلد ہی راز کھل گیا اور سارے ملک میں بغاوت بھڑک اٹھی۔ لوگوں نے بادشاہ سمیت سانپوں کو کچل کر اپنی نجات کروالی مگر یہاں تو پوری ایک نسل ختم ہوتی جا رہی ہے، کسی کے خون میں جوش نہیں آتا۔ کوئی اپنی جوان نسل کے تحفظ کے لیے سانپوں کے خلاف بغاوت نہیں کرتا۔ شاید یہ بھی زہر ہی کا اثر ہے اور یہ بھی یقیناً زہر ہی کا اثر ہے کہ "متاعِ دین و دنیا گئی مگر لٹنے والوں کو احساسِ زیاں ہی نہیں، سبحان اللہ!

اور یہ انگریز لڑکی جو آنکھوں پر دُوربین رکھے پنجاب کا حسن دیکھ رہی ہے۔ واپس جا کر آدھے پاکستان پر کتاب لکھے گی۔ اس کتاب میں کیا یہ صرف مناظر کی بات کرے گی یا اس میں سانپوں کا تذکرہ بھی کرے گی اور ستائی ہوئی مرتی ہوئی قوم کا بھی۔ چلو اچھا ہے۔ یہ لوگ لکھیں (جیسا بھی لکھیں) آخر ہمارے

ہی کام آئے گا۔ پاکستان کا نیا انسان جب کبھی سچ کی تلاش میں نکلے گا تو ان غیر ملکی لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہی ٹٹولے گا۔ اپنی تاریخ تو ہم نے ماضی میں بھی کبھی خود نہ لکھی۔ اب تو خیر تاریخ سازی کا کام بھی ہمارے لیے دوسرے ہی کر رہے ہیں۔ آخر ہندوستان کا نیا مسلمان بھی تو خطباتِ احمدیہ لکھنے کے لیے ولایت ہی گیا تھا اور ہمارا نیا مفکر بھی یہ خبر یورپ ہی سے لایا تھا کہ۔

اُڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

شاید یہی لوگ اپنی کسی ضرورت کے تحت اس بکھری داستان کی شیرازہ بندی بھی کر دیں۔ مگر یہ عُقدہ کیسے وا ہو گا۔ یہ بھید آخر کس طرح کھلے گا کہ یہ قوم جس نے غلامی میں مفکر لیڈر اور قائد پیدا کئے، جس نے اتنے عزم و یقین سے غلامی کی زنجیریں توڑیں اور اس شان سے آگے بڑھی کہ دنیا کا نقشہ بدل ڈالا، آزادی کے بعد سانپ سنپولیئے کیوں پالنے لگی؟

میں ان سوچوں میں گم تھی کہ نیتا کی آواز نے چونکا دیا "ہے نا سچ مچ کا بیوٹی سپاٹ"۔ اس نے ایک بار پھر مجھے شریکِ نظارہ کرنا چاہا۔

"ہاں۔ مگر یہ کوئی خاص ٹکڑا نہیں۔ تقریباً سارا پنجاب ہی ایسا ہے"۔

"اچھا! ایئر ہوسٹس نے تو مجھے بتایا تھا کہ خوب صورت والا پنجاب انڈیا کے پاس ہے"۔

"ہوں! اور کیا بتایا تھا تمہاری ایئر ہوسٹس نے"؟

"اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بنگال ہی پاکستان کا سب سے خوبصورت علاقہ تھا"۔

"جو اب انڈیا کے پاس چلا گیا ہے، یہ بھی تو بتایا ہو گا تمہاری ایئر ہوسٹس نے"؟

میرے تلخ لہجے پر نیتا پریشان ہو گئی اور بولی "تم جذباتی ہو رہی ہو"۔

"نہیں میں جذباتی نہیں ہو رہی ہوں۔ جذبات کا یہاں کیا کام۔ یہاں

تو ٹھوس حقائق سامنے رکھنے ہیں۔ ٹھیک ہی کہا تھا تمہاری ایئر ہوسٹس نے۔ پنجاب کا حسن پہلے ہی ہندوستان کے پاس تھا۔ باقی پاکستان کا کچھ حسن بنگال میں تھا، کچھ کشمیر میں۔ یہ دونوں بھی ہندوستان کے پاس چلے گئے۔ پاکستان کے سارے خوب صورت اور حسین اعضا کٹ چکے ہیں۔ باقی جو کچھ بچا ہے اس میں کوئی حسن نہیں، ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ کبھی مجروح جسم بھی حسین کہلایا ہے اور تم لوگ۔ تم غیر ملکی لوگ جو یہ سب جانتے ہو پھر بھی بھولے بن کر ہم سے حسن کی بات کرتے ہو۔ کتنے ستم ظریف ہو تم لوگ کہ اب بھی پاکستان میں حسن تلاش کرنے آتے ہو جیسے جانتے ہی نہیں کہ یہ ایک زخمی ملک، ایک گھائل وجود ہے۔ اس کے اندر اور باہر بے شمار زخم لگے ہیں۔ ان گنت ناسور بنے ہیں۔"

نیتا کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے سگرٹ سلگایا اور میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "اور تم لوگ ابھی تک ہندوستان سے نفرت کرتے ہو، اور جنگ کی بات سوچتے ہو؟"

"تو اور کیا ہم ہندوستان سے محبت کرنے لگیں؟ تمہارے ہاں کیا دشمن سے محبت کی جاتی ہے؟"

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں، تم لوگ اپنے مفاد کے لیے صلح اور امن کی بات تو کر سکتے ہو نا؟"

"صلح اور امن ہو بھی گیا تو کیا ہو جائے گا؟"

"پاکستان قائم رہے گا۔ تم لوگ ترقی کرو گے۔ ہندوستان کی طرف سے مزید تباہی کا خطرہ کم ہو جائے گا۔"

"تم نہیں سمجھتی ہو نیتا۔ اول تو ہمارے سارے زخم ہندوستان کے لگائے ہوئے نہیں ہیں۔ دوسرے ہندوستان سے صلح اور دوستی ہمارے لیے جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہو سکتی ہے۔ ہمارے دکھوں کا علاج ہندوستان سے صلح کر لینے میں نہیں ہے!

"تو کیا تم لوگ ہندوستان کی دشمنی سے خائف نہیں ہو؟"

"میں تو۔ مگر دشمن کس کے نہیں ہوتے کیا ہندوستان چین کا دشمن نہیں ہے؟ کیا چین روس کا اور روس چین کا دشمن نہیں ہے؟ کیا امریکہ چین اور روس کا دشمن نہیں ہے۔ ایسی دشمنیاں دنیا بھر میں بکھری پڑی ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ پر قومیں زیادہ زندہ رہتی ہیں"۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر پاکستان ایک چھوٹا کمزور ملک ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان ایک بڑا اور طاقتور دشمن ہے"۔

"یہ بات بھی سچ نہیں ہے۔ پاکستان نہ کبھی اتنا چھوٹا تھا اور نہ ہی کمزور۔ اس ملک کا جغرافیہ یہاں کی تاریخ اور عسکری قوت اس نوعیت کی تھی کہ ہندوستان جیسے وسیع اور کثیر آبادی والے ملک کو بھی اس سے دبنا پڑتا۔ ہندوستان کی زیادہ آبادی اس کی طاقت نہیں اور نہ ہی پاکستان کی کم آبادی اس کی کمزوری ہے۔ ملکوں اور قوموں کی قوت ان کی تاریخ میں، ان کے جغرافیے میں اور ان کے نظریے میں ہوتی ہے۔ یہی تینوں چیزیں مل کر قوم کا کردار بناتی ہیں۔ ہمارے پاس یہ سب عوامل تھے۔ ہندوستان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر المیہ ہی کچھ اور ہے۔ ہماری بربادی کے اسباب دوسرے ہیں"۔

"جنھیں تم محفوظ رکھنا چاہتی ہو شاید؟"

"ہرگز نہیں۔ مَیں کچھ بھی محفوظ کرنا نہیں چاہتی۔ میں تو سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ نہ صرف تمہیں بلکہ ساری دنیا کو۔ میرا دل چاہتا ہے میں ساری دنیا کو ایک جگہ جمع کر کے بتاؤں کہ سنو دنیا والو! سنو میں ایک پاکستانی ہوں۔ میرا وطن بہت پیارا ہے۔ بہت ہی حسین ہے۔ میرے وطن کی روایات بڑی قدیم اور بڑی عظیم ہیں۔ یہاں سب کچھ ہے۔ یہاں کے کھیت سونا اُگلتے ہیں۔ یہاں کے دریاؤں میں چاندی بہتی ہے۔ یہاں کے پہاڑوں پر ہیرے جھلملاتے ہیں، یہاں اتنے پھل ہوتے ہیں، اتنے اناج ہوتے ہیں

کر اور کہیں بھی نہیں ہوتے۔ یہاں بڑے بڑے شہر، پیارے پیارے گاؤں ہیں اور یہاں کے لوگ! — وہ تو بہت ہی پیارے، بہت ہی من موہنے۔ بڑے بڑے گنوں والے، غیرت والے، وطن کی آن پر مٹنے والے ہیں۔ یہ اپنی محنت سے اپنے وطن کو رشکِ جنت بنانا چاہتے ہیں مگر بنا نہیں سکتے۔ ان کی محنت رائیگاں جاتی ہے۔ یہ اپنے خون سے اپنے وطن کی آن بچانا چاہتے ہیں مگر نہیں بچا سکتے۔ ان کا خون رائیگاں جاتا ہے۔ لوگو سنو! میرے وطن کے لوگ بڑے دکھی بڑے پریشان ہیں۔ ہر وقت خوف زدہ رہتے ہیں۔ ہر وقت ایک خطرہ ان کے سروں پر مسلط رہتا ہے۔ جانتے ہو، جاننا چاہتے ہو وہ خطرہ کیا ہے؟ وہ خطرہ ہندوستان کا نہیں ہے۔ وہ خطرہ سانپوں کا ہے۔ پاکستان کے اپنے سانپوں کا۔ پاکستان میں سانپوں کی کثرت ہے۔ بڑے بڑے زہریلے اور خطرناک سانپ یہاں اپنی نسل بڑھا رہے ہیں۔ ان سانپوں کے رنگ اور قد مختلف ہیں۔ ان کے کاٹنے اور زہر پھیلانے کے طریقے جداگانہ ہیں۔ بعض تو اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ مستقل کنڈلی مارے خزانوں پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے کچھ بیٹے یا پوتے بہت تیز طرار اور پھرتیلے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے لوگوں کے پیچھے بھاگ کر انھیں کاٹتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ چھپ کر بیٹھے رہتے ہیں اور موقع پا کر حملہ کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ہمیشہ ایک ہی رنگ روپ رکھتے ہیں اور کچھ بار بار کینچلی بدلتے رہتے ہیں۔ ایک آدھ تو ایسا کراماتی بھی ہے کہ کبھی کبھی انسانوں کی جون بنا لیتا ہے۔ یہ سب سے خطرناک ہے کہ ڈس لینے کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ کوئی گوشہ ان سانپوں سے محفوظ نہیں۔ ہم سب سوتے جاگتے ان سے خطرے میں رہتے ہیں۔ ان کے کاٹنے اور ڈسنے کا عمل اتنا تیز ہے کہ اب تک ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی مر چکی ہے۔ ہمارا بارہ کروڑ کی آبادی کا ملک صرف پانچ کروڑ کا رہ گیا ہے۔ باقی جو کچھ ہے۔ اس کی رگوں میں بھی زہر سرایت کر رہا ہے۔ کوئی نہیں جو ہمارا دکھ

سمجھے۔ کوئی نہیں جو ہمیں تریاق کا سراغ لگانے میں مدد دے۔"

نیتا نے اپنا سگریٹ ختم کر کے باہر کی طرف اچھال دیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو گئی اور بولی۔" میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگوں کی لیڈر شپ اچھی نہیں رہی۔"

"لیڈر شپ صرف اچھی ہی ہوتی ہے۔ نیتا! کم اچھی اور زیادہ اچھی کا فرق ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو سرے سے لیڈر شپ نصیب ہی نہیں ہوئی۔ محمد علی جناح کے ساتھ ہی ہمارا لیڈر مر گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں لٹیروں نے گھیر لیا۔ رہزنوں نے تاک لیا۔ یہ لوگ نام بدل بدل کر آئے۔ بھیس بدل بدل کر نکلے اور قوم کو لوٹ لوٹ کر کنگال کرتے رہے۔ یہ ایک نیا ملک تھا۔ ہم ایک نئی قوم تھے۔ ولولے اور حوصلے سے بھرپور۔ ہم آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ترقی کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں قیادت کی ضرورت تھی مگر ہماری حالت بس ایسی رہی جیسی غالب کی تھی کہ:ے

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہم نے بہتوں کو آزمایا مگر ان میں راہبر کوئی نہ تھا۔ رہزن بہت آئے۔ استحصالی نظام کی روح نے اپنا نام لیڈر رکھ لیا۔ اس لیڈر نے قوم کی ساری متاع دین و دنیا لوٹ لی، اس کے نظریے تک پامال کر دیئے۔ اس کے آدرشوں تک کا استحصال کیا۔ پاکستان کا المیہ یہی ہے کہ یہاں لیڈر استحصالی طبقے کا بہت گہرا رشتہ دار رہا۔ کبھی یہ اس کا باپ ہوتا ہے اور کبھی بچہ اور کبھی لے پالک۔ یہ لیڈر بھی غیر ملکی کارخانوں میں تیار ہوتے ہیں۔ قومی نفسیات کے بڑے بڑے ماہرین ان لیڈروں کی تیاری پر محنت کرتے ہیں اور جب یہ مکمل ہو جاتے ہیں تو انھیں آگے بڑھاتے ہیں ۔ کبھی جیپ میں بٹھا کر، کبھی عوام کے کندھوں پر سوار کرا کے۔"

میری بات سُن کر نیتا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور بولی۔" میرا خیال

ہے اب تو پاکستان کے عوام یہ سب سمجھنے لگے ہیں۔ وہ حالات کو بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"تمہارا یہ خیال بھی درست نہیں نیتا۔ پاکستان کے عوام پہلے بھی یہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ حالات کو بدلنے پر وہ آج بھی قادر نہیں ہیں، اس لیے کہ طاقت ان کے پاس نہیں ہے۔ نظریے کی حد تک تو ہم بھی کہتے ہیں کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں مگر دراصل ہمارے ہاں طاقت کا تصوّر نہیں بدلا۔ حکومت کا تصوّر اگرچہ بدل گیا ہے مگر چونکہ طاقت اور حکومت دونوں کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے حکومت خواہ کوئی ہو طاقت کی آلہ کار بن جاتی ہے۔ پاکستان میں ابھی زمینداری اور سرمایہ داری طاقت کی علامتیں ہیں۔ یہی دونوں حکومت پر بھی مسلط رہیں۔ ایک تیسری طاقت کو بھی اس کے مقدس منصب سے ہٹا کر اپنا آلہ کار بنایا گیا، یہ پاکستان کی عسکری قوت تھی۔ اس طرح طاقت کا یہ تصوّر ایک مثلث کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زر، زمین اور لاٹھی۔ ملک اور قوم کی حیثیت ایک بھینس کی بن گئی۔ جسے ہنکانے کے لیے زمیندار اور سرمایہ دار لاٹھی کو استعمال کرتے رہے۔ اس لاٹھی پر اکثر چھینا جھپٹی بھی ہوتی رہی جس کے نتیجے میں آج یہ لاٹھی کہیں کہیں سے ٹوٹ چکی ہے مگر طاقت اب بھی عوام کے پاس نہیں۔ اتنی مضبوط لاٹھی نے نہ دشمن کا سر توڑا نہ کسی سانپ کو کچلا۔ شاید وہ پالی کی کہانی سچ ہی تھی جس نے اپنی لاٹھی کے سرے سے ایک سانپ کا سر کچلنا چاہا مگر سانپ نے لاٹھی کو ڈس لیا اور لاٹھی چور چور ہو کر زمین پر بکھر گئی۔"

نیتا آنکھیں پھاڑے میری باتیں سُن رہی تھی۔ شاید یہ پالی کی کہانی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ مگر چلو یہ بھی اچّھا ہی ہُوا!

اگست ۱۹۷۲ء

تیئیس مارچ

اس سے زیادہ غلط بات اور کوئی نہ ہوگی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ تاریخ کوئی داستان یا قصّہ کہانی نہیں جسے جب جی چاہے دہرا لیا جائے، یہ بھی کچھ لوگوں کا حسنِ خیال ہے کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حادثات کا اجتماعی نام تاریخ ہے۔ کتنے ہی واقعات ہوتے ہیں کہ وقت کے ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ بھول سے جاتے ہیں۔ کچھ جو یاد رہتے ہیں وہ اس لیے کہ ان کی بار بار تکرار کی گئی ہوتی ہے۔ پھر جب ان سے ملتے جلتے واقعات سامنے آتے ہیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ تاریخ زندگی کا ایک عمل ہے جو مسلسل اور مستقل آگے آگے بڑھتا ہے، ایک بہتا ہوا دھارا ہے۔ اتنا خودسر کہ ساتھ چلنے والوں کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت نہیں دیتا۔ یہ اپنی راہیں خود متعین کرتا ہے۔ انسانی شعور کو اس کا رخ پہچان کر ہی اپنے عمل کی منزلوں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

ہاں تو تاریخی عمل کا یہ دھارا بہتا ہے کبھی تند اور تیز کبھی دھیمے دھیمے مگر ہمیشہ آگے کی طرف۔ کبھی کبھی اپنا رُخ دائیں بائیں تو موڑ لیتا ہے مگر الٹا کبھی نہیں چلتا۔ نہ کبھی تھم کر ساکت و جامد ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ہم ہیں جو اس سفر میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ تو تاریخ کے نام سے ماضی کی باتیں دہرانے بیٹھ جاتے ہیں۔ ارتقاء عمل کا ساتھ دینے میں ناکام ہو کر کسی ایک جگہ اٹک جاتے ہیں۔ پھر زندگی کی پیچھے چھوڑی ہوئی دلدلوں میں دھنس کر وہیں گلنے سڑنے لگتے ہیں۔ لوگوں پہ یہ حالات اس وقت آتے ہیں جب آگے دیکھنے والی نگاہ ان کے پاس نہیں رہتی۔ عام طور پر یہ بے یقینی کا اندھیرا ہوتا ہے جو مستقبل کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ تب یہ مخالف سمت

ہیں چلنے کی تمنا کرتے ہیں۔ کوئی ایسا ہی وقت ہوتا ہے جب ہم گذری بسری باتیں لگا تار دہراتے ہیں۔ ماضی میں پناہ گزیں ہونے کے لیے یادوں کا کوئی جزیرہ تلاش کرتے ہیں۔ زمانے سے بچھڑ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر وقت کو الٹے پاؤں چلنے کا حکم لگاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ وقت کبھی اُلٹے پاؤں نہیں چلتا۔ زمانے کا یہ دستور ہی نہیں کہ وہ کسی کے لیے مئے شبانہ کا حصّہ بچا کر رکھ لے۔ تاریخ ساز قومیں زندگی کی اس رمز کو سمجھتی ہیں۔ وہ تاریخ کے اُلٹے پاؤں چلنے پر یقین نہیں رکھتیں۔ یہ تو فقط ناکام لوگوں کا ضعفِ یقین ہے کہ وہ عمرِ رفتہ کو آواز دیتے ہیں۔ انھیں ایسے لوگوں میں سے ہم ہیں۔ ہم جو پاکستانی قوم کہلاتے ہیں نہ جانے کس کو سنانے کے لیے بار بار کہی سُنی باتوں کو بار بار دہراتے ہیں۔ صرف ایسا کرنے کے لیے ہم دنوں کی یادگاریں مناتے ہیں۔ ماضی کے اہم واقعات کی یادوں کو ہم نے دنوں اور تاریخوں کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے۔ انھیں زندگی بھر کے لیے بھلا کر ہم نے ان کی یادوں کے لیے دن مقرر کر لیے ہیں۔ ہر لحظہ یاد رکھنے کے لائق باتوں کے لیے خاص تاریخیں پکی کر لی ہیں۔ ۱۴ اگست، ۲۳ مارچ، ۲۱ اپریل، ۱۱ ستمبر، ۶ ستمبر اور اب ان میں ایک اور تاریخ ۱۶ دسمبر بھی ان میں شامل ہوگئی ہے جسے آدھی قوم جشن کا دن کہتی ہے اور آدھی ماتم کا ہر سال ان تاریخوں پر دیئے گئے پیغاموں، تقریروں، تحریروں کو جمع کر کے نچوڑا جائے تو ایک ہی حسرت ٹپکے گی کہ کاش کسی طرح وقت کی گاڑی ماضی کے رُخ اپنا سفر شروع کر دے اور یہ سب ہی لیڈر، دانشور اور ادیب اپنے اپنے مطلوبہ اسٹیشنوں پر اُتر جائیں۔ ایک چاہے گا یہ گاڑی ۱۹۷۰ء پر جا رُکے۔ دوسرا کہے گا ۱۹۴۷ء تک پیچھے چلی جائے۔ تیسرے کی تمنا اس سے بھی سات برس اور آگے جانے کی ہوگی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ماضی کے مردہ خانے میں صدیوں کے فاصلے طے کرنے کو تیار پھرتے ہیں مگر مستقبل کی جانب ایک قدم بھی اُٹھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یہ سب کے سب وقت کے اندھے ہیں جو ماضی کی لاٹھی ٹیکتے ہوئے صرف اس جگہ تک جا سکتے ہیں جہاں بار بار جا چکے ہیں۔ دراصل یہ لوگ جاتے کہیں بھی نہیں،

فقط اپنی ذات کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ گول گول گھومتے ہیں اور اس دائرے کی وسعت کل اتنی ہوتی ہے جتنا ایک روٹی کے دائرے کا رقبہ۔ یہ حال ہم سب کا ہے۔ ہم سب جو اپنی ذات کے دائرے میں گھومتے گھومتے، روٹی کھاتے کھاتے زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں۔ اب ہم وہ ریاکار بڈھے بن گئے ہیں جنھوں نے اپنے بچوں کے لیے کیا تو کچھ بھی نہیں، مگر اس کا اعتراف کرنے کی اخلاقی جرأت بھی نہیں رکھتے اور اب ہم نے بھوک سے بلبلاتے بچوں کو بہلانے کے لیے ہانڈی میں پتھر ڈال کر چولھے پہ چڑھا رکھے ہیں۔ گھر کی ساری روشنیاں گل کر دی ہیں۔ کبھی آگ میں پھونکیں مارتے ہیں، کبھی چمچہ چلانے لگتے ہیں۔ انھیں چپ کرانے کے لیے کبھی اس مزیدار کھانے کی خوشخبری سناتے ہیں جو بس پکنے ہی والا ہے اور کبھی گھر کے باہر کھڑے ہوتے "بھالو" سے ڈراتے ہیں جو رونے والے بچوں کو کھا جایا کرتا ہے۔ اس امید پر یہ سب کچھ کیے جا رہے ہیں کہ یہ بدتمیز بچے بھوک سے نڈھال ہو کر یا اس بڑھتی پھیلتی رات کے اندھیروں سے خوفزدہ ہو کر کبھی سو ہی جائیں گے، کبھی تو انھیں نیند آ ہی جائے گی، مگر لگتا یوں ہے کہ حالات اِن بچوں کے خلاف ہماری سازش کو پنپنے کی اجازت دینے والے نہیں۔ تاریخ کے دھارے پر ریاکاری کے بند باندھے ہی نہیں جا سکتے، اوّل تو یہ بھوکے بلبلاتے بچے سونے والے ہی نہیں۔ پھر اس ڈھلتی رات کے اندھیروں سے پرے جو سحر طلوع ہو رہی ہے۔ اس کی روشنی سے جرأت پا کر کوئی نہ کوئی بچہ پتھروں کی اس کھولتی ہانڈی کو اٹھا کر ہمارے سروں پر اُلٹ دے گا اور بند دروازوں کے پٹ دھڑ سے کھول کر دکھا دے گا کہ باہر کوئی بھالو نہیں کھڑا ہے۔ سارے بھالو گھر کے اندر ہی چھپے ہیں۔ ہاں ہمارے ساتھ یہی ہونے والا ہے۔ انجام کار یہی ہوگا ہم جو زندگی میں کوئی بھی نئی بات نہ لا سکے، زندگی کو ایک۔ قدم آگے بڑھانے کا حوصلہ نہ دے سکے۔ خود جامد و ساکت بیٹھے ساری دنیا کو جامد و ساکت فرض کرتے رہے اور اپنے فرسودہ افکار کی لاشوں کو ماضی کے چیتھڑوں کا کفن پہناتے رہے۔ کچھ

نعرے، کچھ دعوے، کچھ وعدے اس طرح بکھیرتے رہے جیسے سڑتی ہوئی لاشوں کا تعفن دُور کرنے کے لیے کافور اور لوبان چھڑکا جاتا ہے مگر تابہ کے؟ یہ مردہ افکار اور بے جان نظریوں کی حنوط شدہ لاشیں کب تک نئی نسل کی راہ روکے کھڑی رہیں گی؟ یہ کھیل تو اتنے دنوں کا ہے جب تک نئی نسل کی نگاہیں بے یقینی کے خلاؤں میں بھٹک رہی ہیں۔ جیسے ہی اپنی دھرتی کے وجود پہ نوجوانوں کا یقین بحال ہُوا وہ اپنے زور بازو سے اپنا گروی رکھا ہوا مستقبل چھڑالیں گے اور پھر ہمارا حشر کچھ ویسا ہی ہو گا جیسا چین کے افیون زدہ بڈھوں کا ہُوا تھا۔

مجھے لگتا ہے میری ان باتوں سے کچھ معزز نگاہوں میں خفگی جھلک آئی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ یہ ایسی دل آزار باتیں کرنے کا موقع تو نہیں۔ یہ تو ایک اچھے دَور کی یاد کا وقت ہے۔ یادش بخیر! آج سے چونتیس برس اُدھر وہ ایک بھری بہار تھی جب محلوں اور میناروں والے اس شہر کی فصیلوں کے سائے میں ایک بڑی بات ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا فیصلہ ہوا تھا۔ اس بوڑھے شہر کے سینے سے صدیوں کی مجبور خاموشی کا بھاری پتھر سرکا تھا۔ اپنی ساری زندگی میں شاید پہلی بار شہر لاہور اپنے بارے میں کیے جانے والے فیصلے میں خود شریک ہو رہا تھا مگر اس فیصلے میں اور بھی بہت سی بستیاں اور شہر شریک تھے۔ ڈھاکہ شہر نے بھی اپنا ایک نمائندہ یہیں بھیجا تھا۔ وہ کوئی بڑا ہی معتبر آدمی تھا کہ اس کی جیب میں لاکھوں کروڑوں بنگالیوں کی تمناؤں کا مختارنامہ پڑا تھا۔ ان سارے لوگوں کی تمناؤں کا بس ایک ہی نام تھا "پاکستان" وقت بھی کیسا شعبدہ باز ہے! یہ وہی لفظ ہے جو آج کسی دل پر لکھا چاہے رہ گیا ہو، مگر شہر ڈھاکہ کے در و دیوار سے مٹایا جا چکا ہے۔ یہ تیئیس مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ تھی کہ جب دو شہر ہزاروں میل دُور بسنے والے شہر ہزاروں برسوں سے اجنبیوں کی طرح رہنے والے شہر ایک مشترک مستقبل کے بندھن میں بندھ چکے تھے تیئیس مارچ ۱۹۴۰ء کو ڈھاکے اور لاہور میں طے ہونے والی یہ نسبت بڑی انوکھی نسبت تھی۔ ایک فیصلے کرتا رہا تو دوسرا قبولیت کی سندیں

دیتا رہا۔ آج جس بات کا قصہ ہم نے چھیڑا ہے، اس بات کا فیصلہ بھی در اصل ڈھاکے والوں نے کیا تھا۔ ایک قرارداد لکھ کر بھیجی تھی۔ لاہور والوں نے یہ قرارداد سنی اور خوشی خوشی قبولیت کی سند عطا کر دی اور آج جب ڈھاکے والوں نے اپنے ہی کیے ہُوئے فیصلے کو رد کر کے ایک دوسری قرارداد لکھی تو بھی لاہور نے بصد شوق نہ سہی، تائید و تسلیم کی مہر بہر طور لگا دی۔

فیصلے کرنا، رد کرنا، نئے فیصلے کرنا ڈھاکے کا مزاج ٹھہرا تو دوسروں کے کیے ہوئے فیصلے قبول کرنا، ہر اُبھرتی آواز کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا (خواہ وہ آواز گھوڑے کے ٹاپوں کی ہو یا کسی نعرے کی) لاہور کی عادت رہی۔ یہ مختلف مزاج اور متضاد عادتیں ان دونوں شہروں کو ان کے ماضی نے بخشی ہیں۔ اگرچہ دونوں کے ماضی بڑی حد تک نامہربان تھے۔ دونوں نے بہت بار ظلم کے سیاہ دَور دیکھے۔ مگر ظلم کے گُرز کی خوفناک ضربوں نے ڈھاکہ شہر کی اَنا کو توانائی اور اعتماد بخشا۔ خود نگری و خود شناسی عطا کی تو لاہور کے ضمیر کو لچک اور خود فراموشی کا کردار بخش دیا۔ در اصل ان دونوں بستیوں کا یہ کردار ان کے جغرافیے اور تاریخ کی مشترکہ دین ہے۔ یہ دونوں قدیم اور عظیم شہر اُس دنیا کی دو انتہاؤں پر پھیلے ہیں جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ یہ عجب انوکھی اور نرالی دنیا رہی کہ اس کے صوبوں میں جغرافیائی فاصلے اگر ہزاروں میلوں کے رہے تو تاریخی فاصلے بھی صدیوں سے کم کے نہیں تھے۔ بنگال کے ڈھاکہ اور پنجاب کے لاہور کے درمیان یہ دونوں فاصلے وسیع ترین رہے۔ ان دونوں کے ساتھ تاریخ کا دھارا مختلف زاویوں سے ٹکراتا رہا۔ شہر لاہور اس ملک کا دروازہ تھا۔ جس کی راجدھانی دلّی تھی۔ اس ملک اور اس راجدھانی کی کشش میں ایک دنیا کھنچی چلی آتی تھی۔ یہ آنے والے اکثر وسط ایشیا سے آتے تھے اور شمال مغرب کی پہاڑی فصیلوں کے ان سات دروازوں سے گزر کر آتے تھے جو اس پنج پانیوں والی زمین کی طرف کھلتے ہیں مگر یہ زمین ہر چند کہ بہت حسین تھی۔ آنے والوں کی فقط گزرگاہ تھی، جائے قیام نہ تھی۔ یہاں تاتاری، ترک، مغل، پٹھان، افغان اور ایرانی

جو بھی آتے آگے بڑھ جانے کے لیے آئے ۔ راوی چناب کی ٹمیاروں کو دیکھ کر شاید گنگا جمنا کے حسینوں کی کشش اور بھی بڑھ جاتی تھی کہ یہاں جو بھی آیا کسی پانی پی کر آگے بڑھ گیا۔ یا پھر شاید یہ بات تھی کہ گھوڑے اور تلوار کے ساتھ آنے والوں کے لیے پذیرائی کا پروانہ دلّی سے حاصل کرنا ضروری تھا اور ہندوستان کے گنگا جمنا کی وادی میں قدم جمانے ضروری تھے۔ بات کہنے کی یہ ہے کہ آنے اور جانے والوں کے قافلے لہر در لہر آئے۔ حملہ آوروں کے لشکر دندناتے گزرے مگر لاہور کا دامنِ دل دراز ہی رہا۔ اس کی جبینِ قبولیت پر کبھی کوئی شکن نہ اُبھری ۔ اُدھر ڈھاکہ گھر کی آخری کوٹھری کی طرح دوسری انتہا کا شہر۔ یہاں تک جو بھی پہنچا ساری منزلیں طے کر کے ہی پہنچا۔ یہاں تک آنے والے لوگ وہی تھے جنھیں اور آگے کہیں جانا نہیں تھا۔ بس یہیں کے ہو کے رہ جانا تھا۔ یوں بھی یہ ڈھاکے بنگالے کی جادو نگری تھی۔ یہاں سے آگے کوئی کہاں جاتا اور کیسے جاتا۔ پھر یہ بھی سنا ہے کہ پرانے وقتوں میں یہ دنیا ایک بھول بھلیاں تھی۔ یہاں داخل ہونے کے لیے گو بہت سے راستے مل جاتے تھے مگر واپس آنے کے لیے ایک بھی راستہ نہیں ملتا تھا نہ اس کی دوسری طرف کوئی دروازہ ہی کھلتا تھا۔ بنگال سے آگے نہ کوئی جائے پناہ تھی نہ راہ فرار جو بھی آیا یہیں کھو کر رہ گیا۔ پھر بنگال کی دھرتی، بنگال کے گیت، بنگال کی آنکھیں، بنگال کے پھول بنگال کی خوشبوئیں ایسی چیزیں تھیں جو دامنِ دل سے لپٹ جاتیں۔ جبھی تو نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ دلّی کی حکومت کے بھیجے ہوئے صوبہ دار مرکز کے ساتھ اپنے سیاسی بندھن توڑ کر بنگال کے جذباتی رشتوں میں جکڑے جاتے تھے۔ یہ اس دھرتی کی پناہ ہی تو تھی کہ جس کے نتیجے میں ایک صوبے دار کو اتنا اعتماد مل جاتا کہ وہ شہنشاہِ ہند کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کر دیتا۔ پیار سے ملاپ اور نفرت سے بغاوت، بنگال کا ازلی کردار ہے۔ بہت پرانے وقتوں میں بھی تھا اور آج بھی ہے۔

شمال مغرب کے انھیں دروں سے وہ قوم اتری جو آریہ کہلاتی تھی۔ اپنے لمبے قد اور گورے رنگ پر فخر کرنے کے علاوہ اپنی عقل اور ہوش پر بھی بھروسہ کرتی تھی۔ یہ

بڑے ہی چالاک لوگ رہے ہوں گے۔ یہ اپنی خشک ویران زمینوں کو چھوڑ کر اس شاداب زمینوں اور چوڑے دریاؤں والی دنیا پر فریفتہ تو ہوتے مگر اسی شد ومد سے یہاں کے پرانے باسیوں سے نفرت بھی کی۔ یہ نفرت ان کے کالے رنگ اور ناٹے قد سے نہیں تھی بلکہ اس زمین پہ ان کے حقِ ملکیت سے تھی۔ اس کا انتظام انھوں نے خوب کیا۔ اپنے قد اور ہتھیار کی برتری کے علاوہ نسلی برتری سے بھی کام لیا۔ ایک طرف تو مقامی باشندوں کو شکست دی۔ دوسری طرف اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد بتا کر ساری زمینوں پر اپنا حق ملکیت ازلی طور پہ قائم کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ برتری اور کمتری، غرور اور حقیر کی بنیادوں پہ ایک سماجی اور اخلاقی نظام کھڑا کر دیا۔ یہ بڑا ہی خوفناک نظام تھا۔ اس کی رُو سے مطیع ہونے والوں کے ساتھ غلام بنانے کی حد تک بھی رواداری نہیں تھی بلکہ ایسی دُوری تھی کہ بیچ میں نفرت اور حقارت کی اُونچی اونچی دیواروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ خدا کی پوتر اولاد نے یہ نظام سندھ سے لے کر گنگا تک رائج کر دیا مگر وہ لوگ جو ان خدائی حقوق والے لوگوں سے متنفر ہوئے، ان کی راہ میں مزاحم ہوتے اور وہ سب لوگ جنھیں اِن کی برتری گوارا نہیں تھی اور وہ سب لوگ جو نفرت کا نشان بن کر نہیں رہ سکے، بنگال کی پناہ میں چلے گئے یہ محکومی اور غلامی سے بچنے والے لوگ تھے۔ برہمن کی عیاری اور غرور سے نفرت کرنے والے انسان تھے۔ ذہن اور ضمیر کے ہیٹے نہیں تھے۔ محض ہتھیاروں کی برتری سے شکست کھائے ہوئے تھے۔ تاریخ لکھنے والوں نے فاتح قوم کے ریکارڈ دیکھ کر انھیں تہذیبی اور مجلسی سطح پر بھی کمترین لکھا۔ بالکل اِسی طرح جیسے اٹھارویں صدی عیسوی کے مہذب اور متمدن ہندوستان کو ایک اور گورے رنگ اور لمبے قد والی قوم نے بہتر ہتھیار استعمال کر کے شکست دے دی اور ہر قسم کی برتری کا پٹہ اپنے نام لکھوا لیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہزاروں برسوں کا عمل تھا۔ صدیوں کے بعد صدیاں اسی حالت میں گزری تھیں جس کے نتیجے میں پنجاب کے دل میں اپنی زمین پر

سے تنبارسے اٹھ گیا اور غیر خواہ غاصب ہی کیوں نہ ہر حال میں اس کی رواداری اور فیاضی کا حقدار ٹھہرا اُدھر بنگال کے لیے دمڑی ہی سب سے بڑی حقیقت بن گئی۔ یہی بات تھی کہ جس نے بنگال کے کردار میں خودنگری مرکز گریزی اور خود مختاری کی وہ روح جگا دی جسے تاریخ کے نادانوں نے بغاوت اور غداری کا نام دیا۔

پھر جب تاریخ نے اپنی گذرگاہیں بدلیں تو ہندوستان آنے والوں نے بھی اپنی راہیں تبدیل کر لیں۔ یہ ایشیا کے زوال اور یورپ کی مہم جوئی کا وقت تھا۔ گورے رنگ کی قومیں سارے مشرق پر یلغار کر رہی تھیں۔ سمندری راستوں پر فوقیت، تجارت کے پھیلاؤ، مشینوں کی ایجاد، خام مال کے حصول اور مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیوں کی تلاش اور اجارہ داری کے لیے ایک بڑا مقابلہ جاری تھا جس میں یورپ کی ساری قومیں شریک تھیں۔ اس مقابلہ بازی کے نتیجے میں علاقوں کی تقسیم، سیاسی تسلط اور لشکر کشی اور جنگ بازی کا گھمسان ہوا اور جیتنے والوں نے خوب خوب لوٹ مچائی۔ مشرق کی دولت سمیٹنے کے ساتھ ساتھ اس کے تہذیبی ناموس کی بھی دھجیاں بکھیری گئیں۔ یہ ایشیا میں نوآبادیاتی نظام کا آغاز تھا اور یورپ میں اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں اُٹھائی جا رہی تھیں۔ اِن بنیادوں کی استواری کے لیے یوں تو سارے ایشیا کو لوٹا گیا تھا مگر کارل مارکس اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ یورپ میں سرمایہ داری کی بنیاد میکسیکو کی چاندی اور افریقہ کے انسانوں کی تجارت کے علاوہ ہندوستان کی دولت پر استوار کی گئی۔ کارل مارکس کہتا ہے تو سچ ہی کہتا ہوگا۔ کیونکہ اٹھارویں صدی میں ہندوستان پر قبضہ کرنے والے غیر ملکی یہاں کی زمین کے لیے نہیں دولت کے لیے آئے۔ یہ مغربی دنیا کے لوگ تھے جو شمال مغرب کے پہاڑی دروں کی بجائے جنوب کے پانیوں سے نمودار ہوئے تھے۔ یہ لوگ پہلے آنے والوں سے قطعی مختلف تھے۔ کردار میں اور مقاصد میں۔ کردار شاید مقاصد سے متعین ہوتا ہے۔ شمال مغرب سے آنے والے لوٹ مار کرنے آتے تب بھی اُن کی غارت گری چند دنوں اور چند شہروں تک محدود رہتی۔ نہ سارے ملک میں پھیلتی نہ صدیوں تک جاری

رہتی۔ مگر وہ عجیب لوگ تھے کہ ملک فتح کرنے آتے اور حملہ آور بھی کہلائے مگر وُہ گھوڑوں اور تلواروں کے ساتھ ساتھ زبان، تہذیب اور شعر و ادب کی سوغاتیں بھی لاتے۔ وہ لڑتے ہوئے آتے مگر عوام کے مائی باپ بن جاتے اور زمینوں کا تحفظ کرتے مگر یہ نئے آنے والے وسط ایشیا کے گندم گوں لوگ نہیں یورپ کی گوری نسلیں تھیں۔ یہاں تاجر بن کر آئی تھیں۔ اپنے خالی جہازوں پر بندوقیں اور دوسرا اسلحہ لاد کر لائی تھیں۔ یہ انگلستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جس کے پاس بہت سے جہاز تھے۔ یہ جہاز جب ہندوستان آتے تو خالی آتے اور جب انگلستان جاتے تو بھرے ہوئے ہوتے۔ یہ ان کا پرانا دستور تھا۔ ایک صدی پہلے تک یہ سمندروں میں گھومتے رہتے اور آنے جانے والے جہازوں کو لوٹ کر دولت وطن لے جاتے۔ یہ سب لوگ ہندوستان کی ملکہ عالیہ کے پسندیدہ لوگ تھے۔ ملکہ الزبتھ اول اس لوٹ کی دولت سے عظیم انگلستان کی تعمیر کر رہی تھیں۔ تب ہندوستان میں اکبر اعظم حکومت کرتا تھا۔ وہ علم، امن، حکمت و ہنر کے موتی خزانوں میں بھر کر عظیم ہندوستان بنانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس کے سو برس بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز ہندوستان کے ساحلوں پر پہنچے تو بھی یہ جہاز خالی تھے۔ کہ دلی پہلے ہی لُٹ چکی تھی۔ یہ فرخ سیر کا زمانہ تھا۔ کارل مارکس کہتا ہے ان تاجروں کے پاس ہندوستان کے لائق کوئی چیز نہ تھی۔ ہندوستان بے انتہا دولت مند اور ہنر مند ملک تھا۔ صدیوں سے امن کے سائے میں پھل پھول رہا تھا۔ تغلقوں سے لے کر سوریوں اور مغلوں نے زرعی ترقی کے لئے کام کئے تھے۔ کسان خوش حال تھا۔ پیداوار بے حساب تھی اور اس وقت کا ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا۔ سو برس کی مطلق خوش حالی اور امن کے سائے میں تعمیر و تخلیق کے سارے خدا اسی زمین پر مصروفِ کار رہے تھے۔ تاج محل تعمیر ہو چکا تھا۔ دلّی کی شاہ نشینوں میں اردوئے معلیٰ اور لکھنؤ کی گلیوں میں ٹکسالی بولی جا رہی تھی۔ مرزا نوشہ غزل سرا ہو چکے تھے اور روس کی ملکہ ماچس کی ڈبیہ کھول کر ڈھاکے کی ململ کا تھان نکال رہی تھی، کہ ہندوستان پر تاجروں کی قوم نے قبضہ کر لیا۔ اب کی بار حملہ آوروں کی راہ

میں ڈھاکہ پہلے آیا تھا۔ لاہور تک یہ سو برس بعد پہنچے۔ دلی پہنچنے کی انھیں کوئی جلدی نہ تھی کہ بڑا مال غنیمت ڈھاکے کا ہنر اور بنگالے کی دولت تھی۔

پنجاب میں تاریخ کے جھکڑ تھم چکے تھے۔ بنگال کی دنیا دگرگوں تھی۔ نئے حاکموں کے نام کلائیو اور کارنوالس تھے، یہ دن ہر کیساتھ نئے نئے علاقے ہتھیا رہے تھے۔ دولت سمیٹ کر وطن بھیج رہے تھے، خود اپنی ذاتی دولت جمع کر رہے تھے۔ بس یہی ان کا مقصد تھا۔ یہ لوگ ظہیر الدین بابر اور شہاب الدین غوری کی طرح اس چکر میں نہیں تھے کہ یہاں بیٹھ کر تاریخ سازی کریں گے۔ خاندانوں کی بنیاد ڈالیں گے اور پھر ان کے جانشین اپنے خون جگر میں ہندوستان کی مٹی گوندھ گوندھ کر کہیں قطب مینار کھڑا کریں گے! کہیں تاج محل بنائیں گے! ہاں مگر ان لوگوں نے بھی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کیا ضرور۔ کارنوالس نے بندوبست استمراری اور وارن ہسٹنگز نے دوامی رائج کر کے اناج اگانے والے کو بھوک کاٹنے کی طرح ڈالی۔ ہنرمندوں کے ہاتھ کٹوائے۔ کسانوں کی زمین چھینی سیٹھوں کے ہاتھ بیچی۔ بھوک افلاس پیدا کیے۔ قحط ڈلوائے۔ لوگوں کو آپس میں لڑوایا۔ ہندو کو مسلمان سے، مسلمان کو ہندو سے نفرت دلوائی۔ تعصب پیدا کیا۔ پھوٹ ڈلوائی اور حکومت کی۔ وہ ہندوستان جس کے چپے چپے پر خزانے تھے، جو سونے چاندی سے مہنگے مقبرے بناتا تھا۔ جس کے مندروں اور مسجدوں میں ہیرے جواہرات جڑے جاتے تھے۔ ان نئے حاکموں کے وقت میں کنگال ہو گیا۔ زرخیز اور ہنرمند بنگال جس نے ساری دنیا کو رزق اور لباس مہیا کیے، ننگا بھوکا پھرنے لگا۔ اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا صنعتی شہر ڈھاکہ اُجاڑ کر ایک دیہات بنا دیا گیا۔ ان گورے صاحبوں نے تجارت بھی کی۔ ڈھاکے کا ریشم کھدر کے بھاؤ خریدا اور لنکا شائر کا کھدر یہاں لا کر ریشم سے مہنگا بیچا۔ سب کچھ یہاں جبر کے ساتھ کیا گیا اور بنگال کے ساتھ خاص طور پر روا رکھا گیا اس لیے کہ یہ ڈاکو لٹیرے تاجر اور غاصب استحصالی حاکم چالاک بھی بہت تھے۔ انھوں نے بنگال کی پیشانی پر نفرت کی شکن دیکھی۔ ڈھاکے کی

خود اعتمادی اور مدافعت کا حوصلہ پہچانا تو اس کا علاج ضروری سمجھا۔ یہ علاج ظلم تھا۔ دولت لوٹی، رزق چھینا، صنعت برباد کی، بستیاں اُجاڑ ڈالیں۔ مگر کیا ہُوا؟ بنگال کی روح کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں احتجاج کی چنگاریاں اور زیادہ جاگ اُٹھیں۔ ظلم اور جبر سے کون کسی کو جیت سکتا ہے؟ کم از کم بنگال کو نہیں اور یہی ہوا۔ بنگال نے دکھ جھیل لیے مگر ظلم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بنگال نے ملکی اور غیر ملکی تسلط کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ کل اور نہ آج!

پنجاب نے ہمیشہ کی طرح گورے آقا کو قبولیت کی سند بخشی۔ ۱۸۵۷ء کے سال جب سارے ہندوستان میں گورے آقاؤں کے لیے زمین تنگ ہوئی یہ پنجاب ہی میں تھا کہ جان لارنس یہاں بادشاہوں کی طرح حکومت کر رہا تھا اور پورے اعتماد کے ساتھ وفاداروں کی بھرتی لے کر اپنی قوم کی مدد کے لیے بھیج رہا تھا۔ اس وفا کا صلہ بھی صاحب بہادر نے خوب دیا۔ یہاں کی زمینوں کو آباد کیا، جوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنے کا اعزاز بخشا۔ انھیں بڑے بڑے عہدوں پر ترقیاں دیں اور پھر نوے برس تک پنجاب کی رگوں کا گرم اور جوان خون برطانوی شیر کی مقوی غذا میں شامل رہا۔ سلطنت برطانیہ کی حفاظت کے لیے پنجاب نے کیا کچھ نہیں کیا، عالمی جنگوں میں کہاں کہاں نہیں لڑا۔ یورپ کے میدانوں میں ایشیا کے جنگلوں میں اور افریقہ کے صحراؤں میں، ۱۸۵۷ء میں جب سارے ہندوستان نے غلامی کے خلاف بندوق اٹھائی تو بنگال سب سے آگے تھا اور پنجاب انگریز کی پشت پر کھڑا اس کی مدافعت کر رہا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جب سارے ہندوستان نے آزادی کے لیے علم اُٹھایا تو بنگال بھی آگے آگے تھا اور پنجاب سلطنت برطانیہ کے تحفظ کے لیے لڑ رہا تھا، یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے محاذوں پر ایسے ہی وقتوں سے بنگال کو غدار اور پنجاب کو وفادار کہنے کی رسم چلی۔ یہ ٹائیٹل صاحب بہادر ہی نے عطا کیے مگر یہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔

آج جبکہ تاریخ ایک موڑ کاٹ چکی ہے لاہور اور ڈھاکہ کے درمیان جغرافیائی

فاصلوں سے ہزاروں گنا تاریخی فاصلے پیدا ہو چکے ہیں۔ محبت کے بند ٹوٹ چکے ہیں بلکہ اب تو نفرت کی دیواریں جو پچیس برسوں میں اُونچی اٹھ گئی تھیں۔ دھیرے دھیرے بیٹھتی جا رہی ہیں جب کوئی تعلق ہی نہ رہے تو نفرت کیسی؟ چند دنوں کے بعد دونوں کے درمیان کچھ نہیں رہے گا سوائے ایک مہیب خلا کے جس میں کالے بھورے اور روشن ذرے تیرتے رہیں گے۔ اس بدلے ہوئے حالات میں مَیں پنجاب کے نئے خطاب کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ "ظالم پنجاب"! یہ خطاب اسے اپنے پرایوں نے مل کر بخشا ہے۔ ہزاروں برسوں سے ظلم کی چکی میں پِسا ہُوا حملہ آوروں کی ٹھوکروں میں پڑا ہوا پنجاب اب ظالم و جابر کہلانے لگا ہیں اس وقت جب خود اس کے روئیں روئیں سے خون رس رہا تھا۔ انگ انگ سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں، وہ بنگال کا قاتل کہلایا۔ وطن کی کل بربادی اس کے نام لکھی گئی۔ دنیا کی لاکھوں آوازوں نے پکار پکار کر کہا۔ بنگال کا قتل ہُوا جو پنجابی نے کیا! بنگال کا استحصال ہُوا وہ بھی پنجابی نے کیا! بنگال کو پچیس برس تک کالونی بنا کر رکھا گیا اور اسے آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہونے دیا گیا یہ سب بھی پنجابی نے کیا! یہ آوازیں اب کچھ تھم گئی ہیں مگر تاریخ کا حصّہ بن گئی ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی مگر تاریخ میں لکھی باتوں کو لوگ اکثر دہراتے رہیں گے۔ پنجاب نے چپ سادھ رکھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ یہ اس کے مجرم ہونے کا ثبوت ہے۔ دنیا ہر بات کا جواز پیدا کر لیتی ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں پنجاب کی زبان کے نیچے جو پیدائشی تندوا ہے اس کا علاج کیسے ہو گا۔ اس گونگے بچے کو بولنا کون سکھائے گا؟ یوں بھی یہ یتیم بچّہ ہے اس کی بہت سی سوتیلی مائیں ہیں جو زہر ہلاہل کو قند کہہ کر اسے چٹاتی رہتی ہیں۔

اس دھرتی کی مٹی سے دانے اُگانے والوں کی بیٹی کے ناطے کئی بار میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے کہ کسی طرح بن پڑے تو دنیا کے چوراہے پر جا کھڑی ہوں اور پھر دنیا کو بتاؤں! ــ سنو لوگو! پنجاب ظالم نہیں مظلوم ہے، جابر نہیں

مجبور ہے، قاتل نہیں مقتول ہے۔ تم ذرا پنجاب کو پہچانو تو سہی، پنجاب جرنیلوں کے کسی ٹولے کا نام نہیں، پنجاب وہ سوٹڈ بوٹڈ سی ایس پی نہیں، جو قالینوں والے ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر قوم کے لیے ترقیاتی منصوبوں کی پلاننگ کرتا ہے۔ اس اکڑی ہوئی گردن والے افسر کو پنجاب نہ سمجھو۔ یہ مصاحب صورت اخبار نویس اور سیٹھوں جیسی طمانیت رکھنے والا شاعر بھی پنجاب سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ پنجاب جاگیرداروں کے جتھے کا نام بھی نہیں ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں اور سچ کہتی ہوں کہ لمبی کالی مرسڈیز کی نرم نرم گدیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ان عوامی وزیروں کے چہرے دیکھو جن پر خوشحالی لکھی ہے۔ ان کی چال میں نخوت ہے جو مصنوعی انکساری سے چھپائے نہیں چھپتی۔ وہ یوں باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی اداکار مکالمے بولتا ہے۔ ان کی آوازیں ٹھنڈی بے حس ریاکاری سے بوجھل ہیں۔ یہ سب پنجاب کو نہیں پہچانتے۔ ان کا پنجاب تو بس گلبرگ اور جی او آر ون کے درمیان بستا ہے اور ان کا تخیل پائیں باغ میں کھلے ہوئے شاداب پھولوں کو دیکھ کر سوہنی دھرتی گنگناتے چین کی نیند سو جاتا ہے۔ یہ دنیا کو کیسے سمجھا سکتے ہیں کہ پنجاب تو ایک دہقان کا نام ہے جو زمین سے دانے اُگاتا ہے جو جیٹھ ہاڑ کی دھوپ اور پوہ ماگھ کی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے دن رات کھڑا رہتا ہے۔ جو کھیت میں ہل چلا کر بیج بوتا ہے پانی دیتا ہے مگر کچھ آمیزش اپنے خون کی بھی کرتا ہے۔ اس کی پکی نشانیاں سنو۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی کی گہری پرچھائیاں ہیں۔ اس کے چہرے پہ تھکن ہے۔ اس کی چادر میلی ہے، اس کے پاؤں دُھول میں اَٹے ہیں۔ ہزاروں سال سے اس کی روح میں دُکھوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ وہ اناج اگاتا ہے مگر اس کے گھر میں بھوک بھری ہے۔ محنت کرتا ہے مگر عظمت نہیں ذلت سہتا ہے۔ دولت پیدا کرتا ہے مگر خود اس کے مقدر میں مفلسی لکھی ہے۔ اس کی کمائی ہوئی دولت سے دوسروں کے گھر روشن کرنے کے لیے واپڈا ہاؤس بنتے ہیں مگر اس کی اپنی کٹیا اندھیری پڑی رہتی ہے۔ یہ اُسی کی

دولت ہے جس سے عشرت کدے سجانے کے لیے ولایتی آسائشوں سے لدے ہوئے جہاز چلے آتے ہیں اور بیرونِ ملک پاکستانی سفیر اپنے ساتھ کلچر کے قافلے لے کر چلتے ہیں مگر اس کسان کے گھر کی کل کائنات مٹی کی ہانڈی اور اُپلوں کا چولہا ہے۔ بیگمات کے جواہرات مت دیکھو۔ پنجاب کی ماں کے ہاتھ تو گوبر میں سنے ہیں۔ گلبرگ کی کوٹھیوں میں ریشم و کمخواب کی سرسراہٹ نہ سنو، پنجاب کی بیٹی کے سر کی چادر تو خاشے کی ہے جس میں کئی کئی پیوند لگے ہیں۔

مَیں پتھروں کو تراشنے کا فن جانتی تو پنجاب کا ایک مجسمہ بناتی۔ یا رنگوں سے نقش اُبھارنے کے فن سے واقف ہوتی تو اپنے دیس کی تصویر بناتی۔ اس تصویر کے خدوخال یہ ہوتے۔ ایک جوان آدمی ہے مگر گونگا ہے، اس کا چہرہ بے داغ ہے مگر تانبے کے رنگ کا ہے۔ اس کے تن پر گاڑھے کا میلا ڈھیلا کرتا ہے جو اس کی پیٹھ پر پسینے سے چپکا ہے۔ اس کے بازو توانا ہیں مگر ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہیں۔ یہ آدمی مستقبل کی طرف پیٹھ کیے کھڑا ہے اور چپ چاپ ماضی کے خلاؤں میں تکتا رہتا ہے۔ پھر میں اس تصویر کو دنیا کی آرٹ گیلریوں میں آویزاں کرتی اور سارے یورپ اور امریکہ کے نقادوں کو جمع کر کے پوچھتی — بولو، کیا تم اس تصویر پر "ظالم" کا عنوان لگا سکتے ہو؟

بات نکلی تو کہاں تک جا پہنچی۔ ۲۳ مارچ کی بات کو ہم پھر سے اِس طرح شروع کرتے ہیں کہ آج سے کئی برس پہلے بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے لوگوں نے شہر لاہور میں جمع ہو کر ایک فیصلہ کیا اور پھر سات برس کی کاوش سے اس فیصلے کی مجسم شکل پیدا کر لی، ایک ملک حاصل کر لیا، ایک بڑا سا ملک، مشرق و مغرب میں جس کے دو شہپر پھیلے تھے۔ بحث طلب سوال یہ نہیں کہ یہ ملک کیوں بنایا گیا۔ بنگال، پنجاب، سندھ سرحد اور بلوچستان کو پاکستان کا نام کیوں دیا گیا؟ بحث طلب باتیں تو وہ ہیں جو مُلک بن جانے کے بعد وجود میں آئیں۔ ان لوگوں نے یہ ملک یقیناً لوگوں کے لیے بنایا تھا۔ لوگوں کے سکھ چین کے لیے امن و انصاف

کے یئے. ظلم سے نجات کے لیے ۔ اُن سب کے لیے جو آئندہ اس ملک میں پیدا ہونے والے تھے ۔ مگر یہ سادہ و رنگین داستان تو ان کی ہے جو اب موجود نہیں ہیں. ہر سال ۲۳ مارچ کو ہم یہ داستان چھیڑتے ہیں اور اس سوال پر ختم کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا؟ یہ سوال ان لوگوں کے ذہن سے چپکا رہ جاتا ہے جو جرأت نہیں رکھتے اور ان لوگوں کی زبان پر آجاتا ہے جو بات کہنے کی مجال رکھتے ہیں. مگر ان لوگوں کی داستان کوئی نہیں چھیڑتا جو زندہ ہیں اور جانشین کہلاتے ہیں ... وہ داستان جو شب ہجراں کی طرح لمبی بھی ہے اور کالی بھی ۔ گمبھیر بھی ہے اور دلگیر بھی اس میں تو ایک نقطہ بھی روشن نہیں ۔ یہ تو ساری کی ساری سیاہ، کالی ہے ۔ البتہ اس کے بیچوں بیچ سُرخ رنگ کی ایک لکیر چلتی ہے ۔ یہ انسانوں کا خون ہے جو ستائیس برس سے یہاں مسلسل بہہ رہا ہے ۔

بہرکیف ۔ پاکستان بنانے والوں کے جانشینوں کا حساب کتاب جو تاریخ کے کھاتے میں پڑا ہے اس کی رُو سے ان لوگوں نے کئی جنگیں لڑیں، ملک بچانے کے لیے یا بڑھانے کے لیے، یہ ابھی تک اختلافی مسئلہ ہے) کئی ایک معاہدے کیے ہتھیار نہ اُٹھانے کے ۔ چونکہ عہدناموں میں یہ وضاحت نہیں ہے، آیا وہ مدافعت کے ہتھیار ہیں یا جارحیت کے ۔ جن کے نہ اُٹھانے کی قسم ہم نے کھائی ہے ۔ اس لیے شدید اختلاف رائے خود آپس میں ہوا اور اس طرح سے ہر دو قسم کے ہتھیاروں سے کئی جنگیں آپس میں اندرون ملک لڑی گئیں ۔ مگر ان کے اختتام پر کوئی معاہدہ امن نہیں لکھا گیا ۔ تعمیری کاموں کے سلسلے میں بہت سی کوٹھیوں محلوں اور بنکوں کے علاوہ بائیس خاندانوں کی تعمیر کا ذکر موٹی سرخی کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ آرٹ اور کلچر کی ترقی کے جو مراحل طے ہوتے ان میں سب سے زیادہ تجربے ملبوسات اور سنگھار کی جدت طرازی پر کیے گئے ۔ کئی قسم کی جمہوریت کے تجربے کیے گئے ۔ کئی طرح کی اصلاحات کے دور چلائے گئے ۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک آزاد پالیسیاں اپنائی گئیں ۔ عالمی برادری کے بڑوں کے ساتھ تعلقات کی وضاحت فرینڈز ناٹ ماسٹرز

لکھ کر کی گئی پھر آگے چل کر سوشلزم اور سائنسی سوشلزم کی بات بھی چلائی گئی - اگرچہ ان ساری باتوں کے سلسلے کے ساتھ اختلاف رائے کی دم برابر لٹکتی نظر آرہی ہے۔ کچھ لوگ ان تجربوں پر ناکام تجربوں ان پالیسیوں پر بانجھ پالیسیوں کا الزام لگاتے رہے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے جمہوریت کی ہر شکل کو آمریت کا بدلا ہوا بھیس کہا ہے۔ یہ لوگ ضرور اقبال کو پڑھتے رہے ہوں گے۔ کئی ایک نے ہر دَور کے رفاہِ عامہ کے کارناموں کو مفاد مخصوصہ کے کھاتے میں ڈالا - یہ غالباً کارل مارکس کی شاگردی کرنے والے لوگ ہیں - اسی قسم کے کچھ اور لوگوں نے ملک کی آزاد خارجہ پالیسی میں سامراجی طاقتوں کی حاشیہ برداری کا سراغ لگایا۔ اسی طرح قومی معیشت پر نوآبادیاتی انداز میں عالمی طاقتوں کی گماشتہ گیری کرنے کا الزام رکھا۔ کچھ لوگ ان سے بھی دو ہاتھ آگے گئے۔ اُنھوں نے سوشل ازم کا نام سُن کر فتوٰی دے ڈالا کہ پاکستان میں سوشل ازم یا سائنٹفک سوشل ازم کا تجربہ ایسا ہی ہے جیسے گملے میں گندم اُگانا یا خلا میں مکان تعمیر کرنا - اس لیے کہ زمین پر تو ابھی تک نیم نوآبادیاتی اور فیوڈل سماج کی دلدلیں پھیلی پڑی ہیں - یہ ساری باتیں کہنے والے لوگ مفسد تھے یا مخلص، حاسد تھے یا ہمدرد؟ یہ سوال بھی تاریخ کے حاشیے میں اور باتوں کے ساتھ لکھا رکھا ہے۔ تاہم ان لوگوں نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔

اور ہاں جانشینوں نے اگلوں کی کارگزاریوں پر کچھ ترمیمیں بھی کیں۔ مثلاً ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے بموجب مملکت خداداد کچھ بڑی بن گئی تھی - اس کی مناسب قطع وبرید کی گئی - پرانے لوگوں کو یوں بھی بڑی بڑی چیزیں بنانے کی عادت سی تھی - حالات بھی ان کے لیے سازگار رہے - جدید دور میں بڑی بڑی چیزوں کو سنبھالنا یعنی MAINTAIN کرنا کتنا مشکل ہے - اسی بنا پر تو ہم نے ایک طویل اور اجتماعی کاوش کے بعد اُس بڑی سی مملکت کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹا کیا ہے - شاعرِ مشرق، قائداعظم اور شیر بنگال کے پاس تو کوئی جناتی فوج ہوگی جو اتنے بڑے بڑے کام کر گزرے - جانشینوں سے تو یہ ٹکڑے بھی نہیں سنبھلتے، کسی طور انھیں اور چھوٹا کر لیا جائے تو شاید سنبھالنا آسان ہو جائے۔

پاکستان بنانے والوں کے جانشینوں کا ایک اور کارنامہ بھی ہے جسے کسی صورت

میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہے قرار داد کی یاد میں ایک مینار کی تعمیر۔ مینار پاکستان کو شروع شروع میں یادگارِ پاکستان کہا جاتا رہا بعد میں جب کچھ لوگوں کو یادگار کے لفظ میں بدشگونی کی جھلک دکھائی دی تو سرکاری سطح پر نام کی درستی عمل میں لائی گئی۔ یہ مینار بہت اچھا ہے۔ مگر نکتہ چینی کی عادت رکھنے والے پھر بھی یہ کہنے سے باز نہیں رہے کہ قرار داد بہت بڑی تھی جب کہ مینار بہت چھوٹا ہے۔ یہ فرق تو ہونا بھی چاہیے تھا کہ نئے اور پرانے وقتوں کا فرق اور پھر جب مینار تعمیر ہوا تو وہ ڈپٹی کمشنروں، کمشنروں، ہوم سیکرٹریوں کے وسیع اختیارات کا دور تھا جب اختیارات بڑے ہوں تو باقی سب کچھ چھوٹا ہی ہوتا ہے تعمیر و تخلیق جو کچھ بھی ہو پستہ قامت ہی ہوتی ہے۔ ویسے اس تعمیر سے پہلے اہتمام کی تفصیل سن لیں تو شاید تاج محل بنانے والے بھی خفت محسوس کرنے لگیں۔

ہم نے جو سنا اور نہایت معتبر ذرائع سے سنا وہ یہ ہے کہ مینار مذکور کی تعمیر سے پہلے لاہور کے ڈپٹی کمشنر صاحب جو مینار کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ ساری دنیا کے دورے پر نکلے تھے۔ مغرب تا مشرق گھوم پھر کر انھوں نے تمام قدیم و جدید، کبیر و صغیر مینار دیکھے تب کہیں جا کر ان کے تخیل میں مینار پاکستان کی تخلیق کا نقشِ جمیل اُبھرا۔ اس سلسلہ میں چیئرمین صاحب کی زحمت کو قومی خدمت کے کھاتے میں ڈال دیا جائے تب بھی اصل تعمیر سے کچھ زیادہ رقم بطور سفر خرچ اُٹھ گئی ہوگی۔ خرچ کی رقم کے ہندسے پڑھ کر کچھ ناپختہ کار قسم کے نکتہ چینیوں نے یہ بحث بھی چھیڑنے کی کوشش کی کہ آخر چیئرمین صاحب کو دنیا کے ان خطوں میں جانے کی ضرورت کیوں پڑی جہاں کبھی کوئی مینار تعمیر نہیں کیے گئے۔ مگر بعد میں داناؤں کے سمجھانے پر سمجھے کہ اوّل تو حسن فقط میناروں تک محدود نہیں، دوسرے مینارِ پاکستان کی تاریخ میں آگے چل کر ساری دنیا کا نام آنے والا تھا۔ اس لیے ساری دنیا کی خاک چھاننا چیئرمین مینار کمیٹی کے لیے ضروری تھا۔

بہرحال اس مینار کو تعمیر کرنے والوں کا کمال خصوصی یہ ہے کہ انھوں نے قد و قامت سے لیکر شکل و شباہت تک کہیں بھی ماضی کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ بعض لوگ تو اس معاملے میں اس حد تک غلو کرتے ہیں کہ صنعتی دور کی یہ تعمیر جمیل محلوں اور ماڑیوں کے جلو میں

دور سے کسی کارخانے کی چمنی سی معلوم پڑتی ہے۔ مشکل ساری یہی ہے کہ ہم بلیے پھلے لوگوں کا ماضی ہمیشہ بھاری بھرکم رہا۔ حد یہ ہے کہ غلامی کے دور کے اسلاف بھی بڑے قدآور رہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد منظور کرنے والوں نے تو موقع محل بھی خوب ہی چنا۔ راوی جیسی البڑ حسینہ کے سانسوں کی مہک اور سیمیں آنچلوں کی سرسراہٹ سے بھرپور فضا میں ایک طرف عالمگیری گنبدوں کا شکوہ۔ دوسری طرف جہانگیری میناروں کا جمال، تیسری سمت قلعہ کی فصیلیں اور شیش محل کی بلندیاں اور چوتھی طرف خود شہر لاہور کی اُبھرتی روشنیاں اور ڈوبتے اندھیرے۔ ایسے حالات میں قوم کی عقل کل سی ایس پی اور ان کے آقا شعبدہ دکھا سکتے تھے تو یہی ناکہ زمین پر چاند تارے کا نشان (یعنی قومی نشان) بنا کر اس کے بیچوں بیچ ایک چمنی نما مینار اُٹھا دیا جائے تاکہ یہ قومی نشان بھی رہے اور صنعتی علامت بھی۔ یہ سب کچھ تو ظاہر ہے بہت سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی سے ہُوا ہوگا مگر ایک بات ہے جو ذرا عجلت میں ہوئی لگتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مینار کے پہلو میں قرارداد کی عبارت لکھتے وقت ایک دو الفاظ کے ہجے غلط ہو گئے ہیں۔ اسی کوتاہی میں چیئرمین کا دوش نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں کا سی ایس پی اول تو عقل کل اور غلطی سے ماورا ہوتا ہے اور پھر فن تعمیر کے اسرار و رموز سے زیادہ واقف چاہے نہ ہو، انگریزی زبان میں اسکی صلاحیتیں ہمیشہ شک و شبے سے بالاتر رہی ہیں ہو نہ ہو یہ چوک کسی کاتب بردار کی ہے۔ آخر سرکار عالی مقام کے احکام کو الفاظ کا جامہ تو کلرک ہی پہناتا ہے۔ بہرحال وہ لفظ غلط ہجوں کے ساتھ آج تک مینار کے پہلو میں کھدے ہُوتے ہیں۔ جنھیں پڑھ کر ایک اور خطرناک خیال ذہن میں کلبلاتا ہے۔ ہجے غلط لکھنے والوں سے کیا بعید کہ انھوں نے عبارت بھی غلط لکھی ہو۔ ہجے کی تصحیح کے لیے لغت موجود ہے مگر قرارداد کی عبارت؟ اصل مسودہ گم ہو چکا ہے۔ قائداعظم موجود نہیں ہیں، فضل الحق وفات پا چکے ہیں۔ یہ کیسی قوم ہے جو اپنی پیدائش کی دستاویز بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکتی؟ اتنی بڑی تاریخی عمارت پر اتنی بڑی تاریخی عبارت کو درست ہجوں کے ساتھ نہیں لکھ سکتی؟ مگر قوم کتنی مصروف ہے، اس کا حال کب کسی نے پوچھا ہے۔ صدیوں کی غلام قوم اچانک آزادی پاکر حسرتِ تعمیر کا مداوا کرنے لگی ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو اپنے محل تعمیر کرنے میں لگے ہیں۔ ان سے کئی گنا زیادہ لوگ ان محلوں کی اینٹیں ڈھونڈنے میں جُتتے ہیں۔ کئی لوگوں نے

مال کے بدلے مال کا کاروبار صرف اس لیے سنبھال رکھا ہے کہ قوم کا معیار زندگی بلند کریں آٹے دال جیسی معمولی چیزوں کے بدلے ریکارڈ پلیر اور فلیٹ کریب حاصل کر کے قوم کو کلچرڈ بنائیں بہت سارے لوگ لیڈروں کے جلسے کروانے کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ کتنے اور ہیں جنھیں ان جلسوں کو نا کام بنانے کی مہم سر کرنی پڑتی ہے۔ شہر والوں کی خاصی تعداد ہر روز بس اسٹاپوں پر سر جھکائے چپ چاپ کھڑی گھنٹوں تک انتظار کا فرض انجام دیا کرتی ہے (کہ بقول ملٹن انتظار کرنا بھی فرض ادا کرنا ہے) انہی شہریوں میں ایک خاص تعداد ان جوانوں کی ہے جو انتظار میں تڑپانے والی مجبوبہ صفت بسوں کو موقع پاتے ہی آگ لگا دیا کرتے ہیں۔ (کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری) یوں شہریوں کی اکثریت کھجور مارکہ سے لیکر چاند مارکہ تک کے بناسپتی کی تلاش میں صبح سے شام کرتی ہے۔ مٹی کے تیل کی لائنوں میں گھنٹوں لگے رہنا اور پھر خالی ڈبہ بجاتے گھر لوٹ جانا، ایک اور فرض ہے جس کی ادائگی کتنے سارے لوگ ہر روز کرتے ہیں۔ قوم کو اس کی بے پناہ مصروفیت کے ساتھ چھوڑ کر اور چھوٹی موٹی بھول چوک کو معاف کر کے ہم مینار کی بات یوں ختم کرتے ہیں کہ ڈپٹی کمشنر اور جرنیل صاحب نے آزادی کا مینار بنا کر بہت اچھا کام کیا۔ یہی تو ایک چیز ہے جس کے ذریعے سے عوام آزادی کا ادراک اپنے حواس خمسہ میں سے دو تین کی مدد سے کر سکتے ہیں اسے آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، ہاتھوں سے چھو سکتے ہیں اور اگر پتھر کی کوئی خوشبو ہوتی ہے تو اپنی قوت شامہ کو بھی آزما سکتے ہیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ ورنہ تو آزادی کے پیڑ پر جتنے پھل لگے وہ عوام کے لیے ممنوع قرار پاتے۔ حسینہ آزادی کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ یہ کھوجتے ہوئے لوگ قرارداد والے شہر کی طرف آنکلتے ہیں تو سیدھے مینار کے قدموں میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ چاند تارے کے پتھریلے کناروں پر اپنے دھڑکتے دل ٹکا کر اوپر نگاہ اٹھاتے ہیں تو انھیں مینار کے باطن سے گذرتا ہوا ایک طویل خلا دکھائی دیتا ہے۔ طویل خلا۔۔۔!

میں نے کئی بار سوچا ہے کہ یہ مینار آزادی کی علامت ہے۔ اس کی بنیاد میں پھیلا ہوا چاند تارا قومی پرچم کا نشان ہے، مگر مینار کے اندر کا یہ خلا؟ یہ شاید ہماری روحوں کے اندر پھیلے ہوئے خلاؤں کا سمبل ہے۔

---

۲۳ مارچ ۱۹۷۵ء

دوسری برسی

یہ عنوان کیوں؟ آپ یقیناً پوچھنا چاہیں گے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ پچیسویں برسی ہے اور قائدِ اعظم کی برسی ہے۔ آپ کا سوال معقول سہی مگر لوگ اتنے معقول نہیں کہ ہم ان کی ہر بات یہ سوچ کر تسلیم کر لیں کہ 'لوگ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے'، اس لیے کہ میں نے تو ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ جو کہتے ہیں نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں نہیں کہتے۔

ہوا یوں کہ حمید بھائی نے گیارہ ستمبر کو مجھے روٹری کلب کی نشست میں قائد کی وفات پر کچھ کہنے کے لیے بلوایا تو میں یہ سوچ کر چلی آئی کہ اُس گم گشتہ نسل کے بارے میں بات کروں گی جس نے دو سال پہلے قائد سے ناطہ توڑا تھا، یہ نسل ان لوگوں کی تھی جنہیں جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔ دھوکہ دہی کا عارضہ اور خود فریبی کا مرض لاحق ہوا تھا۔ یہ لوگ ہر چند کہ آج مر چکے ہیں مگر خود فریبی کی عادت سے مجبور سمجھتے ہیں کہ زندہ ہیں۔

مَیں قائدِ اعظم اور موت کے تصوّر کو کسی صورت بھی یکجا نہیں کر سکتی۔ میری منطق یہ ہے کہ محمد علی جناح ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کا نام مرنے والوں کی فہرست میں لکھا جاتا ہے۔ مر جانے والے اَن گنت لوگوں کی وہ طویل فہرست جس میں ہم آپ بھی جگہ پائیں گے جو ہر لحظہ بے نام ماضی کی طرف سرکتی اور آخر گمنامی کے اندھیروں میں کھو جاتی ہے۔ قائدِ اعظم کا نام تو اس چھوٹی سی فہرست کی زینت بنا ہے جو ابد کی پیشانی پر ٹنگی سدا جگمگاتی ہے۔ ایسے انسانوں کی تقویم ہی کچھ اور ہے۔ اِن کے زمانے عجیب ہوتے

ہیں۔ ان میں ماضی حال و مستقبل کی حد بندیاں نہیں ہوتیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی وساطت سے گزرے اور آنے والے زمانے کے لوگ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہیں کہ جنھوں نے ماضی و حال کے اندھیروں میں شمعیں جلائیں اور پھر اپنی شب بیدار آنکھوں سے مستقبل کی سحر کو بے نقاب دیکھا، مگر بعض ایسے بھی ہوتے جنھوں نے نئے زمانے پیدا کیے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ضمیر کُن فکاں کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے نئی دنیائیں بناتے ہیں۔ نئے صُبح و شام خلق کرتے ہیں۔ موت کو شکست دے کر زندگی کے سفر پر نکلتے ہیں اور حیاتِ جاوداں کے رازداں بن جاتے ہیں۔ دہر میں یہ لوگ بہت کم تعداد میں آتے مگر جب بھی آتے زندگی پر، انسان پر انھوں نے بڑے بڑے احسان کیے۔ ان میں کچھ نام ان لوگوں کے ہیں۔ جنھوں نے کروڑوں انسانوں کو نسل در نسل آزادی بخشی۔ آزادی جو زندگی کی عفت ہے، انسان کا وقار ہے۔ محمد علی جناح تاریخ سازوں اور تقدیر گروں کی اس عظیم و جلیل برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں تقدیر کا لکھا تو مٹایا جا سکتا ہے مگر تاریخ کا لکھا بدلا نہیں جا سکتا۔ تاریخ آج گواہی دیتی ہے۔ کل بھی دے گی کہ اگر اس صدی میں محمد علی جناح نہ ہوتے تو ہمارے پاس برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کے پاس فقط ماضی ہوتا وہ بھی اتنا بعید کہ ہر بار اس کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے لیے ہمیں صدیوں کی وہ خلیج پاٹنا پڑتی جو ایسی ہی ایک اور کم حوصلہ نسل کی لغزشوں سے پیدا ہوئی تھی۔ پھر یہ فاصلہ ہمیشہ بڑھتا رہتا، یہاں تک کہ آنے والی نسلوں کے لیے فقط ایک خلا باقی رہ جاتا۔

زمانے کا تو یہ دستور ہے کہ جو قومیں مستقبل کی جانب اپنا سفر جاری نہیں رکھتیں ان کا رشتہ ماضی سے بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ آج سے چھبیس برس پہلے پاکستانی قوم نے دو صدیوں کی خلیج پاٹ کر اپنا رشتہ ایک شاندار اور توانا ماضی کے ساتھ استوار کیا تھا اور محمد علی جناح کی مدد سے استوار کیا تھا۔ مگر وقت نے

بتایا کہ یہ ایک کمزور اور ناتواں قوم تھی جو اپنے قائد کا ساتھ چھوٹ جانے پر مستقبل کی جانب اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکی۔ چوتھائی صدی سے ایک دائرے میں گھومتے گھومتے چکرا گئی ہے اور اب نیم جاں حالت میں پڑی کسی مردِ راہداں کے لیے ترس رہی ہے۔ مگر فطرت اتنی فراخ دل کہاں کہ اتنی کم مدت میں ایک اور محمد علی جناح پیدا کر دے۔ اگر یوں ہوتا تو نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ نہ روتی اور غالب کی نسل کی ساری تلاش کا کل حاصل فقط یہ بات نہ ہوتی کہ ؏

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ

اور پھر محمد علی جناح تو دیدہ وروں اور راہ دانوں میں بھی غیر معمولی طور پر قدآور دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو خلّاق قوموں میں بھی کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی نے مستقبل کے راز دانوں کی فہرست میں غیرِ معمولی اضافے کیے ہیں۔ نئے ناموں میں لینن، ماؤزے تنگ اور ہوچی منہ کے نام نمایاں لکھے نظر آتے ہیں۔ یہ عقیدت کا جوش نہیں بلکہ سچائی کا خلوص ہوگا۔ اگر میں یہ کہوں کہ محمد علی جناح کا نام بھی اس صدی کے بڑے انسانوں میں آتا ہے۔ ہندوستان آزاد ہو جاتا تو بھی ہندوستان کا مسلمان غلامی سے نجات نہ پا سکتا کہ ہندو لیڈر کی تنگ نظری کے ساتھ بنئے اور سیٹھ کا استحصال اسی طرح جاری رہتا۔ اکثریت کے سیاسی دباؤ کے علاوہ اقتصادی کمتری مسلمان کا مقدر بن جاتی اگر پاکستان نہ بنایا جاتا۔ پاکستان بنا لینا بھی کوئی معمولی واردات نہ تھی۔ ہندو اور انگریز کی سیاست گری کا مقابلہ کر لینا اسی صورت میں جبکہ مسلمان قوم اتنی بیدار بھی نہیں تھی جتنی کہ ہندو قوم قائداعظم ہی کا کام تھا۔ اور فی الواقع یہ بات کہہ کر میں کوئی نئی بات نہیں کہوں گی کہ نئی دنیائیں بنانے والے مرتے نہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں اپنے قائد کی زندگی سے زیادہ ان کی موت سے دلچسپی ہے۔ پچھلے برسوں میں یہی تو ہُوا ہے کہ اپنی رنگا رنگ مصروفیات میں ہم نے بمشکل دو دن قائد کی یاد کے لیے نکالے۔ ایک پچیس دسمبر یعنی

پیدائش کا دن دوسرا گیارہ ستمبر یعنی وفات کا دن۔ اول الذکر تو خیر آتا ہی کرسمس کی چھٹیوں میں ہے۔ اس روز ہم میں سے کچھ بڑے دن کا کیک چکھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ باقی دھوم دھام سے نیا سال منانے کی تیاری میں لے دے کے ایک گیارہ ستمبر کا دن رہ جاتا ہے کہ جب حکومتِ وقت رعایا کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے رخصت ایک یوم کی عنایت کرتی ہے۔ تب عوام مقبرے پہ جاکر مسجدوں میں بیٹھ کر اور خواص ایرکنڈیشنڈ کمروں میں کرسیوں پر براجمان ہوکر قائد کو یاد کرتے ہیں موت کا ذکر چلتا ہے اور مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں محمد علی جناح کے لیے وہ لوگ جن کی اپنی مغفرت چاہنے والا کوئی نہ ہوگا۔ خبر نہیں کیا نام ہے اس کا خود فریبی کہ خدا فریبی!

مگر ایسی ہی بے خبریوں سے کام لے کر ہم نے ان دو نسلوں کو جو پاکستان بننے کے بعد جوان ہوئیں یا پیدا ہوئیں اس علم ولقین سے مالا مال کر دیا ہے کہ قائد اعظم زندہ نہیں ہیں۔ وہ پچیس دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوتے تھے اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اسی شہر میں وفات پا گئے۔ ان دو تاریخوں کے درمیان کسی وقت انھوں نے پاکستان بنانا شروع کیا جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تیار ہو گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کچی مٹی سے کھلونے بنا لیے جاتے ہیں۔ اس مہربانی کے لیے قوم نے ان کا شکریہ اس طرح ادا کیا کہ قبر پر اونچا مقبرہ بنا دیا۔

معاف کیجئے یہ اندازِ تکلم میری عادت نہیں، نہ اس کا یہ موقعہ ہے مگر اس کا کیا کروں کہ حقیقت حال اس سے بھی دگرگوں ہے۔ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک کا نصاب سامنے رکھ لیجئے اور تلاش کر لیجئے کہ کتنی جگہ قائد کے افکار و تحریر کو دی گئی ہے۔ قائد بہت اعلیٰ انگریزی لکھنے اور بولنے پر قادر تھے۔ نصاب کی کتابوں میں جہاں اعلیٰ زبان کے ملکی و غیر ملکی نمونے جمع کیے گئے ہیں، قائد کی تحریر کو کہیں جگہ نہیں دی گئی۔ مجھے اچھی طرح

یاد ہے کہ انگریزی کی جو کتاب ہمیں فسٹ ایئر میں پڑھائی گئی تھی۔ اس میں بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ایک تقریر کے علاوہ پنڈت نہرو کا ایک خط بھی شامل تھا۔ بیگم رعنا اور پنڈت نہرو کی انگریزی کا رعب بہت دنوں تک دماغ پہ چھایا رہا۔ تاوقتیکہ قائد اعظم کی تقریریں پڑھیں تو اعلیٰ ترین زبان کے علاوہ یہ انکشاف بھی ہوا کہ بہت گہری اور پرانی باتوں کو چھوٹے چھوٹے الفاظ اور جملوں میں کس طرح سمویا جاتا ہے اور کم سے کم الفاظ میں بڑے بڑے معنی کس طرح اُجاگر ہو سکتے ہیں۔

ایک مثال والی بات بھی سُن لیجئے۔ سرکاری سکولوں میں دوسری جماعت کے بچّوں کو معاشرتی علوم کی مُنّی سی کتاب لگتی ہے۔ یہ کتاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے چھاپی ہے۔ اس کتاب میں چند قومی شخصیتوں کا تعارف ہے۔ اوّل تو قائدِ اعظم کا نام ہی فیلڈ مارشل کے بعد آتا ہے۔ پھر تعارفی نوٹ میں جو دس جملوں پر مشتمل ہے۔ چھ جملے قائد کی موت اور مقبرے کے بارے میں ہیں۔ دو جملوں میں تاریخ پیدائش و خاندان۔ نواں جملہ اِس طرح سے ہے "آپ نے پاکستان بنایا"۔ آخری جملے میں بچوں پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جب کبھی وہ کراچی جائیں تو آپ کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کرنا نہ بھولیں۔ مَیں اس کتاب کو اُٹھا کر کارکنانِ ٹیکسٹ بک بورڈ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مؤدبانہ گذارش کی کہ دوسری جماعت میں پڑھنے والے بچّے کی عمر سات برس ہوتی ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار قائد اعظم سے متعارف ہوتا ہے۔ اُس کے صاف ستھرے ذہن میں قائد کی موت کا تصوّر راسخ نہ کیا جائے بلکہ ان کے کردار و عمل کو اُجاگر کیا جائے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے پھر یہ تو اتنا بڑا نقار خانہ ہے کہ یہاں نہ جانے کیا کچھ کھو گیا ہے۔ یہاں محمد علی جناح کی آواز ہی گم نہیں ہوئی شاعرِ مشرق کی بانگِ درا بھی ڈوب گئی ہے۔ یہیں پہ حالی کے گیت کھوئے گئے ہیں۔ اسی جگہ ظفر علی خاں کے نغموں نے دم توڑا ہے۔ یہاں تو اب خدا بھی پکارے تو

سنائی نہ دیے۔ میں انھیں سوچوں میں اُلجھ رہی تھی کہ کسی دانشمند نے سمجھایا کہ اس طرح کی باتیں ٹیکسٹ بک بورڈ کی لاعلمی یا لوگوں کی بے شعوری سے نہیں ہوتیں بلکہ قوم کے دانشوروں اور کارمختاروں کی حکمت عملی کے نتیجے میں ظہور پاتی ہیں۔ ان کا علاج تم جیسے بے حیثیت لوگوں کے بس کا نہیں، یہ کوئی تجاہل عارفانہ نہیں تغافل جارحانہ ہے۔ سوچے سمجھے منصوبے ہیں دُورس سکیمیں ہیں۔ دیکھونا اگر قوم کے حافظے میں قائداعظم کا تصوّر ہی زندہ رہے تو وہ ہما شما کو کس طرح تسلیم کرلے یہ نکتہ میری سمجھ میں آگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی کئی ایسے سوالوں کا جواب بھی مل گیا جو بچپن سے لیکر ابتک ذہن میں کلبلاتے تھے۔ یہ سوال اس وقت پیدا ہوتے تھے جب ایک اُداس سی ٹھنڈی دوپہر کو قائداعظم کے نحیف ونزار جسم کو سٹریچر پر ڈال کر گاڑی میں رکھا گیا اور گاڑی زیارت کی ویران وخوفناک بلندیوں سے ہچکولے کھاتی نیچے اتر رہی تھی۔ قائد کو بیماری کی حالت میں زیارت کیوں بھیجا گیا یہ تو ملک کے آخری کونے کا ایک ویرانہ تھا۔ وہ آدمی جس نے انگریز اور ہندو جیسی خطرناک قوموں سے جنگ لڑی اور اپنی قوم کی تقدیر بنائی، وہ انسان جو دس کروڑ انسانوں کا قائد ہے اور اتنی بڑی سلطنت کا سربراہ آخر اس کے علاج کے لیے دنیا بھر سے ڈاکٹر کیوں نہ بلائے گئے؟ کیا اس کے آرام کے لیے زیارت سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی؟ آخر اور کتنے لیڈر ہیں جو صحت یابی کے لیے زیارت جاتے ہیں؟ مگر قائدِ اعظم کے لیے تو ایمبولنس بھی درست حالت میں میسّر نہ تھی۔ قائد آخری سانسیں لے رہے تھے اور ایمبولنس سڑک پر خراب کھڑی تھی بلکہ گھنٹوں کے حساب سے کھڑی تھی۔ قوم اُس وقت کہاں تھی، انتظامیہ کو کیا ہُوا تھا، وزیر اعظم آخر کس کام میں مصروف تھے؟ قوم سے تو کیا شکوہ۔ ہو گی بیچاری کہیں رفیوجی کیمپوں میں دال روٹی کا انتظار کرتی، کچھ قطاروں میں لگی مکانوں زمینوں کی الاٹ منٹ کے پروانے حاصل کر رہی ہو گی اور باقی ماندہ ہندوؤں، سکھوں کے چھوڑے

ہوتے مکانوں سے برتن بستر اور میز کرسیاں سمیٹنے میں لگی ہو گی ۔ انتظامیہ غریب کو متروکہ جائیدادوں کے انتظام سے کہاں فرصت ہو گی ۔ رہے وزیر اعظم تو وہ اس وقت یقیناً دستور بنا رہے تھے ۔ وہی دستور جس کی رُو سے اس مملکتِ خداداد میں ہر ظلم روا ہوا ، ہر جرم کی پردہ داری لازم آئی ، ہر ظالم کو تحفظ دینے کا قانون رائج ہوا ۔ لوگوں کے حقوق غصب کرنے کمزوروں کو پامال کرنے کا دَور چلا تو چلتا ہی گیا ۔ اس سارے دور میں بولنا ممنوع رہا ، سوال کرنا گناہ اور اپنا حق مانگنا گناہِ کبیرہ ۔ یہ بڑا ہی ظالم دستور تھا جو قائد کے قتل سے چلا تو آئین کا گلا گھونٹتا ہُوا قوم کے قتل تک پہنچا ۔ ۲۵ برس گذر گئے ، کبھی کبھی قوم صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ کی تصویر بن کر رہ گئی ۔ قائد کی وفات سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک تشنہ سوالوں کی ایک زنجیر بن گئی ہے اس لمبی زنجیر میں ان سب کی روحیں جکڑی ہیں جو احساس رکھتے ہیں اور ان سب کے ذہن مقید ہیں جو سوچ رکھتے ہیں ۔ ان قیدی روحوں اور اسیر ذہنوں کی رہائی کب ہو گی ؟ نجات دیدہ و دل کی ساعت کب آئے گی ؟ کوئی نہیں جانتا ۔ ابھی تو نئی سوچ کا قتل عام جاری ہے ۔ ابھی تو سچائی کے سینے میں جبر کی سنگین اس طرح کُبھی ہے جیسے وطن کی سرحدوں پر دشمن کے پاؤں ۔ ابھی تو یہ زنجیر اور بھی لمبی ہوتی جا رہی ہے ۔ نئی نئی کڑیاں اور حلقے اس میں مل رہے ہیں ۔ اُدھر اکیس مہینوں سے ہمارے ذہنوں میں ایک مہیب سوال انگارہ بن کر دہک رہا ہے ۔ ہم جاننا چاہتے ہیں ، ہر قیمت پر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ڈھاکہ شہر نے شکست کیوں مانی ، وہاں ہتھیار ڈالنے کی رسم کیسے چلی ، کیوں کر چلی ؟ یہ رسم چلانے والوں کے سامنے کون سی مصلحت تھی ، کونسا مفاد تھا کہ وہ ہتھیار چھوڑ کر ہتھکڑیاں پہننے کو پسند کرنے لگے ۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ شاید کہیں کھو گئی ہے ، دنیا والوں نے جو بتایا اس کی صداقت پر ہمیں شک ہے ۔ اب ہم ان لوگوں کے منتظر ہیں جو چشم دید گواہ تھے اور

ان لوگوں کے بھی جن کے ہاتھوں یہ رسم انجام پائی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اس رسم کو انجام دینے والے جب آئیں گے تو انھیں پھولوں کے ہار پہنا کر مجاہد و غازی کے لقب دے کر کسی دور صحت افزا مقام پر آباد کر دیا جائے گا۔ ہمیں ان کوٹھیوں کے قریب جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ ہماری بستیوں میں دستور زباں بندی نافذ ہوگا۔ پھر کوئی گمنام مصلحت ہوگی، سوال کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا، چپ رہنا عین مصلحت، ہاں یہی ہوگا۔ اس سے پہلے بھی اس طرح ہوتا رہا۔ ہمارے کتنے اور قاتل ایسی ہی مصلحتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں موج اڑاتے رہے اور ہم جاننے کی اصلیت کو سمجھنے کی قاتل پہچاننے کی، محاسبہ کرنے کی، انصاف چاہنے کی شدید خواہشوں کے الاؤ میں جلتے رہے اور بجھتے رہے۔ ملک کیوں ٹوٹا، بغاوت کیوں ہوئی، شہر ڈھاکہ کیسے مطیع ہوگیا؟ آج یہ سوال جلتا انگارہ ہے۔ کل تک اپنے آپ ٹھنڈا ہو کر اس لمبی زنجیر کے ایک نئے حلقے میں ڈھل جائے گا اور ذہنوں میں ایک اور داغ باقی رہ جائے گا۔

تاہم اس مملکتِ خداداد میں جہاں سوال پوچھنے کی اجازت نہیں، جواب دینے کا دستور نہیں۔ ایک سوال کا تفصیلی جواب تو ہمیں مل ہی چکا ہے۔ قائد کو بھلا کر ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ قیام پاکستان کے بعد قائد نے جتنی تقریریں اور جتنے پیغام دیئے ان میں سب سے زیادہ اہمیت انھوں نے پاکستان کے دفاع اور کشمیر کے مسئلے کو دی تھی۔ فوجی اور شہری اداروں میں جا کر، فوجی جوانوں اور افسروں سے مل کر، طالب علموں اور شہریوں سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا تھا اور تاکید سے کہا کہ پاکستان کا تحفظ اس کے حصول سے بھی زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت دل و جاں سے کرنا، خون کے آخری قطرے اور آخری سانس تک وطن کے تحفظ کی جنگ لڑنا۔ اپنے پرچم کو ہر قیمت پہ بلند رکھنا۔ بھارت دشمن ہے پاکستان پر حملہ کرے تو اس وقت تک جنگ لڑنا جب تک تم اسے اٹھا کر بحرِ ہند میں نہ پھینک دو یا وہ تمہیں اٹھا کر بحیرۂ عرب

میں نہ پھینک دے۔ قائد کی یہ باتیں اگر ہمارے لئے جزو ایمان ہوتیں، انھیں دلوں و دماغوں پہ نقش اور در و دیوار پہ کندہ کیا جاتا، بالکل اسی طرح جیسے چین والے ماؤ کی باتوں کو دن رات دہراتے ہیں۔ آوازوں میں اور عمل میں بھی، تو چاہے کتنی جنگیں ہوتیں، کیسی ہی شکست ہوتی مگر وہ کبھی نہ ہوتا جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکے میں ہُوا۔ اپنی ہی زمین پہ اپنے ہی سبز ہلالی پرچم کو زمین بوس کر کے ترنگے کو سلامی دینے سے پہلے پاکستان کا ایک بیٹا بھی زندہ نہ رہتا۔ مگر وہاں تو یہ سب کچھ اہتمام سے ہُوا۔ سپہ سالاروں نے ہاتھوں سے کیا اور سپاہیوں نے آنکھوں سے دیکھا۔ خدا جانے وہ کیسی بے بسی تھی۔ کس طرح کی بے حسی کہ اس وقت جب یہ سب کچھ ہُوا۔ ایک گولی تک نہ چلی اُس ہاتھ کو توڑنے کے لیے جو چاند تارے والے پرچم کو سرنگوں کر رہا تھا اور اس ہاتھ کو جو شکست نامے پر تصدیق کی مُہر لگا رہا تھا۔ کاش سقوطِ ڈھاکہ کی خبر سے پہلے دنیا کے اخباروں میں ایک خبر یوں بھی چھپتی کہ پاکستانی فوج کے ایک جوان نے جنرل نیازی کو اس وقت گولی مار دی جب وہ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر جنرل اروڑا کا استقبال کرنے کھڑے تھے یا جب وہ ریس کورس میدان میں ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا اہتمام کر رہے تھے۔ کاش یہ خبر ہم سنتے تو آج اتنے مایوس تو نہ ہوتے۔ ہمارے خون کا کچھ تو اعتماد باقی رہتا۔ مگر یہاں بھی قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ قوم نے سپاہی کو ہتھیار تو دیئے مگر غیرت و حمیّت نہ سکھائی، قوت ارادی نہ بخشی، پر یہ بات سوچنا بھی کہاں تک درست ہے۔ قوم صاحبِ اختیار ہی کب تھی جو یہ اہتمام کرتی۔ خود قوم کے سینے کتنی بار اپنی فوج کی گولیوں سے چھلنی ہوئے، کتنی بار قوم کی کھلی آنکھوں کے سامنے اپنی دھرتی کے دل پر ٹینک چلائے گئے۔ توپیں داغی گئیں، قوم بھی غلام تھی، فوج بھی آزاد نہ تھی۔ اگر یوں نہ ہوتا تو وہ گھڑی کبھی نہ آتی۔ جب بھارت میں فتح کے شادیانے بج رہے تھے، مٹھائیاں بٹ رہی تھیں اور پاکستانی فوج خار دار تاروں کے پیچھے قطار در قطار سر جھکائے کھڑی تھی۔

اِدھر ساری دنیا آنکھوں پر کیمرے رکھے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اُدھر تاریخ آنکھیں جھپکا جھپکا کر یہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی آیا یہ وہی قوم ہے جن کا سالار کبھی محمد علی جناح ہوا کرتا تھا۔ قوم کا ضمیر باقی تھا نہ حمیت زندہ تھی۔ چوتھائی صدی سے صرف جسم کی پرورش کا فلسفہ پنپ سکا تھا۔ سو فوج نے بھی وہی کیا۔ اپنے جسم بچا لیے باقی سب کچھ ہار دیا ؎

پَل پَل میں تاریخ چھپی ہے، گھڑی گھڑی گرداں ہے ندیم
ایک صدی کی ہار بنے گی ایک نظر کی بھول یہاں

سوچو۔ ایک نظر کی بھول اگر صدیوں کی ہار بن سکتی ہے تو ۲۵ برس کی بھول کو لے کر یہ راندہ درگاہ نسل اب کہاں جائے گی؟ آج اُس کے سامنے جو بڑے بڑے نظریاتی محاذ کھل رہے ہیں کیا یہ ان کا سامنا کر لے گی، اس کے تہذیبی اور ثقافتی ورثوں پر جو بڑی بڑی یلغاریں آرٹ کلچر کے نام سے اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے ذریعے سے ہو رہی ہیں کیا یہ انھیں سہہ سکے گی؟ آنکھیں جو دیکھتی ہیں اس پہ یقین کیا جائے تو جواب نفی میں جاتا ہے۔

تاریخ کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر دیکھو۔ ۱۹۶۵ء میں جو دشمن رات کے اندھیرے میں لاہور کو لوٹنے آیا تھا، اس نے ۱۹۷۱ء میں دن دھاڑے ڈھاکہ لوٹ لیا۔ پہلی بار لاہور والے غصے میں بپھرے۔ لاٹھیاں کلہاڑیاں اٹھا کر لڑنے کو نکلے تو دوسری بار دھاڑیں مار مار کر روئے اور ماتمی جلوس بھی ٹھیک سے نہ نکال سکے مگر تیسری بار جب اسی دشمن نے ارادہ بدلے بغیر محاذ بدل کر حملہ کیا۔ یعنی امرتسر کا ٹیلی ویژن سٹیشن کھول کر لاہور والوں کو فلمیں دکھانے اور فیض احمد فیض و قتیل شفائی سے پریم کی باتیں سنانے کا عمل کیا تو لاہور والے پاگل ہو گئے۔ جو روپیہ سیلاب سے برباد ہونے والے بھائیوں کی مدد کے لیے نہیں نکلا تھا وہ ٹیلی ویژن سیٹ اور نئے اینٹنے خریدنے کے لیے نکل آیا۔ پھر لوگوں نے گیتوں اور دوہوں کی شکل میں دیواریں گرانے اور فاصلے مٹانے کی باتیں خوشی خوشی

سن لیں۔ کسی کو گمان بھی نہ گزرا کہ یہ گیت اور یہ باتیں انڈین ائر فورس کے ان جہازوں سے زیادہ خطرناک ہیں جو دن میں بیس بیس بار بم برسانے کے لیے لاہور آتے تھے۔

یہ حالات اچھے تو نہیں کہے جا سکتے۔ مستقبل کی جانب سفر کرنے کا عمل پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ ماضی کے ساتھ کا رشتہ بھی کتنے دن قائم رہے گا! نئی نسل کو پاکستان کی تعمیر کرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ تحریک کی کہانیاں اور ہندو کی نفرت کے قصے ان کے لیے داستانِ پارینہ بن چکے ہیں۔ ان سنی سنائی باتوں سے وہ قوم پرست نہیں بن سکتی۔ خود ملک کے اندر اس نے لسانی صوبائی اور طبقاتی نفرتوں کے جو طوفان اٹھتے دیکھے ہیں۔ بے انصافی ظلم اور استحصال کا عمل جو پاکستان میں جاری ہے۔ اس کے سامنے ہندوؤں کی نفرت یا استحصال کے تاریخی یا امکانی قصے کوئی اثر نہیں رکھتے۔ پرانی نسل کے لوگ ان سہاروں کے ساتھ جی تو سکتے ہیں مگر وہ نئی نسل کی مدد کے بغیر پاکستان کو بچا نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ نہ ہو سکا اور اسی وجہ سے نظریاتی سرحدوں کا محاذ کمزور پڑ رہا ہے۔

دنیا کے حالات ہیں کہ طوفانی انداز سے بدل رہے ہیں، یہاں زندگی کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ نئی اور پرانی سوچ کے درمیان خلا دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اِدھر سے یہ آوازیں آتی ہیں: پاکستان غلط تھا۔ اس کی تحریک غلط تھی، اس کی تاریخ غلط تھی، اس کا جغرافیہ غلط تھا، اس کی قیادت غلط تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ محض جذباتی تھا۔ ان باتوں کی تصدیق کے لیے پہلے مشرقی اور مغربی حصے کے لوگوں کی دو قومیں بنا کر علیحدہ کیا گیا، اب باقی چار صوبوں میں چھ قومیں بنائی جا رہی ہیں۔ اِدھر اس لحاظ سے سوچ بدل رہی ہے۔ کچھ لوگ تو قائل ہونے جا رہے ہیں کہ یہ غیر ملکی لوگ کتنے لائق ہیں ہماری تاریخ کی غلطیاں کیسی دھڑا دھڑ نکال رہے ہیں۔ شاید انہی لوگوں کی

نشاں دہی پر ہم نے اپنے جغرافیے کی اتنی بڑی غلطی نکالی تھی۔ پرانا آدمی ابھی تک حقیقت سے آنکھیں چرا رہا ہے جانتا نہیں یا جاننا چاہتا نہیں کہ اس کی آواز اب کھنڈروں کی صدائے بازگشت بن چکی ہے۔ پرانی راگنیاں الاپ کر وہ لوگوں کا اعتماد جیت سکتا ہے نہ اپنی کورنظری کی تلافی کر سکتا ہے۔ پاکستان کی تباہی سے اس نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ آج بھی وہ بڑے اطمینان سے نئی سوچ کا قتل عام کرنے والوں کا ساتھ دیتے جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ ظالم اور جاہل نسل جب دفن ہو جائے گی تو آنے والی نسلیں اس پر نفرین کریں گی۔ زمین اس کی ہڈیوں کو اُگل ڈالے گی اور سمندر انھیں قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ تب کوئی حالی اس داستانِ غمگیر پہ مسدس لکھے گا۔ نئی نسل کے سفینے کو دور زندگی کے ساحلوں پر روشن میناروں کا پتہ دے گا۔ پھر کوئی اقبال مستقبل کی سحر کو پردۂ تقدیر میں بے حجاب دیکھنے والی نگاہ لے کر بڑے بڑے خواب دیکھے گا اور جوانوں کو ایشیا کی قیادت سے بڑھ کر دنیا کی امامت کا منصب حاصل کرنے کے لیے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا گُر سمجھائے گا اور تمنا تو یوں بھی کہتی ہے کہ پھر کوئی بوڑھا قائد ایک نئی قوم کو لے کر بڑی سی سلطنت کی سرحدوں پہ کھڑا اپنی لمبی زعفرانی انگلی اُٹھا کر نئی تعمیروں کے نقشے سمجھا رہا ہو گا۔ تب وہ وقت بھی آئے گا جب بوڑھے جوانوں کے خون کا بیوپار نہیں کیا کریں گے بلکہ اپنے پوتوں، نواسوں کے لیے پھلوں کے درخت اُگایا کریں گے اور ان پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر نئے زمانوں کے خواب دیکھا کریں گے۔ تب جوانوں کی فوج موج در موج ان خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے نکلے گی اور پاکستان کا نام بھی دنیا کی آبرومند قوموں کے برابر لکھا جائے گا۔ یہ سب کچھ تو ہو گا۔ پر آج کوئی سر سید نیا علی گڑھ چاہے نہ بنائے اسباب بغاوت تو لکھے۔ ولیم میور کے وطن جا کر خطبات مرتب کرنے کی جرأت تو کرے اور دنیا کو بتائے کہ پاکستان کی تحریک غلط نہ تھی۔ یہ اتنی ہی سچی اور صحیح تھی جتنی تیسری دنیا کے باقی ملکوں کی آزادی کی تحریکیں

پاکستان کا نظریہ کسی ایک فرد یا نسل کی ایجاد تو نہیں تھی۔ یہ تو ایک ہزار برس پر پھیلی ہوئی تاریخ سے پیدا ہونے والی ایک حقیقت تھی۔ اس خطہ زمین پر مسلم ریاست صدیوں قائم رہی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس ریاست کی حدود پھیلتی سکڑتی رہیں کبھی پورے ہندوستان پر محیط ہو جاتیں کبھی چند صوبوں تک محدود رہتیں۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ سلطنت کی حدود مٹ گئیں مگر قوم کے خدوخال قائم اور باقی رہے۔ اسی قوم نے اچھی قیادت میسر آنے پر پھر سے اپنے وجود کا اثبات کیا اور اپنی خود مختار ریاست قائم کر لی۔ مگر اس نئے دور میں یہ احیاء جمہوری انداز سے ہُوا۔ ریاست کی حدود انھیں علاقوں میں متعین ہوئیں جہاں مسلمان اکثریت میں تھا اور ووٹ دینے کے لیے آزاد تھا۔ قیام پاکستان کو ہندوؤں کا بھارت ماتا کی تقسیم کہنا ایک جذباتی اور مہمل نعرہ تھا۔ سارے ہندوستان کا سیاسی لحاظ سے ایک اکائی ہونا یا ایک مرکز کے تحت ہونا یا تو مغل سلطنت کے دَور میں ہوا یا پھر انگریز کے راج میں۔ ہندو تاریخ کے کسی دَور میں بھی ہندوستان ایک سیاسی وحدت نہیں رہا۔ طبعیٰ اور لسانی تقسیمیں تو ہمیشہ سے تھیں ہی۔ تو بنگال کا علیحدہ ہو جانا کسی تاریخی یا نظریاتی کمزوری کے سبب سے نہیں بلکہ ایک نسل کے عمل کی غلطی ہے۔ جغرافیائی اور لسانی حدود کے اتنے بڑے معنی ہوتے تو بنگلہ دیش کے بننے کے بعد مغربی بنگال کے ہندوستان میں شامل رہنے کا کیا جواز ہے اور پنجاب کے منقسم رہنے کے کیا معنی ہوتے؟ بنگال کی علیحدگی پاکستان کے نظریے کا المیہ نہیں بلکہ ایک نسل کا المیہ ہے جس نے پاکستان بنایا تو مگر آگے چل کر تاریخ کا رُخ نہیں پہچانا۔ اپنی سوچ نہیں بدلی۔ آزادی کی اصل روح ثقافتی انقلاب اور اقتصادی انصاف کے لیے راہیں ہموار نہیں کیں۔

آج بھی ضرورت ہے دنیا کو قائل کرنے کی کہ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں نہ تو ایک نسل نے قائم کیں نہ انھیں فوج نے بنایا نہ کسی سُپر پاور

کی حکمتِ عملی کا اس میں کوئی ہاتھ تھا۔ یہ تو ایک بڑی قوم کا نسل در نسل ورثہ ہے۔ جسے بہت ہی جمہوری عمل کے ساتھ دوبارہ پاکستان کی شکل میں جسے حاصل کیا گیا تھا۔

اس طرح مشرق اور مغرب میں پھیلے ہُوئے دو حصّے پاکستان کی کمزوری نہیں بلکہ قوت تھی۔ آج بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایشیا میں باوجود چین جیسی عظیم قوم اور بڑے ملک کے اور جاپان جیسے اقتصادی جن کے اور روس کے اس فیصلے کے کہ وہ خود کو ایشیا کا مالک و مختار بنانا چاہتا ہے۔ بھارت کا دائرہ اثر بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ بھارت اقتصادی لحاظ سے ایک کمزور اور نامکمل ملک ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سیاسی نظریہ خواہ کتنا ہی انقلابی اور جدید کیوں نہ ہو جب تک مکمل اور قابل عمل اقتصادی پروگرام اس میں شامل نہ ہو، فی زمانہ موثر نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود بھارت ایشیا کی قیادت پر اپنا حق سمجھتا ہے اور اس کے خواب دیکھتا ہے۔ بھارت کے خوابوں کی یہ قوت دراصل اس کے جغرافیے کی قوت ہے، ایشیا میں ہندوستان کی جغرافیائی حیثیت بے حد اہم ہے۔ جبکہ یہ اہمیت چین کے جغرافیے کو حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے پاس مکمل سیاسی نظریے اور جامع اقتصادی منصوبے ہیں۔ تاریخ بھی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ماضی میں ایشیا اور یورپ کی اقوام کے لیے ہندوستان مرکزِ کشش رہا ہے مگر تب حالات اور تھے، اب تو خود بھارت اپنی اس قوت کو بروئے کار لاکر بڑے بڑے فائدے اٹھانا چاہتا ہے۔ مَیں جو کچھ واضح کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے اس حصّے میں ایسی حدود اور محل وقوع کے ساتھ بنا تھا کہ اس میں برصغیر کی ساری جغرافیائی قوت سمٹ آئی تھی۔ تاریخی قوت اس کے علاوہ تھی، یہ ریاست ایک ایسی قوم نے بنائی تھی جو ہزار برس پہلے سے وجود رکھتی تھی، دوسرے یہ ایک ایسی انوکھی ریاست

بنی تھی کہ اس کا پھیلاؤ پورے ایشیا میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ پاکستان کے دونوں حصے اس کے شہ پر تھے۔ جن کا پھیلاؤ مشرق وسطیٰ سے لے کر مشرق بعید تک چلا جاتا تھا۔ یہ ایک بے حد اہم جغرافیائی قوت تھی جس کے ساتھ تاریخ کا دھارا بھی آن ملتا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں تمام مسلمان ملکوں اور عرب ریاستوں کے ساتھ پاکستانی قوم کے مذہبی ثقافتی اور تہذیبی رشتے بڑے ہی مکمل تھے دوسری طرف مشرقی حصے کے ساتھ مشرقِ بعید کے ایسے ہی بندھن بڑے اٹوٹ تھے۔ یہ ایک ایسی صورت تھی کہ اس سے بھارت کا حلقہ اثر دونوں طرف سے محدود ہو جاتا تھا۔ پاکستان جب کبھی بلند پروازی پر مائل ہوتا تو ایک طرف مشرق وسطیٰ کے تپتے ہوئے صحرا اس کے ایک شہ پر کے نیچے آتے تو دوسری طرف مشرق بعید کے سبزہ زار۔ اتنا وسیع دائرہ اثر و عمل ایشیا کی کسی اور قوم کو میسر نہ تھا۔ خود بھارت ان دونوں حصوں کے درمیان اپنے آپ کو گھیرا ہوا محسوس کرتا تھا، پاکستان کے مستحکم رہنے کی صورت میں وہ مہا بھارت کے خواب نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی ایشیا میں لیڈر شپ کا کوئی مقام حاصل کر سکتا تھا۔ یہ بات بھارت کے نیتاؤں کو اچھی طرح معلوم تھی، اس لیے وہ نفرت کی زبان میں پاکستان کو "دو سروں والا اژدھا" کہہ کر پکارتے تھے۔ بھارت کو اپنے خواب پورے کرنے کے لیے جہاں پاکستان کو کمزور کرنا ضروری تھا وہاں اس کا ایک شہپر توڑنا بھی ضروری تھا مگر بات یہیں پہ ختم نہیں ہوتی، کیونکہ یہ شہپر اکیلے بھارت کے توڑنے سے نہیں ٹوٹتا۔ اس کام میں زیادہ محنت کرنے والے تو ملک کے اندر ہی پیدا ہوتے جن کے اپنے اغراض اور اپنے مفاد تھے، یہ لوگ بھارت کے لیے کام نہیں کر رہے تھے۔ یہ لوگ بنگالی بھی نہیں تھے۔ جنہیں باغی اور غدار کہنا ایک رواج بن چکا ہے، صرف یہی نہیں کہ آج ہم اپنی کھوئی انا کو تسکین دینے کے لیے بنگالیوں کو غدار اور باغی کہتے ہیں بلکہ یہ خطاب

انھیں بہت پہلے سے غیر ملکی حکمرانوں نے بھی دے رکھے تھے۔ انگریز جو پنجاب کی وفاداری کو پسند کرتا تھا، بنگال کی نفرت اور بیزاری سے ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اسے بنگال اُس وقت سے غدّار دکھائی دیتا تھا، جب سے اُس نے سراج الدولہ اور تیتو میر کے تیور دیکھے۔ بنگالی وفادار ہوتا تو پلاسی اور بکسر کی جنگیں کیوں ہوتیں۔ حاجی شریعت اللہ اور شاہ ولی اللہ کی تحریکیں کیوں کر پنپتیں۔ انگریزوں کے لیے تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بھی غداری ہی تھی۔ اُس نے ہمیشہ اسے غدر کہا اور خود ہماری زبان سے کہلوایا۔ اس غداری کا ارتکاب کر چکنے کے بعد جب ہندوستان باضابطہ طور پر تاج برطانیہ کا غلام ہو گیا تو بھی بنگال کا ضمیر بے چین رہا اور وہ انگریز حاکم کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے سے نہ صرف قاصر رہا۔ بلکہ اس نے ان سے کبھی کوئی پیمانِ وفا باندھا ہی نہیں۔ بنگال نے پنجاب کی طرح تاج برطانیہ اور سلطنت برطانیہ کے تحفظ کے لیے اپنے جوانوں کا خون نہیں دیا۔ بلکہ ایسے موقعوں پر خود اپنی غلامی کی زنجیر ہلا کر دنیا کو جھنکار سنائی۔ یہ بنگال ہی تھا کہ جہاں اس دَور میں جب سارا ہندوستان کتّے کی طرح گوری چمڑی والے آقاؤں کے تلوے چاٹ رہا، پرنس آف ویلز کی آمد پر سیاہ جھنڈے لہرائے گئے تھے۔ برطانوی حکمرانوں نے بنگال کی قوتِ ارادی کو کچلنے کے لیے بڑے بڑے اقدام کیے۔ بڑے بڑے قحط ڈلوائے۔ بے روزگاری پھیلائی ہنرمندوں کے ہاتھ قلم کروائے۔ جاگیرداروں اور سیٹھوں کو ان پہ مسلط کیا۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ نکلا تو فقط اتنا نکلا کہ بنگال کے ساتھ ایک اور لفظ "بھوکا" بھی لگ گیا۔ ننگے جسم بھوکے پیٹ ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے۔ سیٹھوں اور سود خوروں نے ان کی رگوں سے خون کا قطرہ قطرہ چوس لیا مگر بنگال کے اندر کی انا کو کمزور نہ کیا جا سکا۔ ایسے حالات سے گزر کر بہت کم قوموں میں قوتِ ارادی زندہ رہتی ہے، مگر بنگال اپنے قومی وجود کو باقی رکھنے کی جدوجہد

کرتا رہا۔ ۱۹۰۵ء کی تقسیم اور پھر ۱۹۱۱ء میں اس تقسیم کی منسوخی اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ بنگال کی دھرتی وہ ماں ہے جس کا دودھ ہمیشہ دوسروں کے بچوں نے پیا، ہندوؤں کے ظلم کی تاریخ تو خیر بہت ہی طویل ہے۔ مغلیہ عہد میں بھی اِس دَور از کار صُوبے پر مرکز کے حکمران دلّی میں بیٹھ کر بن دیکھے خدا کی طرح حکومت کرتے تھے۔ ان کی بنگال کو مطیع رکھنے کی دلچسپی فقط مال گذاری کی وصولی تک تھی، ورنہ نہ کبھی رعایا نے بادشاہ کو دیکھا ہوتا نہ بادشاہ کو رعایا کی حالت کا علم ہوتا۔ ایسے حالات میں کوئی صوبہ دار مرکز کو غافل یا مصروف یا کمزور پاکر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیتا اور بنگالی عوام کے ساتھ اچھا سلوک کر کے ان کی وفاداری و تعاون حاصل کر لیتا تو یہ بات بھی غداری کے نام سے بنگال کے نام لکھ دی جاتی۔ مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب جس کی وفاداری کے معیار خضر حیات ٹوانہ اور ممتاز دولتانہ قسم کے لوگوں نے قائم کر رکھے ہیں، بڑے وثوق سے بنگال کو باغی اور غدار کہتے ہیں، ان کے ہمنوا یوپی کے وہ لوگ بھی ہیں جو پاکستان بننے کے بعد بنگال جاکر آباد تو ہو گئے مگر اپنی برتری اور وفاداری کے معیاروں کو نہ بدل سکے۔ ان کی وفاداری کے تصوّر میں نہ وطن آتا ہے نہ کوئی نظریہ، فقط ایک مخصوص طرزِ زندگی اور بود و باش ہے جسے ان لوگوں نے اپنی پرستش اور وفاداری کا خدا بنا رکھا ہے، پنجاب اور یوپی والوں کے اس طرزِ عمل سے اس طبقے کو بڑا فائدہ پہنچا ہے جو اپنے مخصوص مفادات کی خاطر بنگال کی علیحدگی کے حامی ہی نہیں بلکہ اس کے لیے کوشاں بھی رہے۔ ان لوگوں نے مجیب اور عوامی لیگ کو بنگال کا نام دے کر ان کروڑوں لوگوں کو بھی غداروں میں شامل کر دیا، جنھوں نے پاکستان بنایا تھا اور جو پاکستان کی سچی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ در اصل مجیب کو بنگال کا لیڈر اور بنگ بندھو بنانے والے تو مغربی پاکستان کے کچھ لوگ ہیں۔ وہی لوگ جنھوں نے ۱۹۶۸ء میں اُسے ایک اور مجرم کی سطح سے

اُوپر اُٹھاکر ایوب خان کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کی میز پر بنگال کے بڑے لیڈر کی حیثیت سے بٹھایا. اور پھر اس کی زبان سے چھ نکات کی تشریحیں سُنیں ۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ چھ نکات کی تشریحیں بہت دنوں تک ہوتی رہیں ۔ ایوب خان کے آخری دنوں سے لے کر یحییٰ کے زمانے تک انتخابی مہم بھی انھیں چھ نکات پر سر ہوئی ۔ اس کو بنیاد بنا کر عوامی لیگ نے اپنی بھاری اکثریت حاصل کی ۔ مگر اس دوران مغربی پاکستان کے لیڈروں اور حکمرانوں میں سے کسی کو ان سے بغاوت کی بُو نہیں آئی ۔ مگر یونہی نیشنل اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ مقرر ہوئی سب کی ناکیں کھل گئیں اور پھر چھ نکات ایسا طوفان بن گئے کہ بغاوت غداری اور علیحدگی کے سب دھماکے انہی سے برآمد ہونے لگے ۔

فوجی کارروائی سے پہلے تین ہفتے تک بنگال نفرت کی آگ میں جلتا رہا ۔ اس نفرت کے شعلوں میں کتنے مغربی پاکستان کے لوگ جل کر بھسم ہُوئے ۔ کسی نے انھیں بچانے کی کوشش کی نہ قاتلوں کے ہاتھ روکے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس دوران جان بوجھ کر خاموشی اختیار کی گئی تھی ۔ دونوں حصوں کے درمیان نفرت بڑھانے کے لیے اور عوامی لیگ کو علیحدگی کے لیے زیادہ سے زیادہ بنگال کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ۔ پھر جب فوجی کارروائی عمل میں آئی تو یہ معجزہ بھی ہوا کہ نہ صرف مجیب الرحمان اور ان کے خاندان کے لوگ بخیریت رہے بلکہ عوامی لیگ کے تمام نمائندے بحفاظت بھارت پہنچ گئے ۔ غداری کے جرم میں مارے گئے تو بہت سے مچھیرے ، دھان بونے والے ، کشتی ران اور مزدوری کر کے گذر بسر کرنے والے لوگ ۔ ان بیچارے لوگوں کے مر جانے کا ہی آئندہ ہونے والے یا ہو چکنے والے فیصلے پر اثر نہیں پڑا . کہ پاکستان کے غریب محنت کش لوگ زندہ رہ کر بھی سیاسی فیصلوں میں اتنے ہی بے معنی ہوتے ہیں جتنے مرنے کے بعد ۔ ہاں البتہ تاریخ میں جرنیلوں

کا ذکر جہاں کہیں آئے گا۔ جنرل ٹکا خان کو جنرل ڈائر سے بھی بہت اُونچا مقام ملے گا۔ کہ ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں جو کچھ ہوا تھا وہ ایک ادنیٰ اور گھٹیا سی مثال ہے۔ اس کارنامے کے سامنے جو ۲۵۔ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات سے۔ لے کر کتنی دن تک انجام پاتا رہا۔ مشرقی پاکستان کی زمین پر۔ وہاں فقط لوگوں پہ گولی چلی تھی، یہاں تو بستیوں پہ ٹینک چلے توپیں دغیں۔ ایک بات اور ہے جو سمجھ میں نہیں آتی کہ اس موقع پر مغربی پاکستان نے اللہ کا شکر کس بات کے لیے ادا کیا تھا؟ لاکھوں مچھیروں اور کسانوں کے مرنے پر یا شیخ مجیب اور ان کے ساتھیوں کے بچ نکلنے پر یا پھر ملک بچ جانے پر؟ سوال ایک اور بھی ہے کہ بغاوت کو فوج نے کچل ڈالا تو بھی ملک کیوں نہ بچ سکا؟ یہ باتیں تو خیر بہت گہری اور گنجلک سیاست سے تعلق رکھتی ہیں۔ سیدھی بات ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتی کہ بنگالی مسلمان غداری کس سے کرتے پاکستان سے جو انھوں نے خود بنایا تھا اور سو برس لگا کر بنایا تھا، قائد اعظم جنگی فوج میں وہ سب بلا تقسیم شامل تھے۔ اور کس کی خاطر کرتے ہندوؤں کی جن کے ظلم سے نجات کے لیے انھوں نے اتنی طویل جنگ لڑی۔ بنگال سے زیادہ ہندو سیٹھ اور جاگیردار کے جبر سے نجات کی تمنا اور کسے تھی۔ کون نہیں جانتا کہ مغربی پاکستان کے صوبوں میں جب ریفرنڈم کرایا جا رہا تھا، بنگال میں پاکستان بن چکا تھا۔ بلکہ ۱۹۰۵ء میں جب مسلم بنگال کا صوبہ الگ ہوا، پاکستان کی بنیاد وہاں اسی وقت پڑ گئی تھی۔ ہاں البتہ بنگال نے پاکستان سب لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بنایا تھا۔ بے انصافی اور ظلم سے نجات حاصل کر کے آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے بنایا تھا تو پھر اس بنگال کو ۲۵ برس بعد پاکستان سے علیحدگی پر مجبور کر دینے کا کارنامہ آخر کس کا ہے؟ فوجی حکمرانوں کا نام لینا اس وقت بڑا آسان ہے مگر یہ کارنامہ صرف دو سال میں تو انجام نہیں پایا۔ اس کی ابتدا تو کہیں بہت پہلے سے ہوئی ہے۔ ایوب خان کے عامرانہ مزاج اور رویے سے تنگ بہت

سے بگاڑ پیدا کیے مگر اس کی نیت یا اس کے مقاصد میں بنگال کو علیحدگی پسند بنانے کا پروگرام تو شامل نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ مشرقی پاکستان کے باشعور طبقے میں ایوب خان کے خلاف نفرت عام تھی اور یہ تاثر بھی تھا کہ ایوب خان مغربی پاکستان کی مدد سے ہی جمہوریت کا گلا گھونٹ کر آمریت کے دیو کی پرورش کر رہا ہے مگر یہ تاثر بھی اس وقت ماند پڑ گیا تھا جب مغربی پاکستان سے ایوب کے خلاف تحریکیں اُٹھیں۔

مشرقی پاکستان کو پاکستان سے نکال باہر کرنے کا اصل غازی تو وہ ٹولہ ہے جنھیں اپنے ایک مضمون میں مَیں نے سانپ کہہ کر پکارا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ وہ والے سانپ نہیں جو آستینوں میں چھُپ جاتے ہیں۔ یہ تو بڑے بڑے ناگ کوبرے اور اژدہے ہیں جو زیادہ تر تو پنجاب اور سندھ کی زرخیز زمینوں پر پلے ہیں کچھ اور سرحد اور بلوچستان کے پہاڑوں اور وادیوں میں رہتے ہیں۔ ان کی خصوصیات اگر آپ جاننا چاہیں تو دیکھیئے مضمون بعنوان "سانپ" اِس وقت صرف اتنا جان لیجیے کہ یہ سانپ ناچنے تو ہر کسی کی بین پر لگتے ہیں مگر اپنے دانتوں کے نیچے دبی زہر کی تھیلیاں کسی کو نکالنے نہیں دیتے جو ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اسے ملکر ڈس لیتے ہیں۔ یہ انسانوں کے بڑے سخت دشمن ہیں۔ دولت سے پیار کرتے ہیں۔ اکثر بوڑھے ہو کر خزانوں پر کنڈلی مار کر بیٹھ رہتے ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہیں نا۔ بالکل ٹھیک! یہ ہیں پنجاب کے جاگیردار سندھ کے وڈیرے سرحد کے خان اور بلوچستان کے سردار۔ یہ لوگ کبھی کمپنی بہادر اور تاج برطانیہ کے حلقہ بگوش غلام تھے۔ ملک و قوم سے غداری کے صلے میں فرنگی حکمرانوں نے انھیں جاگیریں بخشیں۔ ان جاگیروں کو استحکام بخشنے کے لیے لوگوں کو، عوام کو کمزور پس ماندہ اور مطیع رکھا۔ ان لوگوں کے کردار کی نمایاں بات یہ ہے کہ صرف اپنی جاگیروں کے وفادار ہوتے ہیں۔ ملک قوم مذہب نظریے اور سیاست ہر چیز سے مقدم

ان کی جاگیریں ہیں۔ ان کا تحفظ کرنے کے لیے یہ ہر کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ فرد سے لے کر قوم تک کو۔ ان کے اخلاقی نظام کا مرکز اپنا مفاد ہے یا اپنی انا کی تسکین۔ ان کے اجداد کی گلی سڑی ہڈیاں بھی جیتے جاگتے انسانوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں کہ ان پر مہنگی قبریں اور قیمتی مقبرے بنوانا انتہائی ضروری ہے۔ مگر مزارع کے بچوں کے لیے کچا گھروندا بھی ہرگز ضروری نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنا ایک باغ بچانے کے لیے لوگوں کی بستیاں ڈبو دیتے ہیں۔ ان کے ہاں اپنے حقوق کا تصوّر خدائی حقوق تک پہنچتا ہے مگر فرائض کے زمرے میں صرف اپنے نفس کی پرورش آتی ہے اور ہاں گٹھ جوڑ کرنے میں ان کا جواب نہیں۔ آزادی کی تحریک میں یہ اس وقت شامل ہوئے جب انھیں یقین ہوگیا کہ پاکستان بن کر ہی رہے گا۔ ورنہ تو یہ انگریز کے دامن سے چمٹے بیٹھے تھے۔ پنڈت نہرو کے سوشلزم کا خوف نہ ہوتا تو یہ لوگ مسلم لیگ میں آتے ہی نہیں۔ آزادی کا تصوّر ان کے لیے جاگیروں کی مزید وسعت اور تحفظ کے ساتھ ساتھ حکومت کی مسند اور وزارت کی کرسیوں پر مشتمل تھا۔ قائداعظم ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے نہ ہی ان پر کبھی اعتماد کرتے۔ انھوں نے اپنے اور عوام کے درمیان کبھی ان طرّے بازوں کو حائل نہیں ہونے دیا۔ انھیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ پاکستان لوگوں کے ووٹ سے بنا ہے اور لوگوں کے لیے بنا ہے۔ خود ان لوگوں کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ انتہائی جمہوری ذہن رکھنے والے قائد کسی کو یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ پاکستان کے عوام کو رعایا بنا کر رکھے یا ان کی حق تلفی کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیردارانہ ذہنیت پاکستان کے خلاف بھارت سے بھی پہلے سازشوں پر آمادہ ہوگئی۔ شروع سے ہی ملک کے دونوں حصّوں کا سماجی ڈھانچہ ایک دوسرے سے خاصا مختلف تھا۔ وہ اس طرح سے کہ پاکستان کے مغربی صوبے مکمل طور پر جاگیرداری نظام کی گرفت میں تھے۔ اس حصّے میں انگریزوں نے جاگیردار طبقہ اپنی پسند اور

ضرورت کے مطابق پیدا کیا تھا اور اس کی تشکیل و پرداخت بڑے دھیان سے کی تھی۔ چونکہ یہ سرحدی علاقے تھے، ان کے ساتھ صاحب بہادر کی دلچسپی اور مفاد مختلف نوعیت کا تھا، اس لیے بنگال اور یوپی کے برعکس یہاں جاگیر دار طبقہ بنانے کا اصول بھی مختلف رکھا گیا۔ بنگال میں مسلمان آبادی کی اکثریت تھی مگر جاگیر دار ہندو تھا، یوپی میں ہندو اکثریت تھی مگر تعلقہ دار زیادہ تر مسلمان تھے، مگر یہاں مسلمانوں کی اکثریت پر جاگیر دار بھی مسلمان رکھا گیا۔ وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ یہ فوجی بھرتی کے علاقے تھے۔ زمینوں کی پیداوار سے زیادہ اہمیت یہاں جوانوں کی جنس میں تھی جو بے مثال قسم کے سپاہی بنتے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں کی نفسیات بھی مختلف تھی اور تاریخ بھی جداگانہ جس سے فائدہ اٹھاکر ان لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ بلکہ ان اغراض کے مستقل حصول کی خاطر انھیں ظالم جابر اور درندہ صفت جاگیر داروں کی غلامی میں دے دیا۔ یہ جاگیر دار اور وڈیرے مسلمان تھے۔ مگر ہندو یا انگریز سے زیادہ ظالم و بد کردار ثابت ہوتے۔ بنگال کی طرح یہاں کوئی مذہبی تحریک بھی نہ جاگ سکی کہ مُلّا خود جاگیر دار کا وفادار اور حلوہ خوار تھا۔ لہٰذا انگریز حاکم اور مسلمان جاگیر دار کی ملی بھگت سے مغربی پاکستان کے عوام کو پس ماندہ کم خواندہ اور سیاسی شعور سے بے بہرہ رکھا گیا۔ ایک ٹھیٹھ قسم کی فرماں برداری اور بے حس وفاداری کی تربیت دی گئی جو نہ صرف سرحدی علاقوں میں امن چین رکھنے میں انگریز کے کام آئی بلکہ یہاں کا سپاہی ہر محاذ پر اس قوم کے لیے بے جگری سے لڑتا رہا جس نے اسے غلام بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان سپاہی نے حکمِ حاکم سن کر مکّے پہ بھی گولی چلادی اور ڈھاکے میں جہاں وہ پہلے سرسے کفن باندھ کر لڑ رہا تھا۔ حکمِ حاکم سُنتے ہی بندوق رکھ دی۔ اس بے حس وفاداری کے بھی وجوہ ہیں۔ جاگیر دار کی زمین پر ظلم اور ذلتیں سہنے کے مقابلے میں انگریزی سرکار کی نوکری میں ایک تحفظ اور عزت کا احساس بھی ملتا تھا اور روزی بھی، صدیوں

کی، ذلتوں کے مارے لوگوں کے لیے جن کی زندگیوں میں پہلے سکھوں کا خوفناک دور بھی آچکا ہو، اتنی سی عزت اور تحفظ بھی بڑی بات ہے۔ جس کے بدلے میں دل وجان کیا، ہر شرطِ وفا بجا لائی جاسکتی ہے۔ یہ دستور ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔

اور یہی دکھ کی بات بھی ہے کہ ظالم جاگیر دار کی اس رعایا کو آزادی کے بعد بھی آزادی نصیب نہ ہوسکی جب کہ مشرقی پاکستان میں، ہندو جاگیر دار کے جانے سے لوگوں نے فضا میں آزادی کی خوشبو کو محسوس کیا۔ ان کا شعور بھی جاگا، وہاں متوسط طبقہ تیزی سے اُبھرنے لگا۔ مگر مغربی پاکستان میں جاگیردار اور وڈیرہ اور زیادہ با اختیار اور طاقت ور ہو گیا۔ اب تو وہ حکمران بھی تھا اور آئین ساز بھی افسر اعلیٰ بھی تھا اور لیڈر بھی۔ عوام اور زیادہ محکوم اور غلام بن گئے۔ ان کی بہبُود اور بھلائی کے جو کچھ کام سرکار برطانیہ کرتی تھی وہ بھی ختم ہُوئے۔ اب تو سارا ملک چند لوگوں کی جاگیر اور شکار گاہ بن گیا۔ ان حالات میں متوسط طبقے کے اُبھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حاکم اور رعایا کا تصوّر پنپتا رہا۔ سیاسی میدان میں جاگیردار گھوڑے دَوڑاتے رہے۔ لوگوں میں نہ سیاسی شعور ابھرنے دیا گیا نہ خود ارادیت پیدا ہوئی۔ تعلیمی نظام و دستور وہی رکھا گیا جو غلامی کے دَور میں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ۔ دونوں حصّوں میں حالات کا تضاد نمایاں ہوتا چلا گیا۔ مشرقی پاکستان اب صرف عوام کا صوبہ تھا۔ یہاں کی قیادت سنبھالنے والے اگرچہ مڈل بورژوا قسم کے لوگ ہی تھے مگر فیوڈل بورژوا نہیں تھے۔ یہاں جو اصلاحات نافذ ہوئیں مغربی پاکستان سے مختلف اور مکمل تر تھیں۔ ان کے ذریعے جاگیرداری نظام اور عمل کو بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔ ایسے حالات میں جیسے کہ ہوتا ہے متوسط طبقہ بڑے پیمانے پر ابھرا۔ کچھ انقلابی بیج بھی پھوٹے محنت کش عوام کا کردار ایک طبقے کی حیثیت سے بن ہی چکا تھا۔ سیاسی شعور اور آزادی کی لگن میں ۱۰۰ برس کا پس منظر موجود تھا۔ ہندو سیٹھ اور جاگیر دار

سے نجات پاکر یہ لوگ اجتماعی ترقی اقتصادی خوشحالی اور اپنی تہذیبی قدروں کا فروغ چاہتے تھے۔ قیادت سنبھالنے اور اپنے فیصلے خود کرنے کے لیے بالغ ہو چکے تھے۔ مغربی پاکستان میں عوام نے ابھی جنم بھی نہیں لیا تھا، یہاں جاگیرداری نظام مستحکم ہو رہا تھا۔ اس کے سائے میں نوکر شاہی پھل پھول رہی تھی۔ اس دوران دو اور قوتیں اُبھریں۔ فوج اور صنعت کار مگر عوام کا کوئی طبقہ سر نہ نکال سکا۔ مہاجر جو کچھ سیاسی شعور اور عوامی روح لے کر آیا تھا یہاں آکر مہاجر کے نام سے اپنی فرقہ بندی کرنے لگا۔ بلکہ صوبہ الگ بنانے کی فکر کرنے لگا۔ اس کے تحفظ کی یہی صورت تھی۔ شاید اور پھر صُوبہ بندی و فرقہ سازی ایسی تنگنایاں پیدا کرتے رہنا جاگیرداری نظام کے عین مفاد میں ہوتا ہے ؎

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چُن چُن کر بنائے مُسکرات!

آج بھی ہمارے لیے دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے جاگیردار وڈیرے خان اور سردار جہاں لوگوں کو سختی کے ساتھ تعصب کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا چاہتے ہیں۔ ہر روز صوبائی، نسلی اور لسانی فتنے اٹھا کر عام لوگوں میں خون خرابہ کراتے رہتے ہیں۔ خود آپس میں سب ایک ہوتے ہیں۔ ان کے طبقاتی مفاد ایسے مشترک ہیں کہ کہیں بھی زبان اور صوبے یا تہذیب کے اختلافات حائل نہیں ہوتے۔ دراصل ان کی اخلاقی اقدار ایک ہی ہوتی ہیں۔ یہ ایک ہی برادری ہے جو ہر حال میں عوام کے مقابلے میں اپنے طبقاتی مفاد کا تحفظ کرتی ہے۔ اس وقت بھی جب ان میں سے کوئی عوام دوستی کی بات کرے یا لوگوں کی قیادت کرنے نکلے، غریبوں کی ہمدردی میں جان کھپاتا دکھائی دے، دراصل اپنے ہی طبقے کا وفادار ہوتا ہے۔ طرزِ عمل میں فرق ہو سکتا ہے مگر مقصد ہر حال میں اپنے طبقاتی مفاد کے لیے عوام کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔ مثالوں کی کمی نہیں ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کتنے ہی

انتخابی حلقے ایسے تھے جہاں مزارعوں نے اپنے جاگیردار کو رد کر کے پیپلز پارٹی کے معمولی امیدوار کو ووٹ دیئے مگر جب اقتدار کا دَور آیا تو وہی جاگیردار حکومت کے قریب تر تھا اور وہی مزارعے اس کے رحم وکرم پر تھے، اس لیے کہ پارٹی کی بالائی قیادت جاگیردار طبقے کے ہاتھوں میں تھی۔ دوسری مثال اور بھی دلچسپ ہے۔ عین اس وقت جب سندھی پنجابی نفرت کے ساتھ لوگ ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ دولتانہ کی بیٹی کھوڑو کے بیٹے سے بیاہی جا رہی تھی۔ پنجابی جاگیردار بڑے فخر سے سندھی وڈیرے کا سمدھی بن رہا تھا۔

عوام کو تقسیم کرنا اور لڑانا تو وہ گُر ہے جو ان کے انگریز آقا سکھا گئے ہیں۔ قائد اعظم کو کچھ دن اور مل جاتے یا بھارت لاکھوں مہاجروں کو ادھر نہ دھکیل دیتا یا کم از کم پاکستان کا پہلا وزیر اعظم کوئی نواب زادہ نہ ہوتا تو یقینی طور پر قائد اعظم اس نظام کی جڑیں کاٹ دیتے جس نے بعد میں پاکستان کی جڑیں کاٹیں۔ مگر ان لوگوں کو فوراً بعد ہی موقعہ مل گیا۔ قائد کی وفات کے بعد مسلم لیگ اور حکومت دونوں پر قبضہ کر لیا اور لگے من مانی کرنے۔ بنگال جو دُور تھا اور مختلف تھا، اُسے اپنے آقاؤں کی تکنیک پر کالونی سمجھ لیا گیا۔ بنگالی لیڈر اس وقت مخلص تو تھا مگر ان میں قائد اعظم کی طرح قد آور کوئی نہ تھا کہ اس خطرناک جتھے کے چنگل میں پھنسے ہوئے پاکستان کو بچاتا یا مغربی پاکستان کے لوگوں سے رابطہ پیدا کر سکتا۔ کچھ عرصے تک تو بنگالی لیڈر ان لوگوں کے ہتھکنڈوں کو سمجھ بھی نہیں سکے سہروردی جو سیاسی قد کاٹھ کے ساتھ حالات کو سمجھنے کی فراست بھی رکھتے تھے اس میدان میں تنہا تھے جبکہ دوسری طرف جاگیردار جتھے کی کمک کو فوج بھی آ گئی تھی۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فوج جاگیردار دورِ حکومت کو ختم کرنے آئی تھی، مگر ہُوا یہ کہ فوج نے بھی اپنے تیرہ سالہ دَورِ حکومت میں عوام کو کچلے رکھا، جاگیرداری نظام کو بحال بلکہ مستحکم کیا۔ یہ فوج بھی مغربی پاکستان کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کی تعمیر میں بنگال کی طرف سے جو صحیح رول ادا ہونا چاہیے تھا وہ کبھی

نہ ہوا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ملک کی سیاسی زندگی میں مشرقی پاکستان کی بیدار مغز اور باشعور عوامی قوتوں کو داخل ہی نہیں ہونے دیا گیا۔ یہی وہ قوتیں تھیں جو نہ صرف قوم کی تعمیر صحیح خطوط پر کرسکتی تھیں بلکہ مغربی پاکستان کے عوام کو اپنے حقوق کے شعور اور تحفظ کی تربیت دے سکتی تھیں۔ مگر وہاں تو یہ حالت ہوئی کہ بیرونِ ملک سے بھی عوامی قوتوں کے آگے بڑھتے ہوئے دوستی کے ہاتھ جھٹک دیئے گئے اور سامراجی قوتوں کے ساتھ پھر سے رشتہ استوار کیا گیا۔ یہ بھی تو نواب زادہ لیاقت علی خاں کا کارنامہ ہے کہ روس کی طرف سے آیا ہوا دعوت نامہ رد کرکے امریکہ جا پہنچے۔ گویا برطانوی سامراج سے نجات پاتے ہی عالمی سامراج کے حاشیہ برداروں میں نام لکھوا لیا۔ امریکہ کی دوستی کا یہ طوق کس طرح پاکستانی عوام کے گلے کا پھندا بنا۔ کس طرح امریکی نوازشات نے ہی ہمارے قومی کردار کی دھجیاں بکھیریں، ساری دنیا پر عیاں ہے مگر امریکہ کی مدد سے جاگیرداروں کا جتھہ بے فکری سے من مانی کرتا رہا۔ نہ ملک کے لیے آئین کی ضرورت سمجھی گئی۔ نہ کوئی اصلاحات نافذ ہوئیں، نہ جمہوریت کا کوئی ادارہ پنپ سکا اور نہ ہی عوامی شعور کو نکھارنے والی کسی تحریک کو ابھرنے دیا گیا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ خطوط جن پر قائد اعظم پاکستان کی تعمیر اٹھانا چاہتے تھے۔ دھندلاتے چلے گئے اِسی طرح خود قائد کا تصور بھی دھندلاتا گیا۔ دولتانے، خان، کھوڑو وزارتیں بدلتے رہے۔ عوام کو بھیڑ بکریوں کا ریوڑ سمجھ کر ہنکاتے رہے۔ کتنے لوگ تھے جو ان حالات سے تنگ آکر انگریزی راج کو یاد کرنے لگے۔ اس سارے وقت میں بنگال کے جمہوری ذہن کو صرف frustration نصیب ہوسکی۔ مغربی پاکستان کے لوگ کتنے بے بس تھے۔ بنگال کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ مغربی پاکستان کے لیڈر اور فوج عوام کی مدد سے ہی انھیں حقِ خود ارادیت سے محروم کرکے ازسرِ نو ایک نوآبادی میں ڈھال رہے ہیں۔ اس وقت جو ردِّ عمل بھی اُدھر سے ہوا، حکومت نے اسے غداری کا نام دیا یا بغاوت سے موسوم کیا۔

ایوب خان جو جاگیردار طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا، مختلف نکتہ نگاہ رکھتے ہوتے بھی بنگال کے لیے کچھ زیادہ نہ کر سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ کہ خود وہ بھی مغربی پاکستان سے تعلق رکھتا تھا جس سے بنگال کی بدگمانیاں بجا طور پر بڑھ چکی تھیں۔ پھر خود فیلڈ مارشل کی ذات میں ایسی کمیاں تھیں جن کی بنا پر نہ تو وہ عوام کا اعتماد جیت سکا اور نہ وہ بصیرت پیدا کر سکا جو ایک قائد کے پاس اپنی قوم کا مزاج اسکی نفسیات اور اُمنگیں سمجھنے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ حکومت کی مسند تک مارشل لا کی سیڑھی لگا کر آیا تھا۔ اس کی حکومت کا بنیادی ستون فوج تھی۔ اگرچہ ۱۹۶۵ء تک بنگالی فوج کو باعثِ فخر سمجھتے تھے مگر جمہوریت کا سر قلم کرنے والے کسی ادارے یا فرد کو پسند بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ایوب خاں نے مشرقی پاکستان کی بدظنی دُور کرنے کے لیے جو اقدام کیے وہ مغربی پاکستان کے ذہن کو سامنے رکھ کر کیے۔ صنعت کی بھاری ترقیاں، بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر، بجٹ کا بڑا حصّہ اور پنجسالہ ترقیاتی منصوبے۔ بیرونی ممالک کی امداد بے شک مغربی پاکستان کے ذہن کے لیے دلکش ہو سکتے تھے، جمہوریت کے تشنہ اور اپنے حقِ خود ارادیّت سے محروم بنگال کا نیا متوسط طبقہ ان سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ نہ ایسی باتوں سے جمہوری اداروں کے عدم وجود کی تلافی ہو سکتی ہے۔ سڑکیں پُل ریلیں اور عمارتیں تو انگریز بہتر بناتا تھا۔ آزادی ان چیزوں کا نام ہوتا تو بے شک انگریزی دَور میں زیادہ آزادی تھی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس وقت بنگال کو یہ احساس شدّت سے ہوا کہ وہ دفاع کے بھاری اخراجات اٹھاتے ہوتے بھی دفاع سے محروم ہیں۔ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان میں تھا یا نہیں۔ جنگ کے بعد یہ بات عام کہی گئی کہ مشرقی پاکستان کا دفاع چین نے کیا ہے۔ یہ بات ہے تو پھر بنگال دفاع کے اخراجات کیوں اُٹھاتے؟ مگر انھیں یہ کون سمجھاتا کہ مغربی پاکستان والوں نے توبڑے چاؤ سے فوج کی ساری کارکردگی کا سہرا

"سبز پوشوں" کے سر باندھ دیا تھا۔ جو دوران جنگ جانے کہاں سے نمودار ہو گئے تھے بس پھر تو فوج کو کچھ کرنا ہی نہیں پڑا۔ انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے بھارتی جہازوں کو پھونکیں مار مار کر اڑا دیا۔ بم پکڑ پکڑ کر راوی میں ڈال دیتے اور رہے شرمن ٹینک تو انھیں چٹکیوں میں مسل کر بی آر بی نہر میں ڈبو دیا۔ گویا سپاہی نہیں لڑا تھا، فقیر درویش لڑے تھے۔ خواہ مخواہ حکومت نے تمغے اور ستارے بانٹے، قوم کا خرچہ بڑھایا۔ شہیدوں کی یادگاریں بنوائیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کی سوچ کے اس بڑے فرق سے نہ جانے کس کس نے فائدہ اٹھایا۔ اُدھر جو ردِعمل حکومت یا مغربی پاکستان کے غلط رویے پر ہوتا، اسے پاکستان کے خلاف ردِعمل کا نام اور رنگ دینے والے بھارت سے لے کر امریکہ تک پھیلے تھے

یہ حالات اور کشمکش تھی کہ جب پاکستان کے خلاف دو فریقوں نے ایک فیصلہ کیا۔ ان میں سے ایک فریق امریکہ تھا تو دوسرا مغربی پاکستان کا جاگیردار جتھہ اس فیصلے کی رُو سے اوّل ایوب خان کو اقتدار سے ہٹانا تھا دوسرے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنا۔ امریکہ کو ایوب خان کی خارجہ پالیسی بالخصوص چین کے ساتھ بڑھتے ہوتے تعلقات تیسری دنیا کے استحکام میں دلچسپی ایسی باتیں پسند نہیں تھیں اور پھر بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی مضبوط فوجی حیثیت۔ فوج کا جنگی کردار جس کا اندازہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہوا۔ عالمی سامراج کے سربراہ کو بھی ناگوار تھیں اور اس کے بالکوں کو بھی۔ کیونکہ انھیں اقتدار سے محروم ہوتے قریباً دس سال ہو چکے تھے۔ مگر فقط ایوب خان کو ہٹا دینے سے بات نہیں بنتی تھی کہ مشرقی پاکستان کے جمہوری اور عوامی تیور، وہاں سے سر نکالتا ہوا انقلابی ابھار دونوں کے لیے خطرے کا الارم تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۸ء میں دو باتیں ایسی ہوئیں جن سے امریکہ اور مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کی ملی بھگت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اوّل ایوب خان کے خلاف بغاوت مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب سے ہوئی۔ (پنجاب جو صرف وفاداریوں کا عادی

ہے۔ بغاوت اس کے خمیر ہی میں نہیں ہے) دوسرے مجیب الرحمان کو ایک بڑے لیڈر کی حیثیت سے مغربی پاکستان نے تسلیم کیا۔ ۱۹۶۹ء میں مذاکرات کی میز پر آنے سے پہلے مجیب بنگال کی کوئی بڑی سیاسی شخصیت نہ تھی۔ نہ ہی اس کے چھ نکات لوگوں میں مقبول تھے (بلکہ جیسے ہمارے وزیر اعظم نے بعد میں کہا وہ چھ نکات کو خود بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اس کے ذہن کی پیداوار نہ تھے) مجیب کسی بیرونی طاقت کا ایجنٹ تھا یا نہیں، امریکی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ خوب بنا۔ ہمارے ہاں کے جاگیرداروں نے بھی اسی کے ذریعے اپنا الو سیدھا کیا۔ پہلے اُسے اگرتلہ کیس سے نکال کر مذاکرات کی میز تک لاتے۔ پھر چھ نکات کی بنیاد پر انتخاب لڑنے کے لیے تیار کیا۔ یحییٰ خان کی حکومت بداندیش ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوف بھی بہت تھی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد اس کی حیثیت محض شطرنج کے مہروں کی تھی جنھیں حرکت میں لانے والے ہاتھ اور ذہن اور کسی کے تھے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء یعنی سقوطِ ڈھاکہ تک جتنی کارروائیاں ہوتی رہیں ان کے پیچھے جاگیردارانہ سازشی ذہن کام کرتا رہا۔ اس طویل کھیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ عوامی لیگ کی جیت کے باوجود یہ بات یقینی نہیں تھی کہ بنگال پاکستان سے علیحدہ ہو جاتے گا۔ اوّل تو چھ نکات میں علیحدہ ہو جانے کی بات واضح نہ تھی۔ دوسرے عوامی لیگ کو صرف ۴۷ فیصد ووٹ ملے تھے۔ باقی سب لوگ دوسری سوچ رکھنے والے تھے۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی کہ اگر مجیب علیحدگی کا اعلان بھی کرتا تو بنگالی اکثریت کی مخالفت پر کرتا۔ جس کے نتیجہ میں بہت بڑی بغاوت مجیب کے خلاف خود بنگال سے اُٹھ کھڑی ہوتی۔ اس بات کا اندازہ سب کو تھا۔ یحییٰ حکومت کو، مغربی پاکستان کے لیڈروں کو اور سامراجی قوتوں کو بھی۔ بنگال کو واقعی پاکستان سے بغاوت پر مجبور کرنے کے لیے کوئی اور ترکیب چاہیے تھی۔ وہ کارگر ترکیب نیشنل اسمبلی کا

اجلاس ملتوی کرانے میں نکل آئی۔ اجلاس ملتوی کرانے کا سنتے ہی سارا بنگال بھڑک اُٹھا۔ اُنھیں یقین ہوگیا کہ مغربی پاکستان ان کے ساتھ چالیں چل رہا ہے اور ہمیشہ کی طرح بنگال کا حق اسے حاصل ہونے نہیں دے گا۔ یہ صورتِ حال کئی ہفتے تک رکھی گئی۔ حتیٰ کہ سارے صوبے میں ایک متبادل قسم کی حکومت قائم ہونے لگی۔ تب جاکر فوجی کارروائی عمل میں لائی گئی۔ یہ فوجی کارروائی جیسے کہ حالات نے ثابت کیا ہرگز امن قائم کرنے کے لیے یا ملک بچانے کے لیے یا باغیوں کو سزا دینے کے لیے نہیں کی گئی تھی بلکہ فوج کے خلاف بنگال کی نفرت بڑھانے کے لیے، دنیا کی رائے عامہ بنگلہ دیش کے حق میں ہموار کرنے کے لیے اور بنگال کو علیٰحدگی پر مجبور کرنے اور پھر اس کی علیحدگی کا مکمل جواز پیدا کرنے کی خاطر سے ہوئی تھی۔ یہ سارے مقاصد واقعی حاصل ہو گئے۔ دنیا کی رائے خود پاکستان کے خلاف ہوگئی، فوج سے ان بنگالیوں کو بھی نفرت ہوگئی جو کٹر پاکستانی تھے۔ عوامی لیگ اور دوسرے لوگوں نے بھارت جاکر بھارت سے باقاعدہ مدد مانگی اور اس کی کھلی مداخلت کے لیے میدان ہموار کیا۔

فوجی کارروائی اور سقوطِ ڈھاکہ کے درمیان آٹھ ماہ کا عرصہ ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہے۔ اس دوران سیاسی حل نکال لیا جاتا تو خواہ مشرقی پاکستان علیٰحدہ ہو جاتا مگر فوج کی شکست و سقوطِ ڈھاکہ کے المیے نہ ہوتے۔ بھارت کو فاتح اور ہیرو بننے کا موقع نہ ملتا۔ یہ خواہش پاکستان کے عام آدمی کی ہیں۔ مگر یحییٰ خان کے مشیروں کے حساب یہ باتیں بھی ضروری تھیں کہ فوج ابھی سالم شکل میں موجود تھی۔ اس دوران مزید فوج مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان بھیجی گئی اور انتظار کیا گیا حتیٰ کہ بھارت نے برسات کا موسم نکال کر روس سے جنگی معاہدہ کر کے اور امریکہ کی اشیر باد لے کر حملہ کیا۔ یہ جنگ فوج کو توڑنے کے لیے تھی۔ چنانچہ فوج ٹوٹ گئی، دسمبر کا مہینہ نصف ہوتے ہوتے فوج بھی ٹوٹ گئی۔ ملک بھی ٹوٹ گیا۔ فوج کا وقار مغربی محاذ پر بھی چکنا چور ہوا۔ اس کا بھی اہتمام کیا گیا تھا

بہرکیف اب کوئی حریف باقی نہیں تھا۔ مغربی پاکستان میں جاگیردار قوت کی نشاطِ ثانیہ کے راستے کھُل گئے۔ آج نتیجے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اِس وقت ہمارے لیے یہ صورتِ حال اِتنی مشکل نہ ہوتی اگر ملک میں خاصا بڑا صنعتی نظام قائم ہو چکا ہوتا۔ یہاں بھی ابنارمل بات یہ ہوئی کہ صنعتی قوت کسی نظام میں ڈھل کر پھر پرولتاریہ قوت بنانے کی بجائے بائیس خاندانوں کی قوت بن گئی (جسے توڑنا مشکل کام نہیں تھا) اس کی وجہ یہ تھی ملک میں جاگیرداری نظام کا قائم رہنا ہے۔ ایوب خان خود جاگیردار نہ تھا اس لیے اس نے صنعتکاروں کی سرپرستی کر کے انھیں جاگیرداروں کے مقابلے میں توانا کیا اور خود بھی اُس برادری کا ایک ممبر بن گیا۔

اس طرح ۱۹۷۱ء تک پاکستان کے سیاہ وسفید کی مالک تین قوتیں رہیں۔ جاگیردار، فوج اور صنعت کار۔ یہ تینوں طاقتیں مل کر عوام کے خلاف مصروفِ کار رہیں۔ انھیں ایک قوت بن کر اُبھرنے سے دباتی رہیں بالآخر آپس میں متصادم ہو گئیں۔ اس گھمسان کے معرکے کو جس نے سر کر لیا وہ جاگیردار ہے۔ ظالم سازشی اور خطرناک لجان لارنس کے جانشین نے ملک کو ٹکڑے کر دیا۔ بنگال کو کچل ڈالا۔ فوج کو ریزہ ریزہ کر دیا اور صنعت کار کو بھی پچھاڑ لیا۔ اب اطمینان سے بیٹھ کر پیپلز پارٹی کے انقلابی اور عوامی پروگرام کے ساتھ سانپ والا قصّہ کر رہا ہے۔ ڈس بھی رہا ہے اور پیٹ میں بھی لے رہا ہے۔

پاکستان توڑنے والے غازیوں کی کہانی آپ نے سنی اب ان کے چند مددگاروں کی بات بھی سُن لیجئے۔ ان میں ایک تو مُلّا ہے جو پہلے قیامِ پاکستان کا شدید مخالف تھا یہ سوچ کر کہ پاکستان بنے گا تو لوگ اسلام کو سمجھنے کی کوشش بھی کریں گے۔ تب اس کے اپنے ایجاد کردہ اسلام اور شریعتوں کا کہاں ٹھکانا ہو گا۔ جمہوریت ہو گی تو وہ لوگ کہاں رہیں گے جن کے ساتھ ملی بھگت کر کے وہ لوگوں پہ کفر شرک کے فتوے لگایا کرتا تھا۔ مگر جب پاکستان بنا تو یہ مُلّا

مسجد کی محراب تلے سے نکل کر سیاست کے ایوانوں میں آبیٹھا اور لگا عرب امپریلزم کے خواب دیکھنے۔ یہ گروہ خواہ جماعت سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور جمیعت سے، مال دار اور طاقت ور لوگوں کا حاشیہ بردار رہا۔ غریب لوگوں سے اُس نے ہمیشہ نفرت کی نئی سوچ کو قتل کرتا رہا اور نئے ذہنوں کی پامالی کے سامان بھی کرتا رہا۔ آج ہمارے ہاں اس کی مثال جماعتِ اسلامی کی ہے جو ملک کے ہارونوں اور قزلباشوں کا تحفظ کرتی ہے مگر محنت کشوں کے حقوق کی ہر بات کو اسلام کے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔ دوسرا گروہ ان نام نہاد ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ یہ بھی پاکستان کے شدید مخالف تھے۔ مگر جب پاکستان بنا تو ان میں سے کتنے تو مختلف قسم کے لبادے اوڑھ کر اور کئی بے لباس اور بے نقاب یہاں چلے آئے یہ لوگ مہاجر نہیں تھے نہ ہی پناہ گیر تھے۔ یہ تو جاسوسوں کی ایسی کھیپ تھی جو کھلم کھلا اپنے بھارتی اڈوں سے رابطہ رکھتی رہی۔ ان لوگوں نے پاکستان سے اُبھرنے والی ترقی پسند تحریکوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ انقلاب کی راہیں روکنے میں یہ لوگ مُلا یا جاگیردار سے کم نہیں رہے۔ انہی لوگوں نے بڑی حد تک پاکستان کے نئے ادیب اور شاعر کو یہاں کے لوگوں کی زندگی کا ترجمان نہیں بننے دیا۔ یہ لوگ چائے کی چسکیاں لیتے لیتے انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک نظم یا افسانہ لکھ کر نئے سویرے کا طلوع دیکھنے لگتے ہیں۔ قالینوں اور صوفوں سے سجے ہوئے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر کسانوں مزدوروں کے دکھ درد کی باتیں کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وُہ کسان مزدور روس کے رہنے والے ہوں۔ کچھ رعایت بھارتی غریبوں کے ساتھ بھی برتی جاسکتی ہے۔ پاکستان کے غریب چونکہ مسلمان ہیں اس لیے وہ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں۔ دیہاتی کلچر سے بھی انھیں بڑا اُنس ہوتا ہے۔ اس لیے کارنس پہ بوڑھے کسان کا مجسمہ سجا لیتے ہیں۔ گھر کی دیواروں کے ساتھ چنگیریں لٹکاتے ہیں اور گیہوں کی بالیاں گلدانوں میں خود تو پائپ پیتے ہیں مگر کونے کی میز پر

حقے کا ماڈل بڑے شوق سے رکھتے ہیں۔ کھیت پہ روٹی پہنچاتی یا پنگھٹ سے پانی بھر کر لاتی ہوئی دوشیزہ کی تصویر مل جاتے تو کیا بات ہے۔ تصور کے ساتھ شب خوابی کا کمرہ بھی نکھر جاتا ہے۔ پاکستان میں چوتھائی صدی سے یہ لوگ کلچر کی کاشت میں لگے ہیں۔ چونکہ اس ملک کے عوام اگیری کلچر کے ساتھ ساتھ مذہب کا پیچھا نہیں چھوڑتے اس لیے وہ سب سامراج ہیں جو کلچر کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ کلچر بیچارہ یہاں بہت کمزور ہے۔ اس کمزور کلچر کی صحت کے لیے جو پھل فروٹ یہ اگاتے ہیں اس کے فارمولے تو ماسکو سے منگواتے ہیں۔ پنیری بھارت سے آتی ہے اور کھاد خود اسی ملک کے چند مقامات مثلاً منجوداڑو اور ہڑپہ کے کھنڈر کھود کر نکالی جاتی ہے۔ اس قسم کے انقلابی جاگیرداروں کے بڑے کام کی چیز ہوتے ہیں کہ ان کا لایا ہوا انقلاب کبھی آتا ہی نہیں۔

آخری وار کرنے والا بروٹس مہاجروں میں چھپ کر آیا تھا۔ یہ ہندوستان کے ایسے علاقوں سے چلا تھا جہاں کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے۔ یا ایسے لوگوں میں سے تھا جو کانگرس کے بڑے مخلص کارکن رہے تھے۔ یہ آدمی پاکستان آنے سے پہلے تقسیم ہو چکا تھا۔ اپنا آدھا پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ آدھا پاکستان لایا تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک یہ متضاد وفاداریوں کی سرحد پر کھڑا ہے۔ چونکہ تعلقہ داروں کی چھاؤں میں پلا ہے اس لیے یہاں کی اُونچی کرسیوں پر اپنا حق سمجھتا ہے۔ صوبوں کو چھوڑ کر اکثر اس نے مرکز پر قبضہ کیا۔ اس قسم کے لوگ ہندو اکثریت کے علاقوں سے آتے ہیں۔ احساسِ کمتری ساتھ لائے ہیں۔ کسی زمین سے اپنا رشتہ نہیں جوڑتے۔ زبان اور تہذیب کی برتری میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی تہذیب ان کی طرزِ معاشرت ہے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کی طرزِ زندگی سے مختلف ہے۔ ان لوگوں نے نہ صرف اپنی زبان اور طور طریقوں کو مقامی زبانوں اور رہن سہن کے طریقوں سے فائق سمجھا، بلکہ ہر مقامی چیز کو کمتر قرار دے کر اس سے پرہیز برتا۔ صوبائی اور لسانی تعصّب کی ہوا اس

وجہ سے چلی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ نقصان اُردو زبان کی حیثیت کو پہنچا۔ اردو کو قومی زبان کا جو منصب پاکستان بنتے ہی ملا تھا اسے بہت کچھ نقصان اہلِ زبان کے غلط رویے کی وجہ سے پہنچا۔ پہلے بنگال میں پھر سندھ میں اردو کے خلاف جو شدید ردِعمل ہوا اس کی ذمّہ داری عام طور پر ہندوؤں اور بھارت پر ڈالی جاتی ہے۔ یہ ہماری عادت ہے کہ حقائق کی پردہ داری کرنے کے لیے بھارت کا نام بہت لگاتے ہیں۔ حالانکہ بھارت خود ہماری غلطیوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ دراصل اردو زبان سے بیزاری پیدا کرانے کی ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو اپنے آپ کو اہل زبان سمجھتے ہیں۔ انھیں لوگوں کے کٹرپن نے "پاکستانی اردو" کی ترقی کا راستہ روکا۔ ہندوستان ان کا آئیڈیل بھی رہا اور مرکز بھی۔ پاکستان میں رہ کر بھی یہ لوگ اپنے آپ کو ہندوستانی کلچر کی علامت بناتے رکھنا چاہتے ہیں۔ چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد بھی ان لوگوں نے اس زمین سے ناطہ نہیں جوڑا۔ حد یہ کہ اپنی ہندوستانی نسبتیں تک قائم رکھیں۔ اپنے آپ کو لکھنوی مراد آبادی اور ملیح آبادی کہلوا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کراچی شہر کو اپنا مرکز بنا کر بھی ہندوستان کے شہروں اور قصبوں سے اپنے ذہنی رشتے کم نہیں کیے۔ دراصل ان لوگوں کی نقل مکانی پاکستان کی زمین سے رشتہ قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس نئے ملک میں اچھے موقعوں کی تلاش تھی۔

---

۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء

کیا کیا مجھے یاد آیا

سرد، اداس اور خاموش سی شام ہے۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں پیلی پیلی ہو کر دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ جیل روڈ سیاہ ناگن کی طرح لیٹی کچھ زیادہ ہی سنسان اور چوڑی لگ رہی ہے۔ فضا ابھی تک آنسو گیس، بارود اور خون کی بو سے بوجھل ہے، حالانکہ یہ انتہائی غیر عوامی علاقہ ہے۔ یہاں سے تو ہنگاموں کا گزر بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ آنسو گیس، لاٹھی چارج، گولیوں کے دھوم دھڑکے اور خون کی ہولیاں تو عوام کا کھیل ہیں، انہی کے علاقوں میں یہ کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ تنگ و تاریک گلیوں، چھوٹے چھوٹے، گندے گندے، پرانے پرانے اور ایک دوسرے کے اوپر لدے ہوئے مکانوں والے عوامی علاقے جن میں موچی دروازہ ہمیشہ کسی زندہ توانا اور جواں دل کی طرح دھڑکتا رہتا ہے۔ یہ کوٹھیوں سے سجے سجائے فیشن ایبل، خاموش ویرانے ان خونی کھیلوں سے کیا آشنا ہوں گے۔ یہاں تو ہر طرف سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی ہے۔ دنیا میں اگر امیر ہی ہوتے، غریب نہ ہوتے تو یہ دنیا اچھی خاصی دارالامان بن کر رہ جاتی۔ نہ کبھی جنگ ہوتی نہ صلح ہوتی۔ نہ معاہدے ہوتے، نہ معاہدے ٹوٹتے نہ نعرے لگتے، نہ گولیاں چلتیں، نہ خون بہتا نہ جیلیں بھرتیں۔ علاوہ اور صفات کے امیروں میں یہ خوبی بھی ہے کہ بڑے صلح پسند اور امن جو ہوتے ہیں۔ یہی دیکھ لو پچھلے پندرہ دنوں سے لاہور کے دل میں جو کہرام مچے ہیں ان کی ہلکی سی بو ہی یہاں تک پہنچ پائی ہے وہ بھی ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی یہاں آنکلی ہے۔

ہوا بھی عجیب آزاد شے ہے۔ اس کے دامن میں کبھی شمیم گل ہے تو کبھی زلف جاناں کی مہک۔ کبھی غبارِ کوچہ دلبراں ہے تو کبھی بوئے خونِ عاشقاں اور یہ ہے کہ ان سوغاتوں کو جہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔

سڑک دُور دور تک سنسان پڑی ہے۔ بس سٹاپ پر میرے علاوہ دو نفوس اور بھی کھڑے ہیں۔ ایک بوڑھی عورت جس نے بسواری رنگ کی فلالین کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ ایک اس کا جوان مگر مریض سا بیٹا، جس نے چارخانے کا کھیس اپنے گرد لپیٹ رکھا ہے۔ سارے ماحول پر سناٹا مسلط ہے۔ بس تو خیر ہمیشہ ہی بڑے ناز نخروں سے آتی ہے۔ کوئی اور سواری بھی آتی جاتی دکھائی نہیں دے رہی۔ اتنی دیر میں صرف ایک کار گلبرگ کی طرف کو نکلی ہے۔ اس میں کئی حسین لڑکیاں اور کئی بندر سے لڑکے بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ سفید رنگ کی اوپل تھی جسے ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ لڑکی نے گہرے اودے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کھلے صندلی شانوں پر ریشمی زلفیں لہرا رہی تھیں۔ یہ سب لڑکے لڑکیاں مل کر کیسے ہنستے گاتے زندگی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ یہ امیروں کی اولادیں ہیں اور ایک وہ غریبوں کی اولادیں کہ کہیں نیلے گنبد پہ تو کہیں اسمبلی چیمبر کے سامنے بنگلہ دیش پر ہاہا کار مچاتی اس وقت بھی لاٹھیاں اور گولیاں کھا رہی ہوں گی۔ میں نے خاصا موٹا کوٹ پہن رکھا ہے مگر سردی پھر بھی لگ رہی ہے۔ کار چلانے والی لڑکی کی ساڑھی کا رنگ اور کھلے شانے دیکھ کر اور بھی کپکپی چھوٹ گئی ہے۔ میری ہی نہیں، پاس کھڑی ہوئی بوڑھی اماں نے بھی جھرجھری سی لے کر اپنی چادر کی بکل سمیٹی اور بولیں "توبہ ہے ان دھان پان سی جانوں کو سردی بھی نہیں لگتی کیا؟"

"کاروں میں سردی کہاں اماں! لڑکے نے جواب دینا ضروری سمجھا۔

"پر، وہ اپنی کریمن کا لونڈا تو ٹیکسی چلاتے وقت بھی خوب بڑا سا کوٹ ڈالے رہتا ہے!"

"ٹیکسی کی بات اور ہے اماں! امیروں کی کاریں ایر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں۔"

"کیا ہوتی ہیں؟"

"سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈی۔ ان کے گھر بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"وہ کیسے بھلا!؟" اماں نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"یہ سب بجلی کے کھیل ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو میاں، دولت کے کھیل کہو"۔ بڑھیا نے پھیلی ہوئی آنکھیں سکیڑ کر ٹھنڈی اور گہری سانس کھینچی جو اس کے پھیپھڑوں میں اترنے کے بجائے گلے میں اٹک گئی۔ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ ماں بیٹے کی گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ بہت دیر تک کھانسنے اور تھوکنے کے بعد اس نے اپنا چہرہ ناک تک چادر میں چھپا کر چپ سادھ لی۔ لڑکا بھی چپ چاپ بس کی راہ تکنے لگا۔

شام بالکل ہی دھواں دھار ہو گئی۔ اُدھر پرلی طرف مٹی سے لپی ہوئی جیل کی اُونچی اُونچی دیواروں پہ بجلی کے بلب جلنے لگے تھے۔ فاصلے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے یہ بلب کسی یرقان زدہ کی آنکھیں معلوم ہو رہے تھے۔ جیل کے اندھیرے اور بجلی کے قمقمے، جیسے مُردہ کفن پھاڑ کر ہنسنے لگے۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر بیٹھے ہوئے پان والے بابے نے بھی اپنی چھابڑی میں رکھی ہوئی کُپی روشن کر لی ہے۔ دائیں بائیں بانکی بانکی کوٹھیوں میں بھی کچھ قمقمے جلنے لگے ہیں مگر اندھیرا ہے کہ ہر سو اُمنڈا چلا آ رہا ہے۔ یہ رات کا آغاز ہے۔ اندھیرے کا عمل بھی کتنا بھرپور ہوتا ہے۔ جوں جوں رات آگے بڑھے گی۔ اندھیرے کا ناگ اپنا پھن اور پھیلائے گا۔ آسمان سے زمین تک بہتے اور پھیلتے ہوئے اندھیرے کے سیلاب میں یہ چھوٹی موٹی روشنیاں کتنی بے تکی ہیں اور کتنی بدنما جیسے برص کے داغ جیسے کوڑھی کے

زخم - خدا کی پناہ! کیسی فضول باتیں دماغ میں آتی ہیں۔ روشنی اور اندھیرے کے لیے کوئی اچھی بات بھی تو سوچی جا سکتی ہے۔ اچھے لوگوں نے اچھی باتیں بھی سوچی تھیں۔ کنفیوشس نے کہا تھا کہ دنیا جب اندھیروں میں گھر جائے تو اندھیروں میں ٹھوکریں کھا کھا کر کوسنے دینے کی بجائے بہتر ہے کہ روشنی کی چھوٹی سی شمع روشن کر لی جائے۔ اقبالؒ نے اندھیری شب میں قافلے سے بچھڑ جانے والوں کو کسی شعلہ نوا کی قندیل جلانے کا حوصلہ دیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے بھی ایک زمانے میں گھنے اندھیرے اور دور سویرے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے دل کے دیپ جلانے کا اصول بتایا تھا اور دیر و حرم کے بجھتے چراغوں سے گھبرا کر زہرا نگاہ بھی تو پکاری تھی۔ دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے!- یہ سب لوگ بہت اچھے لوگ تھے مگر بُرے وقتوں سے زیادہ واقف نہ تھے۔ انھوں نے اندھیرا ضرور دیکھا مگر وہ وقت نہیں دیکھا جب اندھیرے کا عمل طوفانِ نوح بن جائے۔ جب آسمان سے اندھیرا برسے۔ زمین سے اندھیرا اُبلے، اندھیرے کا سیلاب مشرق سے بڑھے۔ اندھیرے کے ریلے مغرب سے اُمڈیں۔ جب شش جہت پر اندھیرے کی عمل داری ہو جائے۔ جب تن کی دنیا اور من کی دنیا سب ظلمات میں ڈوب جائیں۔ شمعیں، قندیلیں اور چراغ برفانی آنکھیں سی لگنے لگیں۔ دل کا دیپ بھی جلے تو دھواں ہی پھیلے ایسے اندھیرے جن کا مداوا ایک آفتابِ تازہ سے کم کسی چیز سے ممکن نہ ہو۔

گھرر گھرر گھوں! بس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میری سوچوں کا سلسلہ بکھر جاتا ہے اور میں دل و دماغ کی سب قوتوں کو کام میں لا کر بس کے دروازے میں اندر گھس کر قدم جما لینے کے لیے تیار ہو جاتی ہوں۔ لدی پھدی انسانوں کے بوجھ سے تھکی ہاری سی بس دھیرے دھیرے چلی آ رہی ہے مگر جتنے لوگ اس کی سیٹوں پر بیٹھے ہیں اس سے دُگنے چھت سے لٹک رہے ہیں اور اس سے بھی تگنے دروازوں کے باہر معلق ہیں اور پھر یہ بہتے گھسیٹ گھسیٹ کر چلتی ہوئی بس جب سٹاپ کے قریب آتی ہے تو ایک دم فراٹا بھرتی ہے اور اس

خوف سے رُکے بغیر آگے نکل جاتی ہے کہ کہیں کسی نئی سواری کا آخری تنکا اس کی کمر نہ توڑ دے۔ پُورے ایک گھنٹے کے وقفے سے بس آئے گی تو یہی ہوگا۔ سال بھر میں بسوں کی تعداد کتنی کم ہوگئی ہے۔ مَیں نے سوچا۔

"عوامی حکومت کو کم از کم بسوں کا تو کچھ انتظام کرنا چاہیے"۔ بڑھیا نے پھر زبان کھولی۔

"عوامی حکومت کیا کرے باہر سے نئی بسیں آ نہیں سکتیں۔ جو خراب ہو جاتی ہیں ان کی مرمت نہیں ہو پاتی"۔ بیٹے نے حسب سابق وضاحت کی۔

"مرمت کیوں نہیں ہو پاتی؟ آخر ورکشاپ کس لیے ہیں؟"

"ورکشاپ کی بات نہیں اماں! جب سے نئی حکومت آئی ہے لوگ زیادہ بے ایمان ہوگئے ہیں، کام نہیں کرتے، پُرزے الگ بیچ کھاتے ہیں"۔

"ہوں"۔ بڑھیا نے اس لمبی ہوں کے بعد چپ سادھ لی۔

ایک بس نکل گئی۔ دوسری کا پتہ نہیں کب آئے۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا ہے۔ سردی بھی بڑھ گئی ہے۔ جانے کب تک اگلی بس کا انتظار کرنا پڑے۔ ہم بھی کیا صابر لوگ ہیں۔ اس دَور میں جب انسان کے پاس محبوب تک کا انتظار کرنے کی فرصت نہیں۔ ہم زندگی بھر کھڑے بس کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ احساس تھک جاتا ہے مگر آنکھیں نہیں تھکتیں۔ وقت کٹنے کے لیے مَیں نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھا چند کوٹھیاں نئی بن گئی تھیں، چند اور بن رہی تھیں۔ باقی سب کچھ ویسے ہی تھا۔ زندگی کا رنگ بھی ویسا ہی ہے۔ اکثر چیزیں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ کچھ بڑھ گئی ہیں۔ کچھ پہلے سے کم ہوگئی ہیں۔ دل ناداں کا حال بھی یونہی سا ہے۔ بے قراریاں کم ہوئیں تو مایوسیاں بڑھ گئیں۔

یہ بارہ مہینے اُدھر کی بات ہے۔ جب میں بس کے انتظار میں عین اسی جگہ کھڑی تھی۔ بڑے ہی گمبھیر دن تھے وہ۔ جنگ دونوں محاذوں پر جاری تھی۔ شہر بھنبھوڑ لُٹ رہا تھا اور قوم کی کسی سولہ سنگھار کیے حجلۂ عروسی سجائے بنوں کا

انتظار کر رہی تھی اور عوام حسب معمول حالات سے بے خبر خوش فہمیوں اور خوش اعتقادیوں میں مبتلا ترانے گا رہے تھے۔ اصلیت جاننے کی جتنی ضرورت تھی اتنی ہی ڈھول ریڈیو اور ٹیلیویژن ہمارے کانوں اور آنکھوں میں جھونک رہے تھے۔ آکاش وانی، بی بی سی، ریڈیو ماسکو، وائس آف امریکہ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ جانے کون سچا ہے کون جھوٹا ہے۔ حقیقت کیا ہے۔ سچ کیا ہے۔ دل بے چین ہونے لگتا ہے۔ آکاش وانی کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ سچ ہی بول رہی ہو!۔ دل ہول جاتا۔ میں ایسے ہی کرب کے ایک لمحے میں گھر سے نکل پڑی اور بھارتی بمباروں سے آنکھ مچولی کھیلتی ڈاکٹر کنیز یوسف کے پاس پہنچی۔ ان کی زبان سے میں نے ہمیشہ سچ ہی سُنا تھا۔ سچ جاننے کے لیے اس روز بھی ان کے پاس آئی تھی۔ خلاف توقع وہ اس ساری گھن گرج سے بے نیاز اپنے گھر کے مشرقی برآمدے میں پاکستان کا بڑا سا نقشہ پھیلائے بڑی محویت سے بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے کی طمانیت نے مجھے ڈھارس دی۔ حالات ضرور اچھے ہی ہوں گے اور سچ مچ انھوں نے بتایا کہ آکاش وانی سخت جھوٹی ہے۔ بھارتی فوج کہیں بھی آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ جلیسور ابھی تک ہماری فوج کے قبضے میں ہے اور پھر انھوں نے مغربی محاذ پر نگاہ ڈالی" دعا کرو سیز فائر ہونے سے پہلے ہماری فوج کٹھوعہ روڈ توڑنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ رہا کشمیر"۔ انھوں نے نقشے پر پنسل سے نشان لگایا۔" دو دن اور سیز فائر نہ ہوئی تو کشمیر فتح ہو جائے گا"۔۔۔ کشمیر فتح ہو جائے گا؟ میرے دل میں جیسے کسی نے خوشی کا شادیانہ بجایا۔ اس روز ریڈیو کے نغمے بھی اچھے لگے۔ اتفاق سے بس بھی جلدی ہی مل گئی۔ پان والے بابے کو بھی یہی ایک بات بتائی۔ اندھیرے اجالے کے فلسفے پر کوئی غور نہ کیا میانی صاحب کی طرف بڑھتے ہوئے شہیدوں کے جنازے دیکھ کر مسلمانوں کے خون کی ارزانی کا سبب نہیں سوچا اور نہ ہی پُرانی عادت کے مطابق پُرانی قبروں کے کتبے پڑھے۔ راستے بھر ایک ہی دعا مانگی کہ اللہ میاں کٹھوعہ روڈ جلدی ٹوٹ جائے، اللہ میاں

ابھی سیز فائر نہ ہو۔ اللہ میاں کشمیر فتح ہو جائے۔ میرا تجھ سے وعدہ ہے اس کے بعد میں کوئی اور دُعا تجھ سے نہ مانگوں گی۔ کچھ بھی نہ مانگوں گی اللہ میاں! ۔ اس روز بمباری بہت شدید رہی۔ دشمن کے جہاز کبھی اُونچی کبھی نیچی پرواز کرتے شہر میں داخل ہوتے۔ اپنی مرضی کے نشانوں پر بم برساتے اور چلے جاتے۔ رات بھر داتا کی نگری پر آگ برسی ۔ شہر کے در و دیوار کانپے مگر میرا دل قائم رہا۔ اسے سہارے کے لیے ایک تماثل گئی تھی... کٹھوعہ روڈ ٹوٹ جائے۔ کشمیر فتح ہو جائے۔ ابھی کچھ دن سیز فائر نہ ہو ۔ مشرقی پاکستان کا دفاع قائم تھا۔ دو دن گزر گئے۔ سیز فائر نہ ہوئی ۔ کٹھوعہ روڈ نہ ٹوٹی۔ مشرقی پاکستان کا دفاع بھی نہیں ٹوٹا تھا مگر اور سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ڈھاکہ کا سقوط ہو چکا تھا۔ پاکستان کا پرچم اپنی ہی سرزمین پر سرنگوں ہو گیا تھا۔ پاک فوج ۔ ناقابلِ تسخیر فوج ہتھیار ڈال چکی تھی۔ کٹھوعہ روڈ تو نہ ٹوٹی تھی ۔ ایک نظریہ فنا ہو گیا تھا۔ ایک عظیم تاریخ کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ کروڑوں لوگوں کا مستقبل، آنے والی نسلوں کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا۔

اس روز بھی میں اسی جگہ کھڑی تھی۔ وہ بھی ایک سرد، ویران اور اُجڑی ہوئی شام تھی۔ گہرا سیاہ اندھیرا ہر سو امنڈا چلا آ رہا تھا ۔ بلیک آؤٹ ابھی تک باقی تھا۔ نہ ہوتا تو بھی کوئی روشنی اب اس اندھیرے کے عمل کو روک نہیں سکتی تھی۔ دشمن کے جہاز اس وقت بھی دندناتے پھر رہے تھے۔ جھپٹ جھپٹ کر نشانے لگا رہے تھے۔ جیسے گدھ کسی لاوارث لاش کو نوچ رہے ہوں۔ کوئی مدافعت نہیں، کوئی مقابلہ نہیں۔ یہ بلیک آؤٹ کا ڈھونگ بھی خوب ہے۔ بھلا دن کی روشنی میں انہیں کون روکتا ٹوکتا ہے۔ میں نے یہ بات کسی سے کرنا چاہی مگر آس پاس کوئی نہ تھا۔ پائیلیٹ نے بہت نیچی پرواز کر کے گولیوں کی باڑھ ماری مگر میں نے کسی اوٹ کی ضرورت نہ سمجھی۔ زندگی بے معنی ہو چکی ہے۔ اس کا مٹ جانا اس کے قائم رہنے سے بہتر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میرے نزدیک ان تباہ کن طیاروں کی حیثیت چیلوں کوّوں سے زیادہ نہ تھی۔

زندگی اور موت کا فاصلہ مٹ چکا تھا۔ بے مقصد زندگی۔ بے وقر موت ع

حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری!

پان والا بابا اس روز بہت دکھی تھا۔ اپنا خوانچہ اٹھائے میرے پاس چلا آیا۔ اس کے خوانچے میں پان کی بجائے کتھا لگے ہُوئے موتیے کے چند پتے پڑے تھے۔ اس نے چھابڑی ایک طرف ڈال دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "بیٹیا یہ سب کیا ہوگیا؟ یہ کیسے ہوگیا؟ ڈھاکہ میں بھارتی فوج کیسے داخل ہوئی؟ ہائے بیٹیا آدھا پاکستان بھارت میں چلا گیا اور ہم یہاں زندہ بیٹھے رہے"! بابا روتا رہا۔ میں بے حس و حرکت کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس کی بے نور سی آنکھوں سے گاڑھے گاڑھے سے آنسو بہہ کر اُس کی میلی میلی سی ڈاڑھی میں جذب ہوتے رہے۔ جانے وہ کب تک روتا رہتا کہ اچانک فضا میں خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی اور اتنا شدید دھماکہ ہُوا کہ زمین میرے پیروں کے نیچے کانپنے لگی۔ کوئی بہت بڑا بم قریب ہی پھٹا تھا۔ بابے نے آنسو پونچھ ڈالے اور فکرمندی سے بولا۔ "اس طرف کیا حال ہے بٹیا؟ کشمیر اور پنجاب میں تو ہماری فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں نا؟ گھٹو عہ روو ڈے؟"

"نہیں بابا تم دعا مانگو جلدی سے سیز فائر ہو جائے۔ اب اور کچھ نہیں ٹوٹے گا۔"

"پر ایک بات تو بتاؤ بیٹیا۔"

"مجھ سے کچھ نہ پوچھو بابا، مَیں کچھ نہیں جانتی۔"

میں جانتی تھی وہ کیا پوچھنا چاہتا تھا۔ اسّی برس کے اس بوڑھے کا سوال سننے کی مجھ میں تاب تھی نہ میرے پاس اس کا جواب تھا۔ میرے پاس تو اپنے چھ سال کے بچّے کے سوال کا جواب بھی نہ تھا۔ جس نے اس روز کی خبریں سُن کر مجھ سے پوچھا تھا۔ "امی آپ تو کہتی تھیں۔ ہم لوگ بہت بہادر ہیں پھر ہم کیسے ہار گئے"۔ بوڑھے کا سوال ماضی کا سوال ہے اور اس بچّے کا

سوال مستقبل کا سوال ہے۔ میں ان دونوں سوالوں کے درمیان لاجواب ہوں۔ میری ساری نسل لاجواب ہے۔ ہم نے ان دونوں نسلوں کا زیاں کیا ہے۔ یہ ملک اس نسل کی امانت تھا جس کا نمائندہ یہ بوڑھا ہے اور اس نسل کی وراثت تھا جس کا نمائندہ یہ بچّہ ہے۔ میں خود اس نسل کی نمائندہ ہوں جس نے یہ امانت، یہ وراثت کھو دی ہے، گنوا دی ہے۔ بوڑھا دکھی ہے، بچّہ حیران ہے اور میں مجرم ہوں — ماضی کی مجرم، مستقبل کی مجرم۔ میں اور میری ساری نسل مجرم ہے!!

اس کے بعد یہ تیسری شام تھی کہ میں اسی جگہ کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ روشنیاں یوں جل رہی تھیں جیسے مرگ والے گھر میں پہلی بار چولہا سلگایا گیا ہو۔ میں نے سوچنا چاہا — دھیرے دھیرے اپنی زخمی سوچوں سے کرچیاں نکالنے کی کوشش کی — اب یہ ملک آدھا رہ گیا ہے — آدھا پاکستان! کیسی منحوس بات ہے! — ایسی کئی نحوستیں پہلے بھی تھیں۔ آدھا کشمیر۔ آدھا پنجاب۔ آدھا بنگال اور اب آدھا پاکستان۔ یہ شکست بہت بڑی ہے لیکن آخری تو نہیں۔ شاید شیشوں کو مسیحا مل ہی جائے۔ یہ آدھا ملک، آدھی قوم بھی کچھ کم تو نہیں۔ قوموں پر بُرے وقت بھی آتے ہیں۔ ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ جرمنی، فرانس، جاپان آج کی عظیم قومیں ہیں۔ یہ اسی صدی میں کیسی خوفناک شکست دیکھ چکی ہیں۔ ہماری یہ شکست اگر عبرت بن جائے، اس بات سے اگر قوم کو ایک سبق مل جائے تو ہم ماضی کی تلافی کر سکتے ہیں۔ درِ توبہ ابھی بند نہیں ہوا۔ کچھ فیصلے ابھی باقی ہیں۔ ہم سب مل کر اگر ایک ہو جائیں، ہمارا بچّہ بچّہ سپاہی بن جائے تو اس چھ کروڑ کی فوج کے سامنے کون دم مار سکے گا۔ آج سے ہم سب عہد کریں، ہمارا سب کچھ اس ملک کا ہے۔ قوم سے الگ ہمارا کوئی وجود نہیں ہے۔ پھر ایک قوم، ایک سوچ اور ایک نظریہ ہوگا اور دنیا دیکھے گی کہ پاکستان کتنا عظیم ملک ہے، ہمیں نے جُرم کیا ہے ہم ہی تلافی کریں گے۔ ہم اپنے وطن کی کھوئی ہوئی عظمتیں واگزار

کرکے دم لیں گے۔ ہم اپنے آدرشوں کو بلند کریں گے۔ ہم انصاف کا پرچم اتنا بلند کریں گے کہ سارا ایشیا اس کے سایے میں چلے گا۔ ہم عدل کی، مساوات کی اتنی شمعیں جلائیں گے کہ تن من روشن ہوجائیں گے۔ آج سے ہم کوئی خوشی نہ منائیں گے، کوئی جشن نہ کریں گے جب تک سب کے دکھ دُور نہیں ہوجاتے، ہم میں کوئی سکھی نہ ہوگا۔

سامنے کی محل نما کوٹھی کا گیٹ کھلا اور ایک گہرے فیروزی رنگ کی امپالا ایک جوڑے کو آغوش میں سمیٹے رعونت سے باہر نکلی۔ مرد نے کالے رنگ کا بھاری سوٹ پہن رکھا ہے۔ عورت نے نارنجی رنگ کی ہلکی سی ساڑھی زیب تن کی ہوئی ہے ہونٹوں پر اسی رنگ کی لپ سٹک اور لہراتی زلفوں میں اسی رنگ کے پھول سجانا بھی وہ نہیں بھولی تھی۔۔۔ شامِ غریباں اور یہ سنگھار!۔۔۔ میری اونچی اونچی سوچیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔ بلیک آؤٹ ختم ہوگیا تھا اور یہ لوگ کلب جارہے تھے۔ آج سے کلبوں کی راتیں پھر جگمگائیں گی۔ ہوٹل پھر سے آباد ہوں گے۔ یہ لوگ ڈنر کھائیں گے، ہنسیں گے، ناچیں گے، بہکیں گے۔ دولت کی نمائش ہوگی۔ حسن خود آرائی کی دہی سج دھج ہوگی، یہ لوگ اسی میں خوش ہیں کہ جنگ ختم ہوگئی ہے اور اُن کی راتیں پھر سے جگمگ اُٹھی ہیں۔ ویسے تو سنا ہے جنگ کے دنوں میں بھی ان کی راتیں کچھ ایسی سونی نہ تھیں۔ ان کے محلوں کے نیچے بڑے بڑے تہہ خانے ہیں۔ بمباری سے سارا شہر جل جاتا۔ جب بھی یہ اپنے خزانوں اور کاروں سمیت زندہ رہتے۔ مگر یہ ہے کس قسم کی مخلوق؟ حالات سے بے نیاز، احساس سے ماورا۔ کیا وقت کے فیصلے ان پر لاگو نہیں ہوتے؟ خوشیوں کے ناتے نہ سہی، دکھوں کے ناتے بھی انھیں وطن سے کوئی اُنس نہیں۔ کیا آج ان کی شکست نہیں ہوئی؟ ان کے اعتماد کی جڑیں اس زمین میں نہیں تو پھر کہاں ہیں؟ وطن پر آنچ آئی ہے مگر ان لوگوں تک یہ آنچ کیوں نہیں پہنچی؟ لوگ جو اس زمین پر محل بنا کے رہتے ہیں، اس کے دکھوں میں شریک نہیں ہیں۔ مگر پان بیچنے والا بابا، جو پچیس سال سے اس

سڑک کے کنارے بیٹھا ہے جس کی کل متاع خوانچے میں پڑی ہوئی پان کی چند گتریں اور سگریٹ کی دو ڈبیاں ہیں۔ کتنا دُکھی ہے کیسا کیسا روتا ہے!...... امید کی چنگاری جو ذرا دیر کے لیے میرے دل میں چمکی تھی، آنکھیں بند کر کے پھر سو گئی۔ کچھ نہیں رہا، کچھ نہیں بنے گا۔ پھر یہی امیر ہوں گے بچے کھچے ملک میں بھی انہی کے عیش ہوں گے۔ یہ بابا اسی زمین پر بیٹھا رہے گا۔ میں اسی طرح بس سٹاپ پر کھڑی رہوں گی اور لمبی لمبی کاریں ہر شام اسی رعونت سے کلبوں کی طرف رواں رہیں گی۔

"دیکھ رہی ہو بیٹا ان لوگوں کے رنگ! کیسے ظالم لوگ ہیں۔ وطن پر کیا کیا بیت گئی اور یہ لوگ" بابا پھر باتیں کرنے چلا آیا تھا۔

'ہاں دیکھ رہی ہوں بابا.... وطن نے بھی انھیں لوگوں کو بڑا بنا رکھا تھا۔ وطن قائم تھا تو بھی یہ لوگ بڑے تھے، وطن ہل گیا تو بھی یہ لوگ بڑے ہیں۔ تم کس لیے اتنے دکھی ہوتے ہو؟ تمہیں وطن نے کیا دے رکھا تھا اور تمہارا کیا چھن گیا ہے؟ پچیس سال سے تم اسی جگہ بیٹھے ہو اور یونہی بیٹھے رہو گے"۔

مَیں نے دیکھا بوڑھے کا چہرا بدل گیا ہے۔ آنکھوں کی راکھ میں چنگاریاں سی چمکنے لگی ہیں۔ "تمہاری یہ سوچ بالکل غلط ہے بیٹا" بابے کا لہجہ انتہائی فیصلہ کن تھا۔ "وطن تو محبوب ہوتا ہے۔ اس کے حضور محبتوں اور وفاؤں کے نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان نذرانوں کی قبولیت وطن کی سب سے بڑی دین ہوتی ہے۔ مَیں نے اس پاک زمین پر قدم رکھنے سے پہلے اپنے دو جوان بیٹوں کا خون اسے نذر کیا تھا۔ اس وقت یہی میری کل متاع تھی۔ بچی کھچی پونجی میرا چھوٹا سا پوتا تھا، جسے مَیں نے پالا، جوان کیا اور پاک فوج میں بھیج دیا تاکہ ان سرحدوں کا محافظ بنے۔ وہ مشرقی پاکستان میں تھا۔ آج نہ جانے کہاں ہوگا۔ مگر میں اُس کے لیے دُکھی نہیں ہوں۔ مَیں تو اس کے لیے روتا ہوں کہ اس بُرے وقت میں وطن پر سے نثار کرنے کے لیے میرے پاس اور کچھ نہیں۔ میرے بازو بوڑھے ہیں میری رگوں میں جوان خون

کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ آج وطن کو ؔ نی دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ زورِ بازو اور جوان خون۔ تم امیروں کو نہ دیکھو، بات کو سمجھو اور اپنی سوچ کو بدلو:"

پان والے بڑھے کی بات میں نے سمجھ لی۔ وطن کو خون دینے والے دکھی ہیں اور اس کی بوٹیاں نوچنے والے جشن منا رہے ہیں۔ فرق امیر اور غریب کا ہی نہیں، انسان اور درندے کا بھی ہے۔

خاموش اور ساکت فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ آٹھ دس لڑکوں کی ایک ٹولی تیز تیز باتیں کرتی ہوئی اسی طرف کو آرہی ہے۔ یہ طالب علم ہیں۔ ان کی باتوں کا موضوع وہی آج کا موضوع ہے۔ بنگلہ دیش اور اس کے لوازمات — جلوس، لاٹھی چارج، آنسو گیس، گولی، خون، ان کی باتوں میں شدّت ہے، تندی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب بولنا چاہتے ہیں کسی کی سننا نہیں چاہتے۔ میں ان کی باتیں سُننا چاہتی ہوں، نئی نسل کی سوچ سے واقف ہونا چاہتی ہوں مگر ان کے پاس سوچ سے زیادہ اضطراب ہے۔ ان کے آدھے آدھے جملوں سے میں نے اندازہ کیا کہ مسئلہ بنگلہ دیش کا ہے۔ کتنے مہینے گزر گئے ہیں۔ قوم کے اعصاب شکستہ ہو کر رہ گئے ہیں، مگر یہ طے کرنا ابھی باقی ہے کہ بنگلہ دیش حقیقت ہے یا فراڈ۔ گذشتہ سال پاکستان کی نفی کر کے بنگلہ دیش بنا تو اسے نام نہاد کہا گیا۔ سال پورا ہونے سے پہلے بنگلہ دیش اتنی بڑی حقیقت بن گیا کہ اسے تسلیم کرنے میں ہی ہماری بقا ہے ... چہ خوب! جیسے واقعی ہماری کوئی بقا بھی ہے! چند لوگوں کی بقا ہم سب کی بقا! بنگلہ دیش فراڈ ہے یا نہیں مگر یہ لفظ "ہم" بہت بڑا فراڈ ہے — بہت وزنی فراڈ کہ چند لوگوں کے ساتھ مل جائے تو ساری قوم کو پچھاڑ کر رکھ دے دراصل یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے۔ اٹل اور سخت — اس کی اپنی حقیقتیں ہیں اور قوم کی اپنی حقیقتیں۔ یہ حقیقتیں کل بھی ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھیں، آج بھی ایک دوسرے پر حملہ آور ہیں۔ بدلا تو کچھ نہیں۔

کل جو زخم لگے تھے آج ناسور بن گئے ہیں۔ کل متاعِ کارواں لٹا دی، آج احساس

زیاں پر ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ روشنیوں کی بینائی کچھ اور کم ہوگئی ہے، اندھیروں کا عمل کچھ اور تیز ہوگیا ہے۔ کل یہ پیاسی قوم ایک سراب کے پیچھے بھاگی تھی۔ آج ایک لق ودق صحرا میں کھڑی ہے۔ پہلے سے زیادہ تشنہ لب اور تلخ کام۔ سڑکیں جو پہلے ہی چوڑی تھیں اور پھیل گئی ہیں۔ گلیاں جو تنگ تھیں اور سُکڑ گئی ہیں۔ کوٹھیاں جو پہلے ہی خالی تھیں اور بھائیں بھائیں کرنے لگی ہیں۔ کوارٹر جو پہلے ہی لبالب تھے اور ابلنے لگے ہیں۔ سیٹھ کی دکان ولائتی سامان سے پٹی پڑی ہے۔ بابے کی چھاجڑی میں بان کی کترنیں اور چھوٹی ہوگئی ہیں۔ البتہ میرے بچے کا سوال بدل گیا ہے۔ اس کا نیا سوال بھی نئی حقیقت کے بارے میں ہے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بنگلہ دیش تو پچھلے سال بن گیا تھا۔ اب ہم لوگ آپس میں کیوں لڑتے ہیں اور میری سوچ ذرا بھی نہیں بدلی البتہ کچھ بگڑ ضرور گئی ہے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہارنے اور ٹوٹنے والی قوم جب جشن مناتی ہے۔ چراغاں کرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بڑے بڑے نام رکھتی ہے، شادیوں پر بڑے بڑے چراغاں کرتی ہے۔ کمخواب اور زربفت کے لباس پہنتی ہے اور خوب گاتی ناچتی ہے تو مجھے ایک پگلی یاد آنے لگتی ہے جو اکثر چپ رہتی مگر جب ہنستی تو بے تحاشا ہنستی، بے بات ہنستی۔ سنا ہے وہ بے چاری بڑی دکھی تھی۔ جب تک پاگل نہیں ہوئی تھی، اپنے دکھوں پر رویا کرتی تھی مگر اب ہنستی ہے وہ جتنی زیادہ دکھی ہوتی ہے اتنا ہی اونچا اونچا ہنستی ہے۔

"بس تو نہیں آئی اماں، چلو پیدل ہی چلیں۔ اُس وقت سے چلے ہوتے تو اب تک کتنی دور نکل گئے ہوتے۔" بیٹا اپنی ماں سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں، رات بہت ہوگئی ہے۔ یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔ شہر کی حالت بھی اچھی نہیں۔ ہر طرف غنڈے دندناتے پھر رہے ہیں۔ پیدل ہی چلتے ہیں۔" ماں نے بیٹے سے اتفاق کیا۔

رات تو اتنی زیادہ نہیں ہوئی مگر اندھیرا بہت بڑھ گیا ہے۔ شہر کی حالت

بھی اچھی نہیں۔ ہر طرف غنڈے دندناتے پھر رہے ہیں اور بس کا دُور دُور پتہ نہیں۔ بڑھیا اور اس کا بیٹا پیدل ہی چل پڑے ہیں۔ میں تنہا رہ گئی ہوں۔ اللہ میاں! بس جلدی آجائے۔ اللہ میاں! کبھی تو سن لیا کر۔ ایک سال پہلے ٹھیک اسی جگہ کھڑے ہو کر میں نے ایک دعا مانگی تھی۔ اللہ میاں! کھٹوعہ روڈ ٹوٹ جائے — وہ بھی ایک اندھیری شام تھی، سردی تھی، تنہائی تھی، شہر کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ آج زمین پر غنڈے دندناتے پھر رہے ہیں تو اس روز دشمن کے جہاز بم برسا رہے تھے، مگر نہیں ایک چیز اور بھی ہے جو تب نہ تھی اب ہے۔ ٹھنڈی یخ دل میں اترتی ہوئی چھری سی — یہ خوف اس وقت نہ تھا۔ اس خوف کے ساتھ بس کا انتظار کرنا کتنا مشکل ہے — اور وہ سویٹ سا بابا کہتا ہے کہ اپنی سوچ بدلو!

دسمبر ۱۹۷۲

ظلم کا جنگل

"خربوزوں کی مہک کا موسم اس مرض والوں پہ بھاری ہوتا ہے" میں چوراہے پہ کھڑی ہری بتی کا انتظار کر رہی تھی۔ دائیں ہاتھ پہ پیلے ہرے خربوزوں کی ڈھیری تھی۔ بائیں ہاتھ پھلوں کی کئی ریڑھیاں، مگر وہاں بھی خربوزے سب سے زیادہ لدے تھے۔ سارے بازار میں خربوزوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں رضیہ کی ماں کو پُرسہ دے کر آئی تھی، رضیہ کو مرے آج دوسرا دن تھا۔ رضیہ جو دو برس سے تپ دق کے مرض میں مبتلا تھی کل صبح مر گئی۔

پانچ برس پہلے یہ بات میری ماں نے کہی تھی۔ پانچ برس پہلے یہی دن تھے جب ویراں مری تھی۔ ویراں کو بھی تپ دِق تھی۔ دھوبی کی کوٹھڑی میں میلے اُجلے کپڑوں کی ڈھیریوں میں ایک کھٹولی پہ ویراں لیٹی تھی۔ ماں نے چادر کا کونا اُٹھا، ویراں کے چہرے پہ سرسوں کے پھول تھے، لمبے کالے بالوں کا ڈھیر اس کے سرہانے رکھا تھا، وہ ایک چھوٹی سی بچی کی طرح آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ ویسے تو اس کی عمر سترہ برس تھی۔ ان سترہ برسوں میں اس نے صرف تین چیزیں دیکھی تھیں۔ سوتیلی ماں، کوئلوں کی استری اور ٹی بی کی بیماری وہ صبح سویرے سے لیکر رات تک کپڑوں پہ استری کیا کرتی تھی۔ سال کا ہر موسم اور ہر موسم کا ہر دن، وہ بھاری کالی دہکتی استری پہ جھکی لوگوں کی شلواروں قمیضوں ساڑھیوں اور بلوؤزوں کی سلوٹیں نکالتی رہتی۔ بس اسی وجہ سے اُسے ٹی بی لگ گئی۔ استری کی آنچ اور کوئلوں کی گیس نے اس کے پھیپھڑے جُھلس ڈالے تھے۔ ویراں کو ٹی بی نہ لگتی اگر وہ دھوبی کی بیٹی نہ ہوتی، اس کا علاج ہو جاتا اگر اس کی سوتیلی ماں نہ ہوتی اور اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں۔ اس کا باپ دھوبی نہ ہوتا اور اس کی ماں سوتیلی نہ ہوتی تو اب

تک ویراں کی شادی بھی ہو جاتی، کتنی خوب صورت دلہن بنتی وُہ! یہ سب مَیں نے اس وقت سوچا تھا، یہ پانچ سال اُدھر کی بات ہے، وہ خربوزوں کے مہکنے کا موسم تھا، تب میری ماں زندہ تھی۔ تعزیت کرنا، پُرسے دینا، موت کے بارے میں سوچنا سب ان کے ذمّے تھا۔ میں ان کے ساتھ لگ کر چلی تو جاتی، مگر محض روتی رہتی۔ یا دوسروں کی باتیں سنتی۔ آج حالات دوسرے ہیں۔ سارے کام مجھے تنہا کرنے پڑھتے ہیں:۔ تعزیتیں پُرسے، رونا، سوچنا سبھی کچھ میرے ذمّے ہے۔ کل رضیہ بھی چل دی۔ مَیں بہت دنوں سے اسے دھیرے دھیرے مرتے ہوئے دیکھ رہی تھی، کل صبح سویرے اس کی موت کی خبر ملی تو مَیں گھر میں بیٹھی رہی۔ ایک آنسو بھی نہ روئی۔ رضیہ جو بہادر تھی۔ زندگی کے کتنے محاذوں پہ وہ اتنے دنوں سے اکیلی لڑتی رہی۔ بالآخر موت کے آگے ہتھیار ڈال چکی تھی، بہادر لوگوں کے لیے رونا کتنا مشکل ہے اور انھیں ہارتے دیکھنا تو قیامت!

آج جب اس کے گھر گئی تو وہ وہاں نہیں تھی۔ اس کی ماں اور نانی کے پاس ایک گھنٹے تک خالی ذہن اور خشک آنکھیں لیے بیٹھی گوٹا لگے اس سرخ دوپٹے کو دیکھتی رہی جو سامنے کھونٹی پہ ٹنگا تھا۔ یہ دوپٹہ اس کی ماں کی شادی کا ہو گا کل اس کے جنازے پہ ڈالا گیا ہو گا۔ کنواریاں مرجائیں تو ان کے جنازوں پہ سرخ دوپٹے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ رسم کِس نے شروع کی تھی، رضیہ کی ماں اور نانی کے بین تھک چکے تھے۔ اب ان کی آوازیں کنوئیں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کچھ اور عورتیں ڈولی برات کے بین کر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ اتنا ہی خوفناک طور پر عجیب لگ رہا تھا جتنا وہ سُرخ دوپٹہ۔

پتلی لمبی گلی میں اِس طرح چلتی رہی جیسے کوئی نیند میں چلتا ہے۔ دُکھ کا احساس دل ہی دل میں اس طرح جاگ رہا تھا جیسے کوئی خوابوں میں جاگتا ہے۔ مگر چوک پہ آ کر خربوزوں کی خوشبو نے یادوں کو کیسا ہچکولہ دیا برسوں پہلے ماں کی کہی ہُوئی بات یاد آئی، ویراں یاد آئی اور اپنی اس وقت کی سوچیں۔ ویراں

دن رات کپڑوں پہ استری نہ کرتی رہتی تو اسے ٹی بی نہ لگتی اُس کی سوتیلی ماں نہ ہوتی تو اُس کا علاج بھی ہو جاتا۔ ہوں! اور جو آج کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ رضیہ تو کپڑوں پہ استری نہیں کیا کرتی تھی۔ ٹھاٹھ سے کالج میں پڑھایا کرتی تھی، پھر اُس کے پھیپھڑے کونسی تپش میں جھلسے گئے، رضیہ کا علاج کیوں نہ ہو سکا، اس کی تو سگی ماں زندہ بیٹھی تھی۔ وہ اس دَور میں ٹی بی سے مر گئی جبکہ لوگ کینسر سے مرتے ہیں؛ بات دراصل ایک ہی ہے۔ فرق صرف کم زیادہ کا ہے۔ ویران چھوٹی سی لڑکی تھی اس کے ذمے کپڑوں کی شکنیں دُور کرنا تھا اور رضیہ بڑی اسے زندگی کی سلوٹیں نکالنے کا کام مِلا تھا۔ وہاں تپتی ہوئی استری تھی، یہاں جلتی ہوئی زندگی کی بھٹیاں، وہاں ایک سوتیلی ماں تھی، یہاں قدم قدم پہ سوتیلی مائیں کھڑی تھیں، بے رحم، حاسد اور سنگ دل۔ ان میں سے چند ایک کو مَیں بھی پہچانتی ہوں۔ دراصل یہ چہرے ہی چہرے ہیں۔ ان سب کا دھڑ ایک ہی ہے۔ ظلم کے ایک ہی دھڑ میں بہت سے چہرے اُگے ہوئے ہیں۔

رضیہ کے دُکھ کہاں سے شروع ہُوئے مَیں نہیں جانتی، اُس نے مجھے یا کسی کو اپنی کوئی کہانی کبھی نہیں سنائی، اسے شاید اپنے ماضی کو یاد کرنے کی فرصت ہی نہ تھی یا پھر اس کے ماضی میں کوئی خوب صورت جزیرہ ہی نہ تھا، جسے یاد رکھا جاتا۔ میری اور اس کی ملاقات چند سال پہلے اس طرح ہوئی تھی جیسے ریل کے ڈبے میں دو مسافر دوست بن جائیں۔ زندگی بھی تو چھک چھک کرتی ریل گاڑی ہی ہے جس کے ڈبوں میں جگہ بنانے کے لیے کتنے مسافر آپس میں دھکم پیل اور گالی گلوچ کرتے سفر کاٹتے ہیں، مگر کچھ لوگ آپس میں گھُل مل کر بیٹھ بھی رہتے ہیں۔ مَیں اور رضیہ اِسی قسم کے ہمسفر تھے۔ وہ ایک فیشن ایبل اِرسٹو کریٹ کالج تھا، جہاں کے لوگ ایرکنڈیشنڈ ڈبوں میں سفر کرنے والے مسافروں کی طرح صاف ستھرے بند محفوظ، ٹھنڈے کونوں سے بیٹھے اچھی اچھی چیزیں چباتے رہتے ہیں۔ باہر کتنی گرد، کیسی لو اور کس قیامت کی نفسانفسی

ہے ، یہ سب دیکھنے کے لیے اپنی کھڑکی کے شٹر تک اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے ۔ محکمہ تعلیم کو ایسے طبقاتی مسائل کی کیا فکر ، انھوں نے نہ جانے کون سی سہولت[1] دیکھ کر میری ٹرانسفر وہاں کر دی ۔ سارے استاد اور سارے طالب علم کوٹھیوں میں رہتے اور کاروں میں آتے تھے ۔ سٹاف کوارٹروں میں نوکر لوگ رہتے تھے ۔ انھیں کوارٹروں میں سے ایک مجھ غریب الدیار اور بے مکان کو الاٹ ہُوا ۔ تین کمروں اور دیگر لوازمات کے ساتھ وہ مکان میرے لیے غیر معمولی بے کرانیاں رکھتا تھا ۔ اپنی کل متاع تو ایک چار پائی ، ایک بستر دو کرسیاں ایک میز اور اللہ اللہ خیر سلّا باقی دو کمرے بھائیں بھائیں کرتے خالی پڑے تھے ۔ کچھ دن تو اس غیر ملکی سے ماحول میں ایسے گزرے کہ سارا دن مُکلف کپڑے پہنے کرسی پہ بیٹھی رہتی ، کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا تو بھاگ کر باہر نکل آتی ۔ آنے والے کو اندر قدم رکھنے کا موقعہ ہی نہ دیتی ۔ مبادا اپنی اصلیت کھل جائے ۔ لوگ کہتے ہیں آدمی کی تہذیب اور شخصیت کا پتہ اس کی بات چیت اور طور طریقوں سے لگتا ہے ۔ میں کہتی ہوں ساری بات کا پتہ اس کے اسباب سے چلتا ہے ۔ ہمارا کلچر ہمارے گھر کا سازو سامان ہے ۔ اس معروف ادارے میں آکر اندازہ ہُوا کہ ہم متوسط طبقے کی نچلی پرت کے لوگ کیسے چھوئی موئی کے پودے ہوتے ہیں ۔ میں جو جھینپ اور جھجک والی نفسیات ساتھ لے کر آئی تھی ۔ یہاں آکر اپنی کھال کے اندر سکڑی رہتی ۔ مگر چند ہفتے گزرنے کے بعد کچھ صورت اعتماد کی پیدا ہوئی ۔ اول تو ان لوگوں کی بے نیازی اور خود مشغولی کی عادت تھی جو انھیں اس بات کی مہلت نہیں دیتی کہ خواہ مخواہ دوسروں کے کوٹ میں سوراخ گنتے پھریں ۔ یہ خالص متوسطیوں کی عادت ہے ۔ دوسرے یہاں کی طالبات تھیں جن کی طبقاتی نفسیات ابھی پختہ نہیں ہوئی تھی ۔ اپنی تازہ اور توانا ذہانت کے ساتھ محض گلدان میں پھول سجا کر یا فیشن کے کیٹلاگ

[1] Convenience

دیکھ دیکھ مطمئن نہیں ہوسکتی تھیں۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ تاریخ، ادب اور سوشلزم کی باتوں سے شدید طور پر متاثر ہونے کی سٹیج پر تھے ۔ بس یہ باتیں ہی میرے کام آئیں ۔ پھر تو یہ معمول بن گیا صبح سویرے استری اور کنگھی سے آراستہ ہو کر پڑھا آتی بعد میں سارا دن موج ہی موج ۔ اپنا گھر اپنا آپ ، آزادی تنہائی اور ایک لمبی چُپ ، اُسی دور میں یہ گیان بھی حاصل ہُوا کہ بیچارا حیوان ناطق محض لکچروں کے چارے پہ تندرست نہیں رہ سکتا، باتیں، چھوٹی چھوٹی باتیں ، بے معنی باتیں، زکام کی باتیں ، دوپٹہ رنگنے اور نئی قمیض سلوانے کی باتیں، دُکھ درد کی باتیں اور دل کی باتیں۔ اپنوں سے اپنے جیسوں سے، ہائے کیسی لذیذ خوراک ہے ہم سب کی !! یہ فرق ایسا ہے جیسے روٹی اور پانی کا فرق اُن دنوں میں بس روٹی کھا کر زندہ تھی۔ ٹھنڈے پانی کو ترسا کرتی کبھی آئینہ سامنے رکھ کر اپنی صورت پہ غور کرتی کہ کہیں چہرہ نقش یا دیوار کی صورت تو اختیار نہیں کر رہا۔

تب ایک دن سٹاف روم میں خبر گرم ہوئی ایک نئی مس کے آنے کی۔ انگریزی کی ایک لیکچرر کا تقرر ہوا تھا۔ ہو گی کوئی ڈیشنگ سمیشنگ قسم کی جرنیل کی بیٹی یا کسی سیکرٹری کی بیوی ۔ اس کالج میں اس سے کم کوئی کیا آئے گی۔ میں نے سوچا ۔ ان نئے امیروں کے ساتھ یہ بھی مصیبت ہے کہ عورتیں ملازمتیں کرنے نکل کھڑی ہوئی ہیں ۔ اپنی شخصیتوں کی نمائش کی خاطر تعلیمی اداروں کو ڈے کلب بنا کر رکھ دیا ہے ان لوگوں نے ۔ پھر شام ڈھلے پتہ چلا کہ میرے ساتھ والا مکان صاف ستھرا کیا جا رہا ہے کہ نئی مس صاحبہ وہاں آ کر رہیں گی ۔ لو اب ہُوا پھڈا۔ پڑوس میں رہیں گی تو کیا یہاں نازل نہ ہوا کریں گی۔ پریشانی سے میں نے اپنے در و دیوار کو دیکھا ؎

ہے خبر گرم ان کے آنے کی . . . .

یہ خالی ڈھنڈار کمرے ۔ اصولاً تو انھیں ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم ہونا چاہیے تھا۔ صوفہ سیٹ ، قالین فریج ، ڈائننگ سیٹ خوش رنگ و

دیدہ زیب پردے، سائیڈ بورڈ، کراکری، پاش قسم کی سینریاں، کتنا کچھ چاہیے مجھے ایک رسپیکٹبل[1] پڑوسن بننے کے لیے! اور یہ سونے کا کمرہ چشم بد دُور پلنگ تک نہیں، محض بان کی چارپائی، چھینٹ کی رضائی، کپڑوں کا بکس نیچے دھرا ہے۔ کمبخت کپڑے ٹانگنے کی الماری تک نہ تھی، پہننے کے کپڑے دونوں کرسیوں پہ لدے رہتے۔ بی پڑوسن نے آنے سے پہلے ہی میرا سکون چین غارت کر دیا تھا۔ خدایا یہ لوئر مڈل کلاس طبقہ بھی کیسا کھجور میں اٹکا ہُوا ہے۔ نہ آسمان ان کا ہے نہ زمین ان کی۔ خود اپنے آپ کے اندر ہی سکڑتے سمٹتے گذر جاتی ہے زندگی۔ کیسا بے اختیار جی چاہا تھا۔ اُس روز ساری ڈگریاں پھاڑ پھاڑ کر ہوا میں اڑا دوں اور پھر سر پہ لسّی کی جھجری اور روٹیوں کی چنگیر رکھ کر کھیتوں کو چل دوں موج سے آزادی سے بے فکری سے مگر کون سے کھیتوں کو کس کے کھیتوں کو؟ ذہن میں پٹاخا سا پھٹتا۔ وہ طبقہ بھی مجھے کب قبول کرتا ہے دولت اِن کی، عظمت اُن کی، اور میرا کیا؟

رات بھر میں نے پریشان کن خواب دیکھے اور جب آنکھ کھلی آنے والی پڑوسن سے نمٹنے کی ترکیب سوچیں۔ ٹھیک ہے سنوب تو وہ ہوگی ہی، مَیں بھی بہت بد دماغ ہو جاؤں گی۔ سلام ہی نہیں کروں گی، کبھی آتے جاتے اس نے ہلو کہا تو میں بس منہ پھیر لیا کروں گی۔ ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کا سوال ہی نہیں۔ البتہ کچھ اچھی سی ساڑھیاں خرید لینی چاہئیں۔ آتے جاتے مڈبھیڑ تو ہوگی ہی۔ اگلی صبح سٹاف روم میں جھانکا تو ایک اجنبی صورت وہاں موجود تھی۔ نہایت معمولی ساڑھی مگر سلیقے سے لپیٹی ہوئی، بڑے سے صوفے پہ وہ یوں سمٹ کے بیٹھی تھی جیسے زیادہ جگہ گھیرتے ڈرتی ہو۔ تو کیا یہ وہ ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور ذرا تفصیلی نظر ڈالی۔ چہرے کے نقوش اچھے تھے مگر رنگ روغن کی شدید کمی تھی۔ بلش آن نہ ریویلان، نہ لپ سٹک، بلکہ خون کی سُرخی بھی کم کم۔ انگلیوں میں کوئی ڈائمنڈ رِنگ تھی نہ کانوں میں پرل ٹاپس، کلائی

[1] Respectable

میں گھڑی تھی مگر پلاٹینم کی نہیں تھی ۔ نگاہیں ملیں تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا" میں رضیہ ہوں" اس نے اپنا تعارف کروایا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ کے آنے سے خود اپنے منہ سے یہ الفاظ سُن کر مجھے رات کا سوچا ہوا منصوبہ یاد آیا تو خاصی ندامت سی محسوس ہوئی ۔

تب شام کو رضیہ کا سامان آگیا ۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا، ریڑھے پہ لدی ہوئی چار پائیاں، بکسے، ٹوکریاں، گٹھڑیاں، نماز کی چوکی، کھانے کا تخت بندھے ہوئے بستر جن میں سے چھینٹ کی رضائیاں جھانک رہی تھیں ۔ میرے اعصاب کا تناؤ نرم پڑ گیا۔ باورچی خانے جا کر میں نے چائے کا پانی رکھ دیا۔ چند منٹ بعد رضیہ آ پہنچی مگر اس کے ساتھ دو لڑکیاں ایک لڑکا، ایک ادھیڑ عورت اور ایک بوڑھی عورت بھی ٹیکسی سے اتریں۔ یہ سارا کنبہ یہیں رہے گا گڈ! مجھے ایک سکون اور تحفّظ کا احساس ہُوا۔ کیسا مزہ آئے گا بڑی اماں رضیہ کی دادی ہوں گی یا نانی۔ کیسے مزے سے چوکی پہ بیٹھی تسبیح پھیرا کریں گی اور اماں صبح سویرے اُونچی آواز سے تلاوت کریں گی، میں ساری زندگی صبح اسی آواز کو سُن کر جگتی رہی تھی، مگر اب خوابوں میں بھی ترستی تھی، یہ سوچتے سوچتے میں نے اطمینان سے تام چینی کی چادانی کے ساتھ دیسی پیالیاں سجا کر چائے رضیہ کی طرف بھجوا دی۔ ایک منٹ بعد اپنی پیالی ہاتھ میں لیے رضیہ میرے گھر میں کھڑی تھی۔" واہ بھئی واہ۔ ایسے ہمسائے تو اللہ سب کو دے۔ مزا آگیا اس وقت چائے پینے کا" پیالی ختم کرتے کرتے وہ تینوں کمروں میں جھانک چکی تھی۔ ارے بس! تم ہی تم ہو یہاں ؟ کیا قید تنہائی ہے بھئی ڈر نہیں لگتا اکیلے" " اب نہیں لگے گا میں نے کہا۔ اور مجھے اندازہ ہُوا کہ رضیہ بھی ان لڑکیوں میں سے ہے جو زندگی کا بوجھ ڈھونے کی خاطر نوکری کی گاڑی میں جُت جاتی ہیں ۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں اور نانی کے علاوہ دو بہنیں اور ایک بھائی اس کے Dependent تھے۔

ٹھیک ساتویں دن کالج کے روز گارڈن میں چاندنی رات کا ڈنر ہو رہا تھا۔ اب کی بار سب کچھ ہپّی سٹائل میں ترتیب دیا گیا تھا۔یعنی بے ترتیبی ترتیب دی گئی تھی۔لڑکیوں نے اپنے اُجلے اجلے مکھڑوں پر مصنوعی میل کچیل لگایا تھا۔ہپیّوں والے حلیے کے کپڑے پہنے اور بال بنائے تھے۔بعض استادوں نے بھی شوق فرمایا تھا۔کھانا پینا، ناچ گانا، نشست برخاست سب ہی کچھ اسی انداز میں تھے سرو کے جھنڈ میں بھنگ کے شربت کا ٹب رکھا تھا جس میں برف کے گلیشیر سے تیر رہے تھے۔آس پاس مٹی کے کلھڑ بھرے پڑے تھے۔ان لڑکیوں کے لیے جن کے باپ ساختہ پیرس سے کم گلاس ہیں۔پانی پینا عار سمجھتے ہیں، اُس وقت وہ سب کی سب جوڑوں میں بٹی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں اچرس کے سگرٹ کا ہر کوئی کش لگا رہی تھی جھومتی جھامتی نیم مدہوش ایک دوسرے پہ گرتی پڑ رہی تھیں۔

تماشہ دیکھنے ہم بھی گئے تھے۔رضیہ ایک پلیٹ میں کھانے کی کوئی چیز لے آئی "بہت بدمزہ ہے" اس نے نوالا تھوک دیا۔کیا معلوم اس میں بھی بھنگ پڑی ہو۔پچھلے مہینے سب کچھ مغل سٹائل میں ہوا تھا۔تب کھانے بہت لذیذ اور ماحول بے حد الف لیلوی تھا۔اُس سے پچھلے ماہ امریکن سٹائل کا ڈنر ہوا تھا۔میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔"ہاں، ہاں" اس نے میری بات کاٹی" اس کے علاوہ یہ اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔ان لوگوں کے پاس دنیا بھر کے سٹائل ہیں۔مشرق کے، مغرب کے۔مگر ان کا اپنا کوئی سٹائل نہیں ہے۔یہ لوگ چولے اور جامے تو بہت بدلتے ہیں مگر اپنا ذہن نہیں بدلتے۔اس قدر بھرے ہُوئے اور اس قدر خالی امیر اور کہاں ہوں گے۔اِس دنیا میں اتنے پُر وسائل اور مقصد ناآشنا! پتہ نہیں یہ لوگ اپنے اس المیے سے واقف بھی ہیں کہ نہیں۔مجھے تو دکھ ہوتا ہے۔ ان لڑکیوں پہ۔یہ کبھی زندگی کے معنی سمجھ نہ پائیں گی۔ ذرا سوچو ساری زندگی یہ

لوگ کپڑوں اور بالوں کے سٹائل بدل بدل کر گزار دیں گی۔ زندگی بھر یہ زندگی سے آشنا نہ ہو سکیں گی۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے تم اتنے دنوں سے یہاں کس حساب میں رہ رہی ہو؟ امیروں کا محاسبہ کرتے کرتے وہ اب میری جواب طلبی کر رہی تھی۔ مَیں تو فقط نوکری کر رہی ہوں یہاں۔ اب تم بھی تو آگئی ہو۔ چلو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے ......" نہیں نہیں! یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں" اس کے لہجے میں وہی تناؤ تھا۔ نوکری کہیں اور بھی تو ہو سکتی ہے۔ اسی طبقے کے خدمت گاروں میں رہنا کیا ضروری ہے" میں سمجھی! تو یہ طبقاتی چکر ہے۔ میرا خیال تھا۔ شاید ان لڑکیوں کی بے باکی دیکھ کر تمہارے اندر کی بی مُلانی شور مچا رہی ہے تو کامریڈ رضیہ سنو تم نوکری کرنے جہاں بھی جاؤ گی اسی طبقے کی خدمت کرو گی۔ سارے ملک پہ انھیں کا تسلط ہے، انھیں کی حکومت ہے۔ سب کچھ انھیں کی مرضی سے ہوتا ہے۔ ہم قوم کے بچّوں کو وہی کچھ پڑھاتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہی ہمارے Pay masters ہیں۔ ہم لوگ اُستاد محض نام کے ہیں۔ دراصل نوکر ہیں، ملازم ہیں۔" "یہ سب تو ٹھیک ہے"۔ اس نے کہا "مگر یہاں عین ان کی ناک کے نیچے رہنے کی بجائے ہم اپنے جیسے لوگوں میں کیوں نہ چلے جائیں"۔ میرا خیال تھا یہاں کچھ عرصہ رہ کر طبقاتی فاصلوں کی پیمائش اچھی طرح ہو سکے گی۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ یہاں رہ کر ہم فقط ضائع ہوتے رہیں گے۔ احساس کمتری سمیٹتے رہیں گے۔ ذرا سوچو، کیا اس جگہ ہماری حیثیت وُہی نہیں جو مشنری اداروں میں اردو، فارسی پڑھانے والے مولویوں اور منشیوں کی ہوتی ہے اور افادیت تو اس سے بھی کم۔ کتنی مزے کی بات ہے۔ ان لڑکیوں کو جو بھنگ کے کلھڑ چڑھا کر یانکی انداز میں گفتگو کر رہی ہیں۔ چرس کی چلموں پہ دم لگا کر پی دھنوں پہ دیوانوں کی طرح ناچ رہی ہیں وحشیوں کی طرح چیخیں مار رہی ہیں تم غالب پڑھاتی ہو، اقبال کے فلسفے بیان کرتی ہو ان سے۔ کچھ فائدہ ہے اس کا؟ کوئی معنی ہیں ان باتوں کے؟

اور تم انھیں چارلس لیمب اور ملٹن پڑھاؤ گی ؟ مگر اس نے میرے اس جملے کو سُنا اَن سنا کر دیا اور بولتی چلی گئی ۔ یہ سب چکر ہیں امریکہ دی گریٹ کے چکر ۔ اس ملک میں جو غریب دہقانوں کا ملک ہے اتنے شاندار اور کثیرالخرچ ادارے، بھاری تنخواہیں، بڑے بڑے سکالرشپ صرف اس لیے دیئے جاتے ہیں کہ یہاں کی امیرزادیاں جانگیہ کاٹنے اور انڈا تلنے کی ترکیب سیکھ لیں ۔ یہ سب ذہنوں کے قتل کا سامان ہے ۔ باقاعدہ پروگرام ہے ۔ اُس طبقے کو جو یہاں کے اقتصادی ذرائع کنٹرول کرتا ہے ۔ عیاشیوں میں پھنسا کر ملک کو ایک طرح کی نوآبادی بنائے رکھنے کے ضمنی منصوبے کے یہ ادارے ہیں ۔ انگریز کے بعد امریکہ انھی منصوبوں پہ کام کر رہا ہے ۔ ہمیں آزادی کی جد وجہد پھر سے شروع کرنی چاہیے ۔ ہمارا یہاں کوئی کام نہیں ہمیں اپنے محاذ پہ لوٹ جانا چاہیے۔ ہماری دنیا، وہی پھٹیچر دنیا ہے ۔ جہاں سے ہم آئے ہیں" آخری جملے میں رضیہ نے وہاں کی ایک محترمہ کے الفاظ دہرائے تھے جو کسی اَپ سٹارٹ گھر کی چشم و چراغ ہونے کے علاوہ ایک ڈی آئی جی کے دل کی رونق تھیں ۔ ان کی نظروں میں دنیا کے اکثر لوگ پھٹیچر ہی تھے ۔

رضیہ کی ان باتوں سے مجھے حیرت نہیں ہوئی ، حیرت ہوئی تو ان باتوں پر جو اُس نے اگلے مہینے کے چاند رات ڈنر پر اُسی جگہ بیٹھ کر کہیں ۔ اب کی بار دیہاتی سٹائل کا کھانا تھا ۔ سارے ماحول کو دیہاتی زندگی کا نمونہ بنانے میں لڑکیوں نے بے انتہا محنت کی تھی ۔ پانچوں صوبوں میں رہنے والی لڑکیوں نے اپنے دیہات کی نمائندگی انتہائی مکمل طور پر کی تھی ۔ لباس طعام نشست اور بول چال سے لے کر گانے بجانے میں دیہات کی دنیا تھی ۔ مگر اس سارے اہتمام میں کہیں بھی چوہدریوں ، ٹھاکروں ، وڈیروں یا سرداروں کی میزبانی کی جھلک نہ تھی ، یہ تو کسانوں کے گھر تھے ۔ جہاں پورے خلوص سے مہمانوں کی خاطر تواضع کی جا رہی تھی ۔ یہ مہمانوں کی مرضی اور پسند تھی کہ وہ کس

دیہات میں اتریں۔ کہیں پنڈ کی کوئی مٹیار شلوار کرتا پہنے لال چوڑا چھنکاتی لوٹا اُٹھائے مہمانوں کے ہاتھ دھلوا رہی تھی، کہیں کوئی غزالی آنکھوں والی ساحرہ اونچی اونچی ساڑھی پہنے، بالوں کا اونچا سا جوڑا باندھے، پاؤں میں بچھوے پہنے مچھلی بھات حاضر کر رہی تھی۔ یہ بنگلہ باڑی ہے، اُدھر سندھ کی گوٹھ ہے۔ جہاں ایک لڑکی ڈھیلا ڈھالا کشیدہ کاری سے لتھڑا ہوا کرتا پہنے آنگن میں مہمانوں کو کھجوروں کے ساتھ دُودھ پیش کر رہی تھی۔ اس طرف کو انگوروں کی بیلوں کے سائے میں پٹھان کلی ہے جہاں ایک دوشیزہ اپنی لمبی لمبی دو چوٹیاں سامنے ڈالے، ماتھے پہ بالوں کی جھالریں سجاتے خمیری روٹیوں کے ساتھ شوربے کے پیالے سجا رہی تھی اس سے آگے شاید کوئی بلوچ خیمہ ہے کہ سجّی بھننے کی خوشبو آ رہی تھی۔ عجب ہی سماں تھا۔ مختلف دیہاتوں کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے والی وہی لڑکیاں تھیں جنھوں نے اس روز بھنگ چرس پی کر شیطانی ناچ ناچے تھے۔ رضیہ اُس ماحول میں کھوئی پڑی تھی۔ اس نے سب کے کھانے چکھے پھر ان کے ساتھ مل کر ٹپے گائے، ڈھولک بجائی۔ فرمائش کرکے بنگلہ گیت سُنے اور اس پشتو گیت کا ترجمہ بھی پوچھا جس میں فرنگیوں سے لڑکر شہید ہونے والے جوان کا کفن گاؤں کی سب سے حسین لڑکی نے اپنی زلفوں کی تاروں سے سیا تھا۔ اس رات رضیہ نے اپنی رائے بدل ڈالی۔ "ان لڑکیوں میں بڑی قوت ہے، بڑی توانائی۔ ان کے ذہن ابھی تازہ ہیں۔ ان میں اپنی مٹی کی مہک کو پہچاننے کی حِس زندہ ہے۔ انھیں ایجوکیٹ کیا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی کلچر کی یلغار کو روکنے کے لیے یہاں بڑا محاذ ہے۔ کیوں نہ جنگ یہیں سے شروع کی جائے۔ اگر ایک بار اس طبقے کے گھروں میں قومی روح جاگ اُٹھے ...

مگر رضیہ بیگم تم یہ بھول رہی ہو کہ ان لڑکیوں میں سے اکثر کی فیوڈل بیک گراؤنڈ ہے۔ یہ لوگ وقت کے ہر نعرے کو اونچا اُٹھا لیتے ہیں مگر اپنی طبقاتی حیثیت میں تبدیلی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ انگریزوں نے ان کے باپ داداؤں

کی تربیت بڑے دھیان سے کی تھی۔ ہو سکتا ہے آج تم ان سے سوشلزم کا نعرہ بھی لگوا لو۔ ہپی ازم کے اثرات سے بچا لو، مگر ان کو آرام دہ محلات سے نکال کر زندگی کے کارزار تک کبھی نہ لا سکو گی۔ گیتوں اور کہانیوں کی بات اور ہے جلتے سورج کے نیچے گندم کاٹنے، دھان بونے اور پتھر کوٹنے کے حوصلے انھیں لوگوں کے ہو سکتے ہیں جنھیں غریب طبقے نے جنم دیا ہو۔

میں نے اسے سمجھانے کی سعی کی۔ نہیں، جوان خون میں بڑی جرأت ہوتی ہے، جوان خون خواہ کسی طبقے کا ہو عیش کوش نہیں ہوتا۔ شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے شعور! پھر کوئی وجہ نہیں انقلاب کا ہراول دستہ یہیں سے نہ نکلے!

یہ ہراول دستہ بنانے کی مہم شاید اس نے اگلی صبح سے شروع کر دی تھی۔ وُہ اکثر لڑکیوں کے جھرمٹ میں ان سے باتیں کرتی دکھائی پڑتی۔ تیاری کا پہلا مرحلہ ان سب کا اعتماد تھا جو وہ جیت چکی تھی۔

تب ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ چاروں طرف بپھرے طوفان کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انقلاب، انقلاب کے نعرے بھی گونج رہے تھے مگر ہر طوفان تو انقلاب کا پیش خیمہ نہیں ہوتا۔ منزلوں کا تعین نہ ہو اور ہواؤں کا رُخ پہچان کر آگے بڑھنے والے ہراول دستے مشعل بردار نہ ہوں تو اندھیری راہوں پہ طوفان تصادم میں بدل جاتے ہیں اور پھر کوئی سحر طلوع نہیں ہوتی۔ فقط تباہیاں جنم لیتی ہیں۔ ماحول کے اندھیرے دُور کرنے سے پہلے ذہن روشن ہونے چاہئیں۔ قوم کے آدرش تاریخی تقاضوں کو نظر انداز کر کے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ آج کی دنیا میں تاریخی تقاضے کیا ہیں؟... رضیہ ابھی ایلمنٹری سبق ہی پڑھا رہی تھی کہ انتظامیہ چوکنی ہو گئی۔ پہلے ہدایات ملیں پھر جواب طلبیاں شروع ہو گئیں اور پھر دھمکیاں آنے لگیں اس پہ طلباء کو ورغلانے[۱] کرنے کے الزام لگے تھے۔ ادارے کا امن بگاڑنے کا بہتان تراشا گیا تھا۔ دسمبر کا مہینہ ختم ہوتے ہوتے وہاں سے تین

[۱] Misguide

لوگ رخصت ہوئے ۔ رضیہ کا تبادلہ ہوا اور دو خواتین کو اعلیٰ تعلیم کے سکالرشپ آفر ہوتے ۔ یہ دونوں خواتین وہی تھیں جو پارٹیوں میں شیری کو شربت روح افزا کہہ کر رد کرتیں اور بالغوں والی ڈرنک مانگا کرتی تھیں ۔ ان طالبات کو بلیک لسٹ بھی کیا گیا ۔ جنہوں نے رضیہ کو الوداعی پارٹی دینے کی تحریک چلائی تھی ۔

رضیہ کو تبادلے کی فکر نہ تھی مگر جب مکان خالی کرنے کا نوٹس ملا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے ۔ لاہور شہر میں سستا مکان فوری طور پر تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا ۔

اگلا سال انتہائی دکھوں کا سال تھا ۔ تصادم ختم چکا تھا ۔ زندگی زخم زخم تھی ۔ انقلاب لانے والی قوتوں کو تقسیم کر دیا گیا تھا ۔ ہر طرف بربادی اور توڑ پھوڑ کا منظر تھا ۔ اندھیرے اور بھی گھنے ہو چکے تھے ۔ گو زمین تقسیم ہو چکی تھی ۔ دکھوں کا اشتراک ابھی تک باقی تھا ۔ دھرتی پیاسی تھی ، لوگ پیاسے تھے ، روحیں پیاسی تھیں ، ظلم کا جنگل ہرا تھا ، لاکھوں انسانوں کا خون اس کی جڑوں میں ڈالا جا چکا تھا ۔ سوتیلے چہرے اب اور بھی تیزی سے اُگ رہے تھے ، خوف زدہ لوگ اپنی ذات کے خول میں دبک گئے تھے ۔ انفرادیت کے تاریک غاروں میں جا سوئے تھے ۔ رضیہ کی ذاتی زندگی میں نہ کوئی پناہ تھی نہ سکون ۔ نہ اس کی سوچوں میں کوئی ٹھنڈا اندھیرا غار ہی تھا ۔ وہ زندگی کی کڑی دُھوپ میں تنہا کھڑی تھی ۔ حالات بہت مایوس کن ہو گئے ہیں نا ؟ ایک دن میں نے اس کی ٹوہ لینے کی کوشش کی ، " کون کہتا ہے ؟ اکثر لوگ اسی طرح سوچ رہے ہیں ۔ " حالات آج سے بہتر کبھی بھی نہ تھے ۔ اس نے کہا ، دریچے میں بیٹھ کر تو زندگی کو چاروں کھونٹ سے دیکھا نہیں جا سکتا ۔ جو کچھ بھی ہوا اچھا ہُوا ۔ کم از کم انقلاب کے رومانی تصورات تو ٹوٹے ۔ نئے کالج میں متوسط طبقے کی کئی پرتوں کے نمائندے

موجود تھے، مگر رضیہ کو یہ مٹی کچھ زیادہ زرخیز معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں پیٹی بورژوا زیادہ ری ایکشنری ہوتا ہے۔ خوف کی جکڑ ان پر سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ پڑھے لکھے ملازمت پیشہ یا تجارت پیشہ لوگ جنھیں ہمارے ہاں متوسط طبقہ کہا جاتا ہے۔ دراصل کوئی طبقہ نہیں محض افراد کا گروہ ہے جو اجتماعی ذمّہ داریوں کا احساس صرف گفتگو کی حد تک ہی رکھ سکتا ہے۔ یہ گروہ پیدا تو کچھ نہیں کرتا مگر امیدوں اور ناامیدیوں کا کاروبار خوب چلاتا ہے۔ شدید عدمِ تحفّظ کا احساس انھیں اُوپر والے طبقے کے قدموں میں بٹھائے رکھتا ہے۔ اس طبقے کی عورت کے ساتھ تو اور بھی بڑی مشکل ہے کہ اسے اپنے عورت ہونے کا شدید احساس ہے۔ عورت جو فقط جسم ہے، یہ جسم مرد کے کام کی چیز ہے، اسے لُوٹا جا سکتا ہے، چرایا جا سکتا ہے، اسے ضرور کسی کی ملکیت ہونا چاہیے، ہر دم کوئی محافظ ساتھ رہنا چاہیے۔ گھر کے اندر گھر کے باہر۔ یہ تو بس آٹے کا دِیا ہے اندر رکھا ہو تو چوہے کترتے ہیں اور باہر کوّے ٹھونگنے لگتے ہیں۔ عدم تحفظ کا یہ احساس اسے مرد کے قدموں میں بٹھائے رکھتا ہے۔ اسی احساس سے اس کی محبتوں نفرتوں رومان اخلاق اور وفاؤں کے تصوّرات اُبھرتے ہیں۔ کِسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جانا رضیہ کی عادت نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیوں ان دنوں وہ اس طبقے کے بخیے ادھیڑ رہی تھی۔ کبھی اسے سماج کی لیڈی آف شیلاٹ سے تشبیہہ دیتی جو زندگی کو فقط تصوّرات کے آئینے میں دیکھ کر زندہ رہتی ہے، حقیقت روبرو آ جائے تو فنا ہو جاتی ہے اور کبھی اسے کچھوا کہتی جو اپنے موٹے خول میں بند رہتا ہے۔ کبھی کبھی گردن نکال کر کھانے کی کوئی چیز اُچک لیتا ہے۔ بس اس کی زندگی کا اتنا ہی ثبوت ہے۔

یہ شاید رضیہ کے فلسفوں کا اثر تھا یا خود میری برین واشنگ ہو چکی تھی کہ

دو سال بعد جب میں اپنی پھٹیچر دنیا میں واپس آئی تو ساتھ کام کرنے والی خواتین عجب مضحکہ خیز طریقے سے الجھی ہوئی عورتیں معلوم ہوئیں۔ ان کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد واضح نہیں تھا۔ ملازمت کرنے کے معنی تک مبہم تھے۔ کسی نے اسے معیار زندگی کی سیڑھی بنا رکھا تھا۔ کسی کے لیے تنخواہ محض جیب خرچ تھی جسے وہ کبھی خرچ نہ کرتی۔ ایک دو کا حال یہ تھا کہ تنخواہ وصول کرتے ہی انار کلی کا رُخ کرتیں اور مہینے بھر کی کمائی سے ایک ہی دن سامان خرید کر جہیز کے صندوقوں میں بند کر دیتیں۔ سالوں سے وہ یہی کرتی نظر آ رہی تھیں۔ جانے کب تک کرتی ہی جائیں گی۔ چند ایک کا کُل مقصد دوسروں کے مقابلے میں اچھے کپڑے پہننا تھا جن کی تعریف اگر کسی روز کوئی نہ کر سکے تو یہ ضرور اس کی بد تعریفی کرتیں۔ آدھی درجن کے قریب تعداد ان بیچاریوں کی تھی۔ جنھوں نے پکی عمروں میں جوان اور نکمّے مردوں سے شادیاں کر رکھی تھیں یہ کما کر اور پکا کر انھیں کھلاتیں اور وہ بلا ناغہ ان کی ٹھکس کرتے۔ دو تین کے بارے میں سُنا کہ وہ شوہروں کے لیے ترستی تھیں۔ مگر جب کبھی کوئی رشتہ آتا تو خود سب سے پہلے اسے مار بھگاتیں۔ اس شک میں کہ شاید آنے والا ان کے سرمائے کے لالچ میں آیا ہے یا پھر کماؤ بیوی کا طلبگار ہے۔ رضیہ نے انھیں ایجوکیٹ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، مگر اُس کی ان سے گھٹتی خوب تھی۔ فرصت کے گھنٹوں میں وہ ضرور ان کی منڈلی میں گھس کر بیٹھتی اور بڑے انہماک سے پیچش کی بیماری کے نسخے، اچار بنانے کی ترکیبیں، بگڑے شوہروں کے لیے تعویذ گنڈے اور "بری" عورتوں کے لیے ٹونے ٹوٹکے کروانے کی تفصیلیں سُنا کرتی۔ مگر ہر وقت اپنی زرہ بکتر مضبوطی سے کسے رکھتی۔ کبھی بھولے سے بھی اس نے اپنے دُکھ سُکھ کا ذکر نہیں چھیڑا۔ اس معاملے میں وہ بڑی فن کار تھی۔ اپنی بڑی بڑی حسرتیں دبا کر لوگوں کے بے معنی دکھوں پہ رونا،

اپنے گھاؤ نظر انداز کر کے دوسروں کی خراشوں پہ مرہم رکھنا فن نہیں تو کیا ہے؟ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ شعروں میں باتیں کرتی اور باتوں میں کہانیاں سُناتی ہوئی رضیہ کے اندر کیا ہے؟ اس کے دل میں کتنے دکھوں نے گھر بنا رکھے ہیں اور گھر میں کتنے مسائل کے ڈیرے ہیں۔ صرف مجھے اندازہ تھا کہ اس کی زرہ بکتر اندر ہی اندر ٹوٹ رہی ہے۔

دونوں چھوٹی بہنیں جوان ہو چکی تھیں۔ اپنے مخصوص طبقے کے گھٹے ہوئے ماحول میں پلنے والی لڑکیوں کی طرح اَن گنت خوابوں کے تانے بانے اپنے گرد ان دونوں نے بھی بن رکھے تھے۔ زندگی کی خواہشات اور توقعات کا گھیرا دن بدن تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس گھیرے کو توڑ کر بیرونی دنیا سے ناطہ جوڑ لینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ محرومیوں کے مارے ہُوئے سارے لوگ تو دوسروں کے لیے قربانیاں نہیں کر سکتے۔ تاہم وہ دونوں رضیہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے اس حد تک ضرور تیار تھیں کہ ملازمت کر لیں۔ دونوں بی اے۔ بی ٹی کر چکی تھیں۔ ان کی ملازمت کے لیے دوڑ دھوپ ہم دونوں نے شروع کی تو پتہ چلا کہ ٹیچر کی اسامیوں پر درخواست دینے کیلئے بنیادی اہلیت سیکنڈ کلاس بی اے۔ بی ٹی کے علاوہ دو اور شرائط بھی ہیں جن میں سے کم از کم ایک کو پُورا کرنا امیدوار کے لیے اشد ضروری ہے۔ ان میں سے پہلی شرط تو سفارش کی تھی۔ دوسری رشوت۔ پہلی شرط پوری کرنے کے لیے ہم نے کئی وزیروں کی کوٹھیوں کے بہت سے طواف کرنے اور دفتروں کے باہر لمبی لائنوں میں بہت بہت دیر کھڑے رہنے کے بعد بالآخر دو عدد سفارشی چٹھیاں حاصل کر لیں اور اپنی دانست میں بڑا معرکہ مار لیا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ ایسی چٹھیاں تو سینکڑوں درخواستوں کے ساتھ پروئی رکھی ہیں۔ وزیر بیچارے تو سب کے سب اتنے اچھے ہیں کہ کسی کو بھی مایوس نہیں کرتے۔ ویر اُدھر ہر کسی کو چٹھی لکھ دیتے ہیں۔ یہ تو محکمہ ہی ایسا بد ذات ہے کہ چند اسامیاں نکال کر

ہزاروں امید وار جمع کر لیتا ہے۔ پھر انھیں نوکریاں دینے کی بجائے مایوسیاں دیکر واپس بھیج دیتا ہے۔ تقرر تو چند خاص لوگوں کا ہوتا ہے وہ چند خاص لوگ جن کے لیے اُوپر سے ٹیلی فون آجاتے ہیں۔ یا پھر دوسری شرط پوری کرنے والوں کی مرادیں برآتی ہیں۔ دوسری شرط کی تفصیل سنی تو جون کے مہینے میں سردی لگنے لگی! چار ہزار نقد ملازمت کے لیے۔ دو ہزار خاص لاہور میں تقرری کے لیے، اچھے سکول کے لیے مزید ایک ہزار۔

ویسے لڑکیوں کی کامیابی کا راستہ ایک اور بھی تھا جو امید واروں کو سیدھے سیدھے ڈائریکٹر صاحب یا سیکرٹری صاحب کے دفتر کے ملحقہ ویٹنگ روم میں لے جاتا تھا۔ وہاں سے آگے کامیابی کی منزلوں کے نشان ملتے تھے۔ رضیہ کی بہنوں کے لیے نہ اُوپر سے کوئی ٹیلی فون آیا نہ اُن کے پاس پانچ ہزار روپے تھے اور نہ ہی وہ سیکرٹری صاحب کی انتظار گاہ تک جاسکتی تھیں۔ لہٰذا گھر بیٹھ کر اپنی کم نصیبی پر کڑھتی رہیں۔ یہ لڑکیاں نہیں جانتیں کم نصیبیاں کہاں سے آتی ہیں اور کیوں آتی ہیں۔ بے بس ہو کر بیٹھ رہیں۔ رضیہ جانتی تھی کہ کم نصیبیاں کہاں سے آتی ہیں مگر وہ بھی بے بس ہو کر بیٹھ رہی۔

شادی کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ کئی لوگ رشتہ دیکھنے آئے مگر گھر کی حالت دیکھ کر چُپ چاپ لوٹ گئے۔ ایک صاحب زادے چھوٹی والی پر خود بھی فریفتہ ہُوئے۔ ماں کو لڑکی دیکھنے بھیجا، مگر وہ جتنی دیر بیٹھیں مہنگائی کی باتیں کرتی رہیں۔ مٹھائی کی پلیٹ یہ کہہ کر پرے سرکا دی کہ انھیں شوگر کی بیماری ہے۔ گھر جا کر غالباً انھوں نے بیٹے کو رشتوں ناطوں میں سماجی حیثیت کی اہمیّت کا احساس دلایا ہو گا۔ اسی لیے چند مہینوں کی خاموشی کے بعد خبر آئی کہ صاحب زادے بیاہے گئے۔ باقی تفصیل تو معلوم نہیں یہ البتہ سُنا کہ جہیز کا سامان ٹرکوں میں لاد کر گیا تھا۔ رضیہ کی بہنیں ہی کیا کتنی اور لڑکیاں بھی ہیں کہ جن کے پاس ڈگریاں ہیں انھیں نوکریاں نہیں ملتیں۔ یہ خوب صورت

شریف اور سگھڑ لڑکیاں ہیں مگر ان کی شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ بے مصرف زندگیاں بے مصرف جوانیاں اور بے مصرف تعلیم!!

اگلے سال چھوٹے بھائی نے میٹرک میں فسٹ ڈویژن لے کر اچھے کالج میں داخلہ لینے کا خواب دیکھا، مگر رضیہ شاید تھک چکی تھی۔ چپ چاپ جا کر اسے اس کالج میں داخل کروا آئی جہاں لڑکے فقط غنڈہ گردی سیکھتے ہیں۔ اچھا ہے' اس نے کہا، زندہ رہنے کے گُر سیکھ لے گا۔ اس معاشرے میں شریف اور ہنرمند لوگ بے کار ہیں بے بس ہیں۔ بے معنی ہیں!

یہ انھیں دنوں کی بات ہے جب میں نے رضیہ کو اس کی گرتی ہوئی صحت کی طرف دھیان دلایا۔ ہاں، اس نے کہا، صحت کو گرانے والی سو چیزیں ہیں، بچانے والی ایک بھی نہیں،، پھر چند ماہ بعد اس نے اپنی ایکسرے رپورٹ میرے سامنے ڈال دی۔ لو جی اپنا تو وقت پورا ہوا، سنبھالو اپنی دنیا!" اس کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔

ارے ہٹاؤ بھئی رضیہ تم تپ دق کو کیا سمجھتی ہو۔ آج کل تو یہ کھانسی زکام کے برابر ہے دوا علاج کیا ٹھیک ہو گئے۔ شکر کرو کہیں تمہیں کینسر نہیں ہو گیا۔ مَیں نے اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو، مگر اس دَور میں تو کھانسی زکام کا علاج کروانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی اس بات کی تصدیق اگلے روز ہی ہو گئی جب ڈاکٹر کی فیس ایکسرے کا خرچ اور دوائیوں کا بل سامنے آیا۔ یہ سب رضیہ کی آدھی تنخواہ کے برابر تھا۔ خوراک کا چارٹ جس میں دُودھ، مچھلی انڈا گوشت اور پھل لکھے تھے۔ اس کے علاوہ تھا اور چھٹی لے کر مکمل آرام کا مشورہ، دل کو غموں فکروں سے آزاد رکھنے کی ہدایت ان سب کے علاوہ تھی، رضیہ کے لیے یہ سب کچھ ہونا چاہیے مگر کس طرح اچانک مجھ پہ جیسے کوئی بڑا انکشاف ہُوا۔ ہم بھی کیسے بدھو ہیں۔ رضیہ تم تو سرکاری ملازم ہو، تمہارا علاج تو سرکاری ہسپتال سے سرکاری خرچ پہ ہو گا اور میڈیکل لیو بھی

مل جائے گی۔" صرف ایک ماہ کی نا۔ اس کے بعد آدھی تنخواہ پر رضیہ نے جیسے فاصلے
سے بات کی۔ ایک مہینے میں تم بھلی چنگی جو ہو جاؤ گی۔

اگلی صبح میں اسے ہسپتال لے گئی۔ پہلے تو باری کے انتظار میں اتنی دیر تک
بیٹھنا پڑا کہ بنچ کی لکڑی جسم میں سرایت کرتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ باری آنے پر
مصروف ڈاکٹر نے ٹیلی فون کان سے لگائے لگائے ایک عجلت اور قدرے بیزاری
کی نگاہ ایکسرے پلیٹ پر ڈالی اور کیس ٹی بی وارڈ کو ریفر کر دیا۔ ٹی بی وارڈ کے ڈاکٹر
نے ہمیں قدرے بہتر سلوک کا حق دار سمجھا اور رسان سے سمجھایا کہ مرض کم از کم ایک
سال پرانا ہے۔ اس کے مناسب علاج کے لیے مریض کا ہسپتال میں داخل ہونا
ضروری ہے۔ تو آپ داخل کر لیجیے ابھی، میں نے رضیہ کو بولنے کا موقع دیئے بغیر
کہا۔ مگر سرِدست تو یہاں کوئی بیڈ خالی نہیں۔"

بیڈ کب تک خالی ہو جائے گا؟

اس طرح تو کبھی نہیں ہوگا، یہ دیکھیے، اس نے ایک لمبی فہرست میرے
سامنے ڈال دی۔ یہ سب لوگ ٹی بی کے مریض تھے اور بیڈ خالی ہونے کے انتظار
میں جی رہے تھے۔ پھر؟ میں نے فہرست سے نظریں اُٹھائے بغیر بے کسی سے
پُوچھا۔ بہتر ہے آپ اُوپر سے سفارش کروا لیں۔ کسی منسٹر کی چٹھی لے آئیں"
میری نظروں میں چٹھیوں کا وہ ڈھیر گھوم گیا جو ڈائریکٹر ایجوکیشن کی میز پر لوگوں کی
درخواستوں کے ساتھ رکھا تھا۔ یہ سب منسٹروں کی چٹھیاں تھیں اور جو بعد میں
یہاں بھی وزیروں کی چٹھیوں کا کوئی پلندہ نکل آیا اور پھر چٹھی حاصل کرنے کے لیے
وزیروں کی کوٹھیوں کے طواف، دفتروں کے چکر، لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں، انتظار
مایوسی PAS کی سرد مہریاں، سیکرٹریوں کے مغرور و بدتمیز لہجے، تصور ہی سے
میرے پاؤں دکھنے لگے۔ مگر رضیہ کی زندگی کا سوال تھا، زندگی کی اپنی کوئی وقعت
نہ سہی۔ پانچ افراد کی روزی اس کے دم سے تھی۔ ہفتے بھر کی مہم جوئی کے بعد
ایک آنر ایبل منسٹر کی طرف سے کاغذ کے ایک پُرزے پر Sympathetic Consideration

کا جملہ لکھا ہُوا مل گیا۔ اس قیمتی کاغذ کو مٹھی میں دبائے میں سیدھی ہسپتال پہنچی۔ ڈاکٹر نے چٹھی میرے ہاتھ سے لے لی اور ایک نظر دیکھ کر رجسٹر کے ایک صفحے پر ٹانک دی۔ "پندرہ دن بعد پتہ کر لیجئے۔ اس وقت تک شاید ایک بیڈ خالی ہو جائے" اور دوسری طرف گھوم کر سامنے بیٹھے ہوئے مریض کے سینے پر انگلیاں بجانے لگا۔ پندرہ دن .... شاید یہ کسی کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے .... شاید۔ اوہ معاف کیجئے۔ دروازے سے نکلتے وقت موٹی نرس سے میری ٹکر ہوگئی۔ مگر وہ بہت مہربان نرس تھی۔ اس نے مجھے اندھی کہہ کر ڈانٹنے کی بجائے ہمدردی سے پُوچھا کون بیمار ہے آپ کا، بہت پریشان معلوم ہوتی ہیں"۔

میری بہن ہے۔

ہچ ہچ۔ کونسی سٹیج ہے۔

دوسرا پھیپھڑا بھی متاثر ہو چکا ہے۔

ہچ ہچ۔ اس نے ایک بار اور اظہار تاسف کیا۔ پھر اس نے مدد کی، صحیح راستہ دکھایا" آپ ایسا کریں ڈاکٹر صاحب کو گھر پہ دکھا لیں۔ اس میں آسانی رہے گی۔ اسی شام میں رضیہ کو سرکاری ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک لے گئی۔ سپیشلسٹ کی فیس دے دی گئی اور انھوں نے ایک چٹ لکھ کر اگلے دن دس بجے مریض کو ہسپتال بلا لیا۔ یہ بات میں نے رضیہ کو کبھی نہیں بتائی کہ اسے ملنے والا بیڈ کس طرح خالی ہوا تھا۔ ورنہ وہ داخل ہونے سے انکار کر دیتی۔ ہُوا یہ کہ ایک بے حد خستہ حال مریض کو (جسے چٹھی دینے والا وزیر غالباً" کرسی سے اُتر چکا تھا) پلنگ سے اتار کر نیچے زمین پر ڈال دیا گیا تھا۔ مگر ایک ہفتے بعد اُس نے وہ زمین بھی خالی کر دی۔ اُس کے ٹھیک پانچ مہینے بعد رضیہ نے بھی وہ بیڈ خالی کر دیا۔ خالی کہاں رہا ہوگا اب اس پہ کوئی اور انسان لیٹا ہوگا اور دوسرا اس کے خالی ہونے کے انتظار میں کھڑا ہوگا۔ جانے کتنے بیڈ ہیں اور کتنے لوگ منتظر! میں نے رضیہ

سے ایک جھوٹ بولا تھا: تپ دق کی بیماری کا علاج دریافت ہو چکا ہے، سوچ رہی ہوں خود مجھ سے یہ جھوٹ کس نے بولا تھا؟

مَیں تو یہ بھی سوچ رہی ہوں جب ویراں مَری تھی تو میں نے اُس کی سوتیلی ماں سے نفرت کی تھی۔ آج رضیہ کے مرنے پر کس کس سے نفرت کروں، خود اُسی سے لڑ لینے کو جی چاہتا ہے۔ اُسے اس طرح نہیں مرجانا چاہیے تھا۔ آخر اُس کی موت کس کام آئی، کہاں فرق پڑا؟ زندگیاں سوارت کرنے کے سبق دینے والی نے اپنی موت بھی ضائع کر دی۔ اس سے اچھّی تو ویراں رہی جس نے مَر کر باپ کے گھر سے ظلم کا خاتمہ تو کر دیا تھا نا۔ اُس کے نہ رہنے سے منگو دھوبی کی بیوی کسی بچّے کی سوتیلی ماں نہیں رہی تھی۔ رضیہ کے جانے سے نہ کہیں ظلم کم ہُوا نہ سوتیلے بچّوں کی تعداد گھٹی۔ نہ وہ لوگ کم ہُوئے جن کے پھیپھڑوں پہ داغ ہیں۔ اُس قطار میں سے ایک آدمی تک کم نہ ہو سکا جو ہاتھوں میں سفارشی چٹھیاں تھامے بیڈ خالی ہونے کے انتظار میں ہسپتال کے باہر کھڑے ہیں۔

آج میرا جی چاہتا ہے مَیں بہت سے لوگوں کو جمع کر لوں۔ ان سب کو جن کے پھیپھڑے داغدار ہو چکے ہیں اور ان سب کو جو وزیروں کی چٹھیاں حاصل کرنے کے لیے اُن کی راہوں میں کھڑے رہتے ہیں اور ان سب کو جو چٹھیاں ہاتھوں میں تھامے ہسپتال کے باہر بیڈ خالی ہونے کے انتظار میں کھڑے ہیں اور ہاں ان سب کو بھی جنھیں مرنے سے پہلے ہی زمین پر پھینک دیا جاتا ہے اور پھر ان سب سے کہوں جلدی کرو، وقت ضائع نہ کرو، اپنی موت ضائع نہ کرو، اُٹھاؤ کلہاڑے، اُٹھاؤ بھالے.. لفٹ رائٹ.. ڈبل مارچ.. چلو چلو ظلم کے جنگل کی طرف لگاؤ ضرب۔ کاٹ ڈالو اس کی جڑیں اڑا دو یہ شاخیں، انھیں شاخوں پہ سوتیلی ماؤں سے زیادہ ظالم چہرے اُگتے ہیں۔ تمہیں ایسا کرنا ہی ہو گا ورنہ تم سب چپ چاپ مرجاؤ گے، جیسے ویراں مری تھی، جیسے رضیہ مرگئی ہے۔ ہاں تم ایسا نہیں کرو گے تو دیکھ لینا خربوزوں کی مہک کا موسم کیا، سال کا ہر موسم تم پہ بھاری ہو گا!

مئی ۱۹۷۴ء

مرکزِ فکر و یقیں

میرے گھر میں دو تصویریں لگی ہیں اور میرے سرہانے چند کتابیں رکھی ہیں۔ یہ دو تصویریں انھی ہستیوں کی ہیں جنھیں قوموں کی زندگی میں پیغمبروں اور اوتاروں کے برابر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ میں نے ان ہستیوں کو آنکھوں سے نہیں دیکھا، مگر انھیں تصویروں میں دیکھ کر ہمیشہ محسوس کیا جیسے ان کے ساتھ میرے بڑے گہرے رشتے ہیں۔ بہت بڑے بندھن ہیں — یہ رشتے اور بندھن کیسے ہیں؛ ان میں محبوبیت زیادہ ہے یا ادب و احترام، میں نہیں کہہ سکتی مگر جو کہہ سکتی ہوں وہ یہ کہ ان دونوں کی آنکھیں ہر وقت جاگتی رہتی ہیں اور مجھ سے چپکے چپکے کچھ کہتی ہیں۔ میری نگاہ جب کبھی ان کی جانب اُٹھی بصد احترام اُٹھی، سر ادب سے جھک گیا اور دل ناتواں میں عظمتوں کی تمنا سر بلند ہوئی۔ مگر اب کچھ عرصے سے معاملات وہ نہیں رہے جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ حُسن کی شوخیاں ماند پڑگئی ہیں یا عشق کی گرمیاں وہ نہیں رہیں۔ حالات بدل گئے ہیں یا میرا دل بدل گیا ہے۔ ان محترم ہستیوں کے حضور سر تو اب بھی ادب سے جھک جاتا ہے مگر نگاہ اُدھر کو نہیں اُٹھتی ... اور عظمتوں کی تمنا بیمار پڑی ہے۔ احساسِ جرم ہے یا خیالِ ندامت جو دل اتنا پشیماں ہے۔ مگر اندر سے کہتا ہے میں ناکردہ کار ہوں۔ میں نے ہمیشہ بندگی کی۔ میرے لیے یہ آنکھیں خاموش کیوں ہوئیں؟ دوسری آواز صاف کہتی ہے یہ ملّت کے گناہ ہیں ان کی سزا افراد کو بھی ملا کرتی ہے۔ یہ ہستیاں جن کے عکس میں نے گھر میں سجا رکھے ہیں۔ ان میں ایک اقبال ہے جو شاعر ہے اور دوسرا انقلابی ہے، میرا ان کے ساتھ قوم کا ناطہ ہے، اِنسانیت کا رشتہ ہے، صرف ذات کا بندھن تو نہیں ہے۔

اسی طرح اب تک جو کتابیں پڑھی ہیں ان میں دو کتابیں ایسی ہیں کہ انھیں جب کبھی پڑھا دلِ ناتواں کو قوتوں کا احساس ہوا اور رفعتوں کی تمنا جاگی۔ یہ کتابیں دنیا کی سب سے بڑی کتابوں میں سے ہیں۔ ان تمام کتابوں میں جو انسانوں پر الہام سے اُتریں اور جو انسانوں نے انسانوں کے لیے لکھیں۔ یہ تذکرہ ہے کلام پاک اور کلامِ اقبال کا۔ مگر کتنے ہی دنوں سے یہاں بھی وہی بات ہوئی کہ انھیں کھول کر پڑھنے کی جرأت نہ کر پائی۔ دل کو کمزوری کا عارضہ شدید طور پر لاحق رہا مگر میں قوت کے ان سرچشموں سے فیض نہ پا سکی۔ وجہ ایک تو وہی اُوپر والی بات خوف اور احساسِ جرم دوسرے غالب والی بات یعنی کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ۔ ایک تیسری بات اور بھی ہے۔ جسے علامہ اقبال کے الفاظ میں بے یقینی کہہ لیجیے۔ دلِ ناتواں کی حُجت کہ یہ کتاب نہ جانے کس قوم کو حکمت و ہدایت بخشنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ ہمارے پاس تو جو حکمت ہے وہ افرنگی۔ جو ایمان ہے وہ زناری۔ اور یہ شاعرِ مشرق تو نہ جانے کس مردِ مومن کی بات کرتا ہے جو تقدیرِ عالم کو بے حجاب دیکھ لیتا ہے۔ ہم تو خود اپنی ظاہری حالت سے بھی آگاہ نہیں۔ ہم کیا جانیں وہ کن لوگوں کی گزرگاہیں ہیں جہاں ستارے گردِ راہ ہوتے ہیں۔ ہمیں تو اس مٹی کی دھرتی پہ آبرو سے رہنا بھی میسّر نہیں۔ جس قوم پہ اتنے بڑے بڑے افکار نازل ہوتے ہوں وہ قوم ہماری نہیں ہو سکتی۔ قرآن اور اقبال ہمارے لیے ہوتے تو کیا ہم یوں بے آئین پھرا کرتے۔ اتنے بے اصول ہوتے؟ ہم وہ لوگ نہیں جو صاحبِ کتاب ہوتے ہیں۔ صاحبِ کتاب ہوتے تو کیا صاحبِ کردار نہ ہوتے؟ ہم تو اپنے آپ کو کسی ہابیل و قابیل کی بستی کے بسنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ جن پر ابھی کوئی کتاب نہیں اتری۔ نہ انھوں نے کوئی دستور ہی بنایا ہے، جو اطمینان سے ایک دوسرے کا گلا کاٹے چلے جاتے ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون میں انگلیاں ڈبو کر اپنے بدن پر گل بوٹے بناتا ہے اور ہذیانی قسم کے قہقہے لگاتا ہے۔ یہ تھی وہ کٹھ حجتی جس کی بنا پر کتنے ہی دن نہ میں

نے قرآن کو کھولا نہ اقبال کو پڑھا۔ مگر چونکہ معلم ہوں نصاب کی کتابوں میں کچھ اجزا اقبال کے بھی شامل ہیں۔ ایک دن کسی تدریسی ضرورت سے ضربِ کلیم کھولی تو نگاہ ان اشعار پہ جم کر رہ گئی ؎

اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں مِلّت کے گناہوں کو معاف

یہ اگر پیش گوئی ہے تو فقط ہمارے لیے۔ دلِ ناداں کو اپنی حجت ختم کر کے اقبال کی بات پہ ایمان لانا پڑا۔ اور یوں اس آرزو کا ورُود ہوا کہ اقبال کے ساتھ ہمارا رشتہ اس رسم سے آگے بڑھے جو ہر سال ۲۱۔ اپریل کو یومِ اقبال مناکر ادا کی جاتی ہے۔ یہی بات سوچ کر ہم نے شہر لاہور کے اقبال شناسوں کو ڈھونڈا کہ کچھ حالِ دل کہیں تو کچھ سُنیں۔ کچھ دیدۂ نمناک کا ذکر چلے۔ دل کے زخموں کا فسانہ ہو۔ کچھ دامنِ تار تار کا قصّہ کریں۔ رِستے زخموں کا مداوا اگر نہیں تو گھاؤ کے اندر کی ٹیس جگائے رکھنے کی کوئی تدبیر ہی سہی۔ دامن کے چاک رفو نہیں ہوتے تو تن کی عُریانی کا کچھ شعور ہی باقی رہ جائے۔ تمنائیں کرنا ابھی جرم قرار نہیں پایا تو ہم نے تجدیدِ عہدِ وفا کی تمنا کی ہے، ٹوٹے رشتوں کو استوار کرنے کی سوچی ہے اور یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ اقبال کے پیغام کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطے کو سمجھ کر وردِ زباں ہی نہیں محرکِ عمل و جزوِ ایمان بنایا جائے اور دیکھا جائے کہ اس نے ہمارے لیے اور کون کون سی پیش گوئیاں کی ہیں۔

مثالیں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے نہ تاریخ کا ورق الٹنے کی، ہم ہی وُہ گناہ گار ملت ہیں جنھیں فطرت نے معاف نہیں کیا۔ ہم نے گناہ کیے مگر کفارہ کبھی نہیں دیا۔ اب بھی بس کہاں ؟ جہاں گناہ کا عمل بڑھتا جا رہا ہے۔ عتاب کی حد بھی جاری ہے۔ اس سے بڑا عتاب اور کیا ہو گا کہ دو سو برس کی غلامی

کے بعد کوئی قوم آزادی کی لگن لے کر اُٹھے اور ایک شان سے اُٹھے مگر صرف ۲۵ برس بعد ہی اس بری طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے۔ اس سے کہیں زیادہ مدت تو اس قوم کو منظم ہونے میں لگی تھی۔ خوابوں کا پریشان ہونا تو سنا ہی تھا تعبیروں کا پریشان ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہم نے ان پچیس برسوں میں کوئی گناہ کبیرہ ہی کیے ہوں گے۔ ورنہ قوموں کی زندگی میں اتنی جلدی زوال نہیں آیا کرتے۔ ایک ہزار برس کی حکمرانی اور عروج کے بعد جو زوال آیا تھا وہ تاریخ کا قدرتی عمل تھا۔ پھر اس کے بعد بھی کچھ ایسے بیج بچ ہی رہے تھے۔ جن سے آئندہ رہنے والی نسل پیدا ہوئی تھی۔ آج جس قومی زوال سے ہم دوچار ہیں وہ ایسا بھی تو نہیں کہ اسے سیاسی کمزوری یا اقتصادی زبوں حالی تک کا معاملہ سمجھا جائے۔ یہاں تو قومیّت کی روح پہ کوئی فالج گرا ہے جس نے ساری قوم کو نیم جان کر کے رکھ دیا ہے۔ فکر کی بات یہ بھی ہے کہ قومیں اپنے آغازِ شباب میں اس طرح بیمار ہُوا نہیں کرتیں۔ یہ کوئی ناگہانی مرض تھا یا پھر قوم کا خون ہی اتنا کمزور تھا کہ وہ معمولی سے مرض کا حملہ برداشت نہیں کر سکی۔ اقبال کی حکمتِ عملی ہی اس غیر معمولی قومی بیماری کی تشخیص میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ وہی مرض ہو جسے اس نے بے یقینی اور ضعفِ خودی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اقبال حکیم الامت ہے اُسے مسلمان قوم کے پُرانے اور نئے تمام امراض کا علم ہے۔ اس نے دلی غرناطہ قرطبہ اور بغداد کی تباہی پر تاریخ سے بہتر تحقیق کی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب بھی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ بانگِ درا اور ضرب کلیم میں لکھے ہوئے ہیں۔ آج زندہ رہنے کے لیے قوموں کو ہر آن فکرِ تازہ اور جدّتِ کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سا اسلحہ خریدنے یا فوجوں کی تعداد بڑھانے سے قومیں مضبوط نہیں ہوا کرتیں۔ ان کا اصل دفاع تو ان کے فکر و یقین کا مرکز ہوتا ہے جو نہ تو ٹینکوں سے ٹوٹ سکتا ہے اور نہ ہی میزائلوں سے سر کیا جا سکتا ہے۔

ویت نام کی قوم کا یہی دفاع مکمل تھا، جبھی تو اس چھوٹی سی قوم نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے ساتھ اتنی طویل جنگ لڑی۔ بیس برس تک ان پہ آگ برستی رہی۔ مہلک ترین ہتھیار اُن پر آزمائے گئے مگر کیا ہوا۔ اس آگ سے بدن چاہے جھلسے گئے مگر روح پہ آنچ نہ آسکی، ضمیر جاگتا رہا۔ اس لیے کہ زندہ رہنے کا مقصد موجود تھا، قوم کے اجتماعی وجود کا ایک محور قائم تھا۔ ہم جو آج شکستہ وخستہ بیٹھے ہیں کوئی صورت اتحاد و تنظیم کی پیدا نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے فکر ویقین کا مرکز کوئی نہیں رہا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور مغربی پاکستان کے صوبوں میں دن بدن بڑھتی ہوئی بیگانگی اور اجنبیت کے لیے چاہے بظاہر کتنے ہی اور وجود دکھائی دیتے ہوں، اصل اور بنیادی وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ پاکستانی قوم کے فکر ویقین کا مرکز کوئی نہیں، قوم کے اجتماعی وجود کا محور ٹوٹ چکا ہے۔ مختلف گروہ جغرافیائی لسانی اور نسلی بنیادوں پر اپنا اپنا محور تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ دَور چھوٹے چھوٹے گروہوں کے زندہ رہنے کا دَور نہیں ہے، اس دَور میں بڑی بڑی اور منظم قومیں ہی سلامت رہ سکتی ہیں۔ ہم اگر مسلمان نہ بھی ہوتے تب بھی ہمیں صوبوں اور زبانوں سے آگے نکل کر قوم کا اجتماعی مرکز تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی۔

چوتھائی صدی پہلے برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے اجتماعی وجود کے تحفّظ اور اپنے فکر ویقین کے مرکز کی تلاش پاکستان میں کی تھی، اس وقت یہ قوم اتنی بالغ نظر اور پختہ کردار اس لیے ثابت ہوئی تھی کہ سرسید اور علامہ اقبال؁ کی قیادت انھیں فکر ویقین کے نظریاتی مرکز تک پہلے لے آئی تھی، اس کے بعد محمد علی جناح کی رہبری میں پاکستان کی جغرافیائی بنیادوں تک پہنچی۔ لیکن بعد میں فکر اقبال کو بھلا کر غلط بنیادوں پر فکری مرکز تلاش کیا جانے لگا، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو صوبائی و لسانی تعصبات کا شکار نہیں ہوئے اور بڑے خلوص سے پاکستانی قوم کی وحدانیت کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں تھے، غلط

راستوں پہ چلتے رہے۔ یہ لوگ قوم کے اتحاد اور یقین کا مرکز سیاسی پارٹیوں، نظریوں اور شخصیتوں میں تلاش کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جتنی یہ تلاش بڑھی اسی قدر قوم اپنی نظریاتی اساس سے دُور ہٹتی چلی گئی اور وہ وقت آ پہنچا کہ جب بنیاد اور عمارت میں کوئی جوڑ باقی نہ رہا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کا علیحدہ علیحدہ ہو جانا، جغرافیائی فاصلے یا سیاسی تصادم کی بنا پر نہیں تھا بلکہ قوم کے اجتماعی نظریاتی مرکز کی شکست تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان کے صوبے جو ہمیشہ سے ایک جغرافیائی اور تہذیبی وحدت رہے ہیں۔ لسانی اور نسلی تفرقوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ سیاسی پارٹیوں اور شخصیتوں میں اتحاد کے مرکز کی تلاش بھی ناکام ہو چکی ہے۔ اگرچہ قوم میں بطور ایک قوم کے زندہ اور باقی رہنے کی خواہش موجود ہے مگر کوئی دانائے راز ایسا نہیں جو اُسے مرکزِ اتحاد و یقین تک لے آئے۔ اس وقت کسی ایسی شخصیت کے وجود پذیر ہونے کا امکان بھی نہیں۔ اس لیے کہ اوّل تو ساری دُنیا ہی میں شخصیتوں کا دَور ختم ہو چکا ہے، دنیا شخصیتوں کے سحر سے نکل رہی ہے۔ پاکستان میں شخصیتوں کا طلسم ان کی ناکامیوں کی وجہ سے ٹوٹ چکا ہے۔ یہ ناکامیاں اس لیے ہوتی رہیں کہ یہاں شخصیتیں قوم کو کوئی فکری مرکز دینے کی بجائے اپنی ذات کو مرکز بنانے کی کوشش کرتی رہیں اور کسی آئیڈیل کی جانب قوم کی راہبری اور قیادت کرنے کی بجائے اپنی ذات کو قوم کا آئیڈیل بنائے رکھنے پر مُصر اور کوشاں رہیں۔ یہ صورتِ حال بڑے نقصان کا باعث بنی ہے۔ اس سے نہ صرف قیادت کا منصب ہی بگڑ گیا ہے بلکہ قوم مستقبل کی جانب اپنا سفر جاری رکھنے کی بجائے ایک جمود اور تعطّل کا شکار ہو گئی۔

ان حالات میں اگر ہمیں اپنی قومی زندگی کی بقا اور بچاؤ کی کوئی فکر ہے تو اپنے نظریاتی مرکز کو بحال کرنا ہوگا۔ قوم جو بے یقینی کے مرض سے نڈھال ہو رہی ہے۔ اسے ذہن جسم اور یقین کی اکائی بن کر زندہ رہنے کی تربیت دینا ہوگی۔

ہمارا نظریاتی مرکز کیا ہے، قوم کی بے یقینی کیوں کر ختم ہو گی، ذہن جسم اور یقین کی وحدت کے ساتھ زندہ رہنے کا عمل کس طرح ہو گا؟ ان سوالوں کا جواب ہمیں مل جاتے گا۔ اگر ہم یہ سمجھ سکیں کہ اقبالؒ کے ساتھ پاکستانی قوم کا رشتہ کتنا بڑا اور گہرا ہے۔ یوں تو وہ دَورِ جدید میں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا مفکر ہے۔ اس کے افکار ملتِ اسلامیہ بلکہ ساری انسانیت کے گرد احاطہ کرتے ہیں۔ مگر پاکستان تو خود اقبال کا خواب تھا۔ اِس کی نظریاتی اساس جو ملت کے لیے محرکِ عمل و سرمایۂ یقین بنی اور وہ مردِ راہداں جس کا نام محمد علی جناح تھا، اقبال ہی کی تلاش کا حاصل تھے۔ اس وقت کے حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اقبال کو پھر سے پڑھیں۔ ---------- کلام اقبال کی سچائیوں کو سمجھیں اور ان کی روشنی میں زندگی کی ان حقیقتوں کو دیکھنا اور سمجھنا شروع کریں جنھیں نہ دیکھ کر ہم پچیس سال ٹھوکریں کھاتے کھاتے آخر اُوندھے منہ گر پڑے۔ آج جبکہ وقت نے ہم سے فیصلہ طلب کر لیا ہے کہ ہمیں پاکستانی قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے یا نہیں، اس محشر کی گھڑی میں پاکستان کی نظریاتی اساس کو تلاش کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ۱۹۴۷ء میں پاکستان حاصل کرنا۔ مگر اس مقصد کے لیے پیغامِ اقبال کو جتنا اور جس طرح سمجھنے کی ضرورت ہے وہ چند مقالے پڑھنے یا لکھنے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے افکار ہماری قومی زندگی کی بنیادیں ہیں۔ اُس کے افکار میں جہاں اسلام کی روح جلوہ گر ہے وہاں دنیائے اسلام کی تاریخ کا نچوڑ بھی موجود ہے۔ یہ تاریخ بہت بڑی قوت ہے۔ اس لیے ہمیں زوال کے دَور میں بھی زندہ رکھا۔ اسی تاریخ سے مدد لیکر ہم نے اس صدی میں نئے سرے سے اپنے قومی تشخص کو قائم کیا۔ جہاں تک اسلام کے نظریاتی نظام کا تعلق ہے وہ آج ہماری ہی نہیں ساری مہذب دنیا کی ضرورت بن چکا ہے۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام دنیا کا سب سے انقلابی اور انسانی مذہب ہے۔ جس نے چودہ سو برس پہلے دنیا

ہیں جو معاشرہ قائم کیا وہ طبقات سے مُعرا، استحصال سے پاک عدل اور مساوات کے اصولوں پر استوار تھا، فرد کا مقام اس کے ہنر اور صلاحیت کی بنیاد پر متعین ہوتا تھا۔ یہ بات جاننا تو زیادہ مشکل نہیں کہ معاشرے اور فرد کے کردار میں یہی اصول آج کی انسانیت کے بڑے آورش ہیں۔ اب تک اسلامی معاشرہ ہی وہ مثال ہے جہاں امتیاز بندہ و آقا کو ختم کر کے جمہوریت مساوات اور عدل کے اصولوں کو ایسے توازن کے ساتھ اپنایا گیا کہ انسان کی انفرادیت بطورِ انسان کے نہ صرف قائم رہی بلکہ اور زیادہ مستحکم ہوئی۔ ایسا معاشرہ اور اس کی اقدار مغربی اور مشرقی دنیا کا آئیڈیل ہے۔ بڑے بڑے تجربوں اور سوچوں کے بعد بھی بعض قومیں ابھی تک اس آئیڈیل کا ایک حِصّہ ہی حاصل کر پائی ہیں ـــ اب تک جہاں معاشی نظام میں ہمواری پیدا کی گئی وہاں فرد کی ذہنی آزادی محدود ہوگئی اور روح کی تشنگی بڑھ گئی۔ جہاں جمہوریت کا تجربہ کامیاب ہُوا وہاں معاشی مسائل حل طلب رہ گئے اور انسان کا مقام ابھی کسی معاشرے میں بھی متعین نہیں ہُوا۔ مگر اس حد تک بھی جن کی کوششیں کامیاب ہوئی ہیں وہ مشرق و مغرب کے غیر اسلامی ملک ہیں۔ آج کی اسلامی دنیا تو ابھی تک ان مقامات سے ناآشنا ہے۔ سارے مقامات کھو کر اس کے پاس تو بس ایک مقام رہ گیا ہے اور وہ ہے بے یقینی کا مقام۔

آج ہر قوم کے پاس ایک نظام فکر ہے۔ جسے وہ اپنی قومیت کی اساس اور اپنے علم و یقین کا مرکز بناتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر زندہ قوم کے کچھ خواب ہوتے ہیں۔ جن میں وہ اپنے مستقبل کے دُھندلے اور اجاگر نقوش دیکھتی ہے۔ مسلمان قوم کے پاس ایسا کوئی نظامِ فکر باقی نہیں رہا نہ اُس کے کوئی خواب زندہ ہیں۔ نہ مستقبل کا کوئی تصور باقی ہے اور نہ ہی قومی تشخص کی کسی اُمنگ کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام کے ساتھ جو رابطہ باقی رہ گیا ہے وُہ فقط اتنا ہے کہ رکوع اور سجدے کی حد تک ہم مسلمان ہیں مگر اس رکوع و

سجدے میں بھی سوز و جذب باقی نہیں، محض رسم سی ہے۔ کچھ جذباتیت ہے جس کا مظاہرہ ہم جلسوں جلوسوں میں کر لیتے ہیں یا پھر نعرے اور لیبل کے لیے اسلام اچھا ذریعہ ہے۔ یہ مرض آج لاحق نہیں ہوا۔ صدیوں پہلے جب ساری اسلامی دنیا زوال پذیر ہوئی تو بھی بنیادی سبب یہی تھا کہ علم و یقین کا مرکز مفلوج ہو گیا تھا، زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے کوئی مقصد سامنے نہیں تھا۔ فکر تازہ دینے والے ذریعے تحقیق و اجتہاد ختم ہو گئے تھے۔ اسلام کے فرسودہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہے کہ اس نظام میں کچھ ایسے عالمگیر اصول و اقدار ہیں جنھیں محض اجتہاد کی روح ہمیشہ زندہ رکھ سکتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج کی دنیا نے اسلام سے ملتے جلتے نظریے اپنا کر بہتر معاشرے کے حصول کے لیے تجربے کیے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ملّت کے اس دیرینہ مرض کی تشخیص کر کے اسے فکر تازہ بحث و لذت تجدید سے آشنا ہو کر پھر سے تمدن آفریں، خلّاق آئین جہانداری اور صاحب خلق عظیم کا مقام حاصل کرنے کا انداز سمجھایا —— پاکستان کا قیام عمل میں لاتے وقت قوم کے سامنے شاید یہی آورش تھے۔ یہ ایک عظیم خواب تھا۔ جس میں ساری ملّت اسلامیہ کی شیرازہ بندی بھی شامل تھی اور اس کی قیادت کا منصب بھی ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اسی نئی اور نظریاتی سٹیٹ میں غلامی کے کل ورثے کو جلا کر اپنی دنیا آپ پیدا کرتے، مگر جو ہوا وہ یہ کہ غلامی کے ورثے کو پھونک ڈالنے کی بجائے اسے سینے سے لگا لیا گیا اور اپنی دنیا بنانے کے لیے نئی بنیادیں استوار کرنے کی بجائے پرانے آسیب زدہ کھنڈروں میں ڈیرے ڈال دیتے گئے۔ ان آسیب زدہ کھنڈروں میں ساری قوم چوتھائی صدی تک بھٹکتی چیختی پھری۔ ان بھیانک دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان ہو گئی مگر باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا۔ یہ بڑا خوفناک منصوبہ تھا جو پاکستانی قوم کو بننے سے پہلے ہی بگاڑ دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس منصوبے

نے اسلام پاکستان اور اقبالؒ میں ہم آہنگی ختم کر دی۔ پاکستان لوٹ مار کرنے والوں کے کام آیا، اسلام کو مُلّا و شیخ نے اپنی جیب میں ڈال لیا اور اقبال ریڈیو پاکستان کے ہنگامی پروگراموں میں خانہ پُری کا ذریعہ بن گیا۔ یا پھر جاہل مولوی اور اَن پڑھ لیڈروں کی تقریریں سجانے میں کام آنے لگا۔ اقبال کو بھلا کر ہم نے اسلام کو ایک بار پھر مُلّا کے نظریے سے سمجھنا اور دیکھنا شروع کر دیا۔ غلامی کے ہر ورثے کو فروغ مِلا۔ قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد جاگیردار نے لیڈر کی قبا پہن لی اور اپنی جاگیر کی گدی کو اٹھا کر سیاست کی مسند کے اُوپر سجا لیا۔ یہ دونوں طبقے یعنی مُلّا و جاگیردار اپنے ذاتی و طبقاتی اغراض ایک جیسے ہی رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں نے ملاپ کر لیا اور جب ان کے ذاتی و طبقاتی اغراض کا تصادم انسان کی انسانی و عملی قوتوں اور قوم کے مفاد سے ہوا، تو ان دونوں نے مِل کر اسلام اقبال اور قوم کا استحصال کیا۔ مُلّا نے اپنی حیثیت باقی رکھنے کے لیے اسلام کو خانقاہی قسم کا مذہب بنانے کی کوشش کی۔ اس کے دائرہ عمل کو رکوع و سجدے تک محدود کر کے مسجد کے اندر مقید کر دیا اور مسجد کی کنجیاں اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لیے ان لوگوں نے قرآن کو بازیچہ تاویل بنا کر نئی شریعتیں تک ایجاد کر ڈالیں۔ یہی حال لیڈر کا تھا۔ حکومت و سیاست کا سربراہ جاگیرداروں کا جتھہ بن بیٹھا۔ یہ طبقہ اور ان کا ذہن و نظام دورِ غلامی کا اصل ورثہ تھے۔ انھیں فرنگی آقاؤں نے اپنی ضرورت کے مطابق بنایا اور عوام کے خلاف استعمال کیا۔ یہ طبقہ بہت گھٹیا سرشت کے لوگوں سے اُبھرا تھا۔ یہ لوگ اپنوں کے قاتل اور غیروں کے وفادار تھے۔ قوم و وطن ان کے لیے بے معنی تصور تھے، سیاست میں اس لیے آئے کہ اس کے ذریعے حکومت و اقتدار بھی اپنا ہو جائے۔ پاکستان بننے کے بعد مغربی پاکستان میں یہ طبقہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور اور مستحکم ہو گیا، عوام کے خلاف سازشیں کرنے میں چالاک و ماہر تو تھے ہی، چنانچہ ان

میں پاکستان اور قوم کی قوت کو دبائے رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ ان لوگوں نے اپنے سیاسی۔ مانی فسٹو ملّاہی سے لکھوائے تھے۔ ان کا فارمولا یہ تھا کہ ہر وہ بات جو جاگیرداری کے خلاف جا سکتی ہو یا جو عوام کے مفاد میں ہو سکتی ہو، اسلام کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ جمہوریت کے نام پر فرعونیت روا رکھی۔ عدل و مساوات کے اصولوں کا گلہ گھونٹ کر قوم کو نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ کے نشے پلا دیتے۔ پھر جب یہ گروہ بندی مکمل ہو گئی تو انھیں اکھاڑے میں اتار دیا۔ یہی وہ ارباب سیاست ہیں جنھیں اقبال جمہور کے ابلیس کہتا ہے۔ یہ ابلیس اس ملک میں آج رقصاں ہیں، کل بھی تھے۔ پاکستان جن اصولوں پہ بنا تھا ان کی رو سے جاگیرداری نظام کا خاتمہ پہلی لازمی بات تھی جو ہونی چاہیے تھی جس کے نتیجے میں یہاں بڑے پیمانے پر متوسط طبقہ ابھرتا، اس طبقے سے نئی قیادت آتی اور نئے افکار پیدا ہوتے۔ مشرقی پاکستان میں کافی حد تک ایسے ہوا بھی، مگر ان کا نتیجہ بھی یہی نکلا کہ مغربی پاکستان کے ساتھ تصادم شروع ہو گیا۔ دونوں حصّوں میں ذہنی فاصلے بڑھنے لگے۔ اُدھر نیا طبقہ ابھرا تھا نئی سوچ اور نیا ذہن بن رہا تھا۔ اِدھر یہی غلامی کی ذلتوں کے نشان جاگیردار زہریلے ذہن لیے، خوفناک، عوام کش منصوبے بنائے اسی غیر متوازن سوسائٹی کو مستحکم کر رہے تھے جس میں ایک چھوٹا سا طبقہ ساری دولت سمیٹ لیتا ہے اور بے شمار لوگ بھوکے ننگے بے بس اور محتاج رہتے ہیں۔ ملّا ان دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر ایسے فتوے صادر کرتا رہتا ہے کہ جن کی رو سے بھوکوں ننگوں کو اسی حالت میں رہ کر رب کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ انھیں اس بات کے صلے میں پھر چالیس برس پہلے جنت میں داخلہ دے گا۔ گویا رب بھی ان کا ساتھی ہے۔ یہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کی ملی بھگت تھی۔ ایک چھوٹے سے طبقے کے پاس دولت کے وسائل اتنے بڑھ گئے کہ انھوں نے سارے جہاں کو عشرت گاہ بنا لیا، مگر غریب آدمی کی روٹی کپڑا اسلام کے لیے

خطرہ بنے رہے۔ صرف مشاہدے کی بنیاد پر موازنہ کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ آزادی سے پہلے کا معاشرہ اقتصادی لحاظ سے اتنا غیر متوازن نہیں تھا، جتنا مغربی پاکستان میں آزادی کے بعد ہُوا۔ یوں تو بعد میں یہاں بائیس خاندان بھی ہوتے اور اپنی قوم کو شکست دینے والے جرنیل بھی آئے مگر قوم میں بے یقینی کا زہر پیدا کرنے کا اصل ذمہ دار یہ جاگیردار طبقہ ہے جو سیاست کے کھیل میں پہلے پہل مسلم لیگ کے ٹکٹ لے کر آیا لیکن بعد میں اس نے حالات کی مناسبت سے کئی اور لیبل بھی استعمال کیے یہ طبقہ آج بھی سرگرم عمل ہے جبکہ قوم ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ اب یہ ٹوٹی پھوٹی قوم کی ہڈیوں پر اپنے نئے قصر تعمیر کر رہا ہے۔

ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قوم نے اگر اقبال کو پڑھ لیا تو پھر اس پر نہ کوئی نشہ اثر کرے گا نہ کوئی حیلہ گری کام آئے گی۔ اس لیے کہ اقبال تو لوٹ کھسوٹ اور استحصال روا رکھنے والے نظام کو یکسر مٹا کر ایسے معاشرے کا خواہاں ہے جہاں نہ طبقاتی بے انصافی ہو اور نہ انفرادی حق تلفی۔ جہاں انسان کی پیمائش کا پیمانہ دولت و رنگ و نسل کی بجائے اس کا کردار اور کام ہو اور ایسا نظام لانے سے اسلام خطرے میں نہیں پڑتا بلکہ عین اسلام ہی کی منشا پوری ہوتی ہے۔ اس نے تو صاف واضح اور توانا آواز میں اعلان کر دیا تھا ؂

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقین سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

سنا؟ یہ کمیونسٹ پارٹی کا مانی فسٹو تو نہیں ہے اقبال کی آواز ہے اس آواز میں اتنی قوت ہے کہ مُلّا و شیخ کو تو آج بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ قوم جسے زہر پلا پلا کر مارا ہے کہیں اس آواز کو سُن نہ لے ورنہ وہ جی اُٹھے گی بکھری ہو جائے گی۔ یہ طبقہ آج بھی اقبال کے خلاف سرگرمیاں دکھا رہا ہے۔ اپریل ۱۹۷۲ء کے اُردو ڈائجسٹ میں مولانا مودودی کا مضمون "اقبال" قابلِ توجہ ہے۔ یہ مولانا روح رواں ہیں۔ اُس جماعت کے جو اسلام کے نام پر غریبوں کو روٹی سے محروم رکھنے کی حامی ہے۔ ہاں تو مضمون میں مولانا نے کلامِ اقبال کے وہ حصے موضوع بنائے ہیں جن میں وہ طبقاتی اور استحصالی نظام کو غیر اسلامی کہہ کر اسے بدل ڈالنے کو کہتے ہیں۔ مضمون نگار نے ایسے تمام اشعار کی توجیہہ پہلے تو گھیراؤ جلاؤ کے مضمون میں کی اس کے بعد ان محرکات کو جو ان افکار کے ورود کا باعث بنے تھے "شاعرانہ جذباتیت قرار دے دیا" یہ باتیں سادگی یا جہالت کی نہیں ہیں سازش اور مکاری کی ہیں۔ اس طبقے نے شروع ہی سے اقبال کو پڑھنے پڑھانے کی بجائے اس کے کئی اور مصرف سوچے تھے۔ مولوی اور لیڈر کی جہالت چھپانے کے لیے اُس کی تقریروں میں تو اقبال کے شعر کام آتے ہی تھے، قبروں، مزاروں پر قوالیاں گانے کے لیے یا جب کوئی بڑا آدمی مَر جائے یا جنگ چھڑ جائے تو نئے ترانوں کی دُھنیں تیار ہونے تک ریڈیو پر کلام اقبال کی الاپ جاری رکھی اور ساتھ ایسے ستم بھی روا رکھے جائیں کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب ڈھاکہ کے ریس کورس میدان میں ساری دنیا کو گواہ بنا کر پاکستان کی تاریخ کا سیاہ باب لکھا جا رہا ہو اور پاکستان کا نشان جھکا کر سلامی دی جا رہی ہو، سپہ سالار اپنا ہتھیار دشمن کے قدموں پر رکھنے کے لیے جُھک رہا ہو تو ریڈیو پاکستان ایک پاگل کی طرح الاپ رہا ہو "مومن ہے

تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"۔ اقبال اور اسلام سے متنفر کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔

اور تو اور اس ملک کے نام نہاد انٹلکچوئل طبقے نے بھی اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اقبال کو ایک منفرد مشرقی مفکر کی حیثیت سے متعارف کروانے کی بجائے کبھی تو نطشے اور رومی سے اس کی مماثلتیں تلاش کرتے رہے کبھی لفظی و شعری نکات کی نشان دہی کر دی۔ بہت کیا تو غزلوں میں روح غزل تلاش کر لی یا کسی جمالیاتی پہلو کا استحسان کر ڈالا۔ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو سارا زور صرف کر کے اقبال کو شاعر اور فقط شاعر ثابت کرتا ہے اور پھر شاعری کے فرسودہ رجعت پسندانہ اور بیمار قسم کے معیار سامنے لا کر اس بات پہ شرماتا پھرتا ہے۔ کہ اقبال نے تو شکوہ جواب شکوہ طلوع اسلام بھی لکھیں ہیں۔ نئی نسل کو یہ بتانے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی کہ اقبال دَورِ جدید کا واحد مفکر ہے جس نے اس مشینی اور مادی دَور میں انسان کو جدید معاشرے کا تصوّر دیا تو اس میں انسان کے وقار کو بحال رکھا۔ عملِ پیہم کی میکانکی روح کو ایمان کی حرارت بخش کر روح کے عرفان اور ذہن کی جودت کے امکان روشن رکھے۔ احترامِ آدمیت اقبال کا پہلا اصول ہے اس کے افکار لینن اور ماؤ کے افکار کی طرح مکمل اور توانا ہیں۔ یہ اقبال کا پیغام تھا جس نے ہماری تحریک آزادی کو گرم خون عطا کیا تھا۔ کچھ ایسا ذوقِ یقین تھا کہ وہ مسلمان بھی جو پاکستان نہیں آ سکتے تھے، بڑی بڑی قربانیاں دینے کو تیار ہوتے۔ پاکستان جیسی بڑی اور انوکھی ریاست کا حصول کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ اگرچہ اُس وقت سارے ایشیا کی روح میں ایک اضطراب بپا تھا، کتنی ہی اور قوموں نے بھی سوز و یقین سے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا اور فکر تازہ سے کہنہ پرستیوں کا خاتمہ کر دیا۔ ان میں کچھ تو وہ بھی ہیں کہ دنیا کی آخری صف سے نکل کر اقوام عالم کی امامت پہ معمور ہوئیں، مگر پاکستان پھر

بھی ایک انوکھی واردات تھی۔ ایک نظریاتی ریاست جس کی بنیاد وحدت افکار پہ رکھی گئی تھی۔ اُس وقت بھی یہاں کئی صوبے تھے، کئی زبانیں تھیں۔ بنگال اور پنجاب کے درمیان اتنے ہی میلوں کا فاصلہ تھا، جتنا آج ہے مگر اس وقت ہمارے فکر و یقین کا مرکز سلامت تھا۔ ایک نظریہ، ایک زبان، ایک مُلک، ایک قوم کے ساتھ ہمارا بہت بڑا وجود تھا۔ دنیا ہماری اہمیت کی قائل تھی۔ اس وقت ہم نے اجتماعی کاوش سے ایک نئی دنیا بنانے کا جو عہد نامہ لکھا تھا اس پر کسی بنگالی پنجابی سندھی پٹھان اور بلوچ کے دستخط نہ تھے۔ وہاں تو صرف ایک ہی نام تھا وہ تھا پاکستانی مسلمان۔ اس وقت ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے بال و پر غبار آلودۂ رنگ و نسل ہو گئے تو بلند پروازی ہمارا مقدر نہ بن سکے گی۔ تب صوبوں اور زبانوں سے بلند تر نصب العین ہمارے سامنے تھا۔ ہم سب نے مل کر پاکستان بنایا تھا۔ ہم سب کی منزل ایک تھی۔ دوسری قوموں کی طرح ہم بھی ایک آئیڈیل معاشرہ تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں آزادی ہوتی، انصاف ہوتا اور آدمیت کا احترام ہوتا۔ پاکستان کو یہ منصب حاصل ہو جاتا تو پھر اقبال کے عظیم تر خواب کی تکمیل کے لیے ساری ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی بھی ممکن تھی۔ یوں ہو جاتا تو نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر ایک عظیم قوم سربلند ہوتی۔ مسلمان ایک بار پھر دنیا کی بڑی قوت بن جاتے، ایک بار پھر انسانی فلاح و نجات کے لیے اسلام کو سب سے بڑا نظریہ مانا جاتا۔ تب شاید ستاروں سے آگے جہاں تلاش کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہوتے۔ یہ سب کچھ ہو نہ سکا، مگر ہو سکتا تھا اگر ہم اپنے فکر و یقین کی وحدت برقرار رکھ لیتے۔ عصرِ حاضر کے مفکرِ اعظم کے پیغام کو اس طرح عمل کی روح بنایا ہوتا جس طرح چین والوں نے ماؤزے تنگ کے افکار کو بنایا۔ قائد ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے مگر افکار کی قیادت مستقل ہوتی ہے۔ ہماری بدنصیبیاں وہیں سے شروع ہوئیں جہاں

سے قائد اعظم نے ساتھ چھوڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب مُلّا و شیخ کی ملی بھگت نے اپنا کام کیا، اس وقت ہم نے اگر فکر اقبال کی انقلابی اور عملی قوتوں کو کام میں لاکر ابلیس کی اس فوج کو شکست دے دی ہوتی اور ساحر الموُت کے برگِ حشیش کو شاخِ نبات سمجھ کر قبول نہ کیا ہوتا۔ اگر ہم نے سرمایہ داری کی حیلہ گری کو سمجھا ہوتا اور شُکر کی لذت میں نقد حیات نہ لٹوائی ہوتی۔ اگر ہماری خودی بیدار رہتی اور ہمارے کردار کی تعمیر مردِ مومن کے خطوط پر کی گئی ہوتی، اگر تقلید کی بجائے تحقیق کو اپنا شعار بنایا ہوتا اور ہمارے تعلیمی منصوبوں کے اعلیٰ ترین مقاصد سی ایس پی بنانے کی بجائے انسان کی تلاش کرنے کے لیے ہوتے۔ اگر ہمارے مدرسوں میں صدق خلیل صبر حسین اور فقر بوذر جیسے مضامین بھی پڑھائے جاتے اور ہمارے نصابوں میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے معنی ٹھیک لکھے ہوتے اور ساتھ ہی ہماری مساجد میں شبستان وجود کو لرزا دینے والی اذانیں بھی گونجا کرتیں اور منبروں پر جاہل و بے علم مُلّا کی بجائے مجتہد خطبے پڑھا کرتے تو ہم آج اس طرح بے مقام تو نہ ہوتے۔

یہ تو خیر خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ شہر آرزو کے قصّے ہیں جو کچھ اس دنیا میں دیکھا اور سُنا جا سکتا ہے وہ تو بہت دُکھ دینے والا اور مایوس کرنے والا ہے۔ مسلمان کی قومی روح ہر جگہ مفلوج ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے تہی دامن اور تہی دل ہے۔ فلپائن سے لے کر فلسطین تک جو قوم آج شکستہ و خستہ نظر آرہی ہے۔ سارے جہاں کے ظلم و ستم کا نشانہ ہے۔ بے انصافیوں کا شکار ہے۔ اپنا تحفظ آپ نہیں کر سکتی۔ جس کسی پہ بھروسہ کرتی ہے وہ دھوکہ دیتا ہے، جسے دوست کہتی ہے دشمن سے بڑھ کر دشمنی نبھاتا ہے۔ جہاں دولت بے شمار ہے اور وسائل لامحدود ہیں وہاں بھی نہ دانش ہے نہ قوت۔ اب تو علاوہ دوسرے لوگوں کے، خود ہم میں سے بھی کچھ لوگ سوچنے لگے ہیں کہ شاید اسلام ہی دورِ جدید کا ساتھ دینے کی

صلاحیت کھو چکا ہے جو مسلمان ہر جگہ اور ہر معاملے میں ناکام ہے آخر کیا بات ہے کہ ویت نام کی چھوٹی سی قوم پورے بیس برس تک امریکہ کے خلاف لڑ کر اپنی آزادی کی جنگ جیت لیتی ہے، مگر عرب مشرق وسطیٰ کی اتنی بڑی قوم ہو کر اسرائیل کو نہ تو ظلم سے باز رکھ سکتی ہے نہ اپنے چھینے ہوئے علاقے آزاد کروا سکتی ہے نہ تو فلسطین کے بے سرو سامان لوگوں کی مدد کر سکتی ہے۔ وہی روسی اسلحہ ہے جو بھارت استعمال کرے تو پاکستان کو شکست ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ عرب اسرائیل سے جنگ لڑیں تو خود شکست کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کی مدد جہاں اسرائیل کے لیے اتنی کارآمد ہے۔ پاکستان کے لیے وہی امریکی امداد و اسلحہ ناکامی کا باعث بن جاتا ہے بھارت بنگالیوں کے لیے جھوٹی آواز غلط موقف کے ساتھ اٹھاتا ہے تو دنیا کو اپنا ہم خیال و ہمدرد بنا لیتا ہے، دوسری طرف پاکستان کشمیر سے لے کر مشرقی پاکستان اور جنگی قیدیوں کے مسئلے تک اپنی آواز کو مؤثر نہیں بنا سکتا۔ آخر کیا بات ہے کہ مسلمان اتنا بے اثر ہو گیا ہے؟ کیا اس کی یہ حالت اس وجہ سے ہے کہ مسلمان ہے؟ یہ سوال غور طلب ہے مگر ایک سوال اور بھی توجہ طلب ہے۔ وہ یہ کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے غیر مسلم نظریے یا طرزِ عمل اپنا کر کوئی تجربے کیے یا پالیسیاں بنائیں وہاں بھی وہ ناکام اور بانجھ ثابت ہوئیں۔ مغربی طرز کی جمہوریت اور سوشلزم اس کی مثالیں ہیں۔ یہ دونوں نظریے دنیا میں جتنے کامیاب ہوتے مسلم دنیا میں اتنے ہی ناکام ثابت ہوئے۔ آخر کیوں؟

اقبال کی ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں اس معاملے میں جو سوچ سکی ہوں وہ یہ ہے کہ نظریہ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ذوق یقین کے بغیر بے روح ہوتا ہے۔ جس حد تک لوگ کسی نظریے میں یقین رکھتے ہوں اس حد تک اس میں عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے ؎

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

یقین کے بغیر اسلام ہو یا کمیون ازم، جمہوریت ہو یا سوشل ازم بتکدۂ تصورات بن کر رہ جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے مسلمان نے کسی نظریے کو نہ تو یقین کے ساتھ قبول کیا ہے اور نہ کُلی طور پر اسے تجربے میں لاتے ہیں۔ اسلام کا عقیدہ رکھ کر ہم کمیون ازم یا سوشلزم سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ جہاں اسلام فقط ایک عقیدہ ہی نہیں۔ معاشی معاشرتی اور سیاسی نظام بھی ہے۔ اسی طرح کمیون ازم محض ایک معاشی نظام نہیں۔ ایک عقیدہ اور طرز معاشرت بھی ہے۔ یہ خدا کا اثبات نہیں کرتا مگر خود خدا بن جاتا ہے۔ ان دونوں کی پیوند کاری سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ محض تخریب ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹنے پھوٹنے لگتے ہیں، معاشرے کو کسی نوعیت کی کوئی تعمیر اس طرح میسر نہیں آسکتی۔ بہت واضح اور قابل فہم مثال اس کی پیپلز پارٹی کا مانی فیسٹو ہے جس میں مذہب اسلام اور معیشت سوشلزم ہے۔ اسلامک سوشلزم اسی کا نام ہے۔ یہ تجربہ نہ صرف ناکام ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کے نتیجے میں معاشرے کے کردار پہ بہت گہرے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگرچہ سوچنے والوں نے بڑے خلوص سے سوچا تھا اور ابھی تک یہ مخلص لوگ اس بات کو سمجھ نہیں پائے یا شاید سمجھنا ہی نہیں چاہتے کہ معاشرے میں دوہری شخصیت آخر کس طرح پنپ سکتی ہے اور اگر کسی طرح پنپ بھی گئی تو وہ صحت مند معاشرہ کس طرح سے ہو گا؟ کمیون ازم فرد اور معاشرے دونوں کو ایک منفرد کردار دیتا ہے جو قوم اس نظریے پہ یقین رکھتی ہے وہ اس کے ایک ایک اصول کی پابند ہوتی ہے، ایک نکتے سے بھی منحرف نہیں ہو سکتی، روس اور چین میں لینن اور ماؤ کے ایک ایک لفظ کو اصول بنایا گیا اور الہام سے بڑھ کر تو اس کی تکریم ہوئی۔ اس طرح کمیون ازم یا سوشلزم فرد کو بھی ایک خاص کردار دیتا ہے

جس میں افراد کی انفرادیت انا یا ذات کی برتری کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی کیمون ازم کا پرچار کرنے والے لوگ اپنی ذات کے خول سے باہر آکر دُکھی انسانوں کی نجات کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کی قربانی و ایثار کا حصول، اجتماعی زندگی کے لیے ہوتا ہے، ان کی اپنی ذات کسی شہرت یا نام نمود کی بھی حقدار نہیں ہوتی۔ پاکستان میں سوشلزم کا نام لینے والوں نے ہر حال میں ذات کی پرورش اور انا کی نمود سامنے رکھی۔ اس طرح دوہری شخصیت کے مرض کا شکار ہوتے۔ عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ ان لوگوں کے سوشلزم کا خول بہت نازک اور باریک ہوتا ہے کہ ذرا سی چوٹ لگنے سے ٹوٹ کر بکھرنے لگتا ہے اور پھر اندر سے ایک بھاری بھرکم بورژوا سرمایہ پرست شخصیت نکل کر سامنے آجاتی ہے جو موقع ملتے ہی اجتماعی مقاصد کا استحصال کرتی ہے۔ پیپلز پارٹی میں اسی قسم کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ جو ایک طرف تو طبقاتی لحاظ سے سوشلزم سے کوئی میل نہیں رکھتے، دوسرے وہ اس تصادم کا شکار ہو گئے جو پارٹی کے پروگرام میں دو مختلف نظاموں کی پیوند کاری سے پیدا ہوا تھا۔ یقین اور اصول کا یہ تصادم ہمیشہ اسلام سے بھی کچھ حاصل نہیں ہونے دیتا۔ سیاسی اور معاشی نظریات کو چھوڑ کر فقط عقیدے کی حد تک مسلمان رہنے سے ہمارا وہی کردار بن سکتا ہے جو اس وقت ہے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ اسلام محض عقیدہ نہیں نظامِ حیات ہے۔ جس کا اپنا مخصوص مزاج ہے۔ اس نظام کی افادیت بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ کیمون ازم یا سوشلزم کی۔ یہ بھی فرد اور معاشرے میں ایک مخصوص کردار ادا کرتا ہے۔ اس کردار کی بنیادیں عقیدے پر استوار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور یہاں توحید کا تصور سارے نظام میں ایک وحدت پیدا کرتا ہے اللہ ایک ہے تو انسان بھی ایک اکائی ہے جس کی مادی اور روحانی زندگی میں تقسیم ممکن نہیں، اسی لحاظ سے ملت کی وحدت ہے جس کو قومیت کے کسی اور تصور — رنگ نسل زبان یا

وطن کے ساتھ تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی معاشی اور معاشرتی نظام بھی اسی تصور سے ابھرتے ہیں۔ اس پورے نظام میں ہم آہنگی اس کی اصل افادیت ہے اسے ہم یقین وعمل کی ہم آہنگی کہہ سکتے ہیں۔ یہ یقین وعمل کی ہم آہنگی معاشرے اور فرد دونوں کے کردار کی بنیاد ہے۔ اسلام میں جدت افکار یا اجتہاد کی گنجائش تو بہت ہے۔ مگر یہ نظام کسی کانٹ چھانٹ یا پیوند کاری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کلمہ تو اللہ و رسول کا پڑھیں۔ قسمیں قرآن کی کھائیں اور معاشی مسائل کا حل کمیونزم میں تلاش کریں، سیاسی دستور مغربی جمہوریت کی طرز پر بنائیں۔ یہ روش تو ہمیں کہیں بھی نہیں لیجائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ ان نظاموں کے بنیادی اصول اسلام سے کافی مشابہت رکھتے ہیں، مگر اسلام کے ہر نظام کا اپنا مخصوص مزاج ہے۔ مثلاً اسلام میں جمہوریت کی قوت ووٹروں کی تعداد کی بجائے افراد کے کردار کی بلندی اور صفائی سے متعین ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرہ امتیاز بندہ و آقا کو ختم کرنے کے لئے سائنٹفک انداز اختیار نہیں کرتا بلکہ انسانی سطح پر ایسے اصول بناتا ہے جس سے دولت کی تقسیم میں بے انصافی اور غیر ہمواری کو ختم کیا جا سکے۔ یہاں دولت کے ایک جگہ جمع ہونے سے روکنے یا ایک آدمی کو دوسرے سے زیادہ خرچ کرنے سے منع کرنے کے لیے زکوٰۃ عشر اور احسان کے علاوہ ایک خاص طرز زندگی ہے۔ جسے فقر کہتے ہیں۔ سٹیٹ کے حکم کے علاوہ خوفِ خدا رسول اور خلیفہ کی طرز معاشرت کی پیروی فرد کے کردار میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اسی پیمانے کو سامنے رکھ کر لوگوں کو اپنی ضروریاتِ زندگی کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ یہی پیمانہ معاشرت کا اصول بن جاتا ہے۔ خلیفہ عمر مسجد میں بیٹھ کر بیت المال کے تیل کا چراغ صرف اس وقت تک جلاتے جب تک کہ سرکاری کام کر رہے ہوتے۔ اللہ کی عبادت کرتے وقت اس چراغ کو بجھا دیا کرتے۔ چھنے آٹے کی روٹی اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ سارے مسلمان ابھی چھنے آٹے کی روٹی کھانے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔

رات کو اس خوف سے سو نہیں سکتے تھے کہ ریاست میں کوئی وجود بھوکا نہ رہ گیا ہو۔ کسی گورنر یا جرنیل کے پاس ایک گھوڑا بھی زیادہ ہونے کی خبر پاتے تو جواب طلبی کر لیتے ۔ بنیادی ضرورت کے علاوہ ہر چیز سٹیٹ کے نام پر ضبط ہو جاتی ۔ یہ باتیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں نہ دین و سیاست علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ نہ معاشی نظام کہیں اور سے لیکر پیوند کیا جا سکتا ہے ۔ اسی وجہ سے مغربی جمہوریت کا تجربہ جب مسلم ملکوں میں ہوا تو نتیجہ فرعونیت سے بہتر نہیں نکلا۔ بقول اقبال یہ دیو استبداد تھا جو جمہوری قبا میں پائے کوب ہو کر سامنے آیا تو عوام بیچارے اس میں آزادی کی نیلم پری تلاش کرتے رہے ۔ پاکستان سمیت تمام اسلامی ملکوں میں مغربی جمہوریت عوام کی طاقت بننے کی بجائے سرمایہ داروں کی جنگِ زرگری بن کر رہ گئی ۔ اس طرح ایک طرف قومیت کا ملی تصوّر ہے جس کی بنیاد عقیدے کی یک جہتی پر ہے ۔ دوسری طرف وطنیت زبان جغرافیائی حدود اور مقامی کلچر پر قومیت کا محدود تصوّر ہے ۔ اس تصوّر پر بڑی بڑی مضبوط قومیں کھڑی ہیں ۔ مگر جب مسلمان اسے اپنانے لگتے ہیں تو آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں ۔ ایک دوسرے کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیتے ہیں ۔ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہُوا، ایران و عراق کا تصادم خود مغربی پاکستان میں صُوبوں کی چپقلش ۔ عربوں اور ترکوں کی آویزش اور عربوں کے اختلافات اسی وجہ سے پیدا ہوتے ۔ دنیائے اسلام اور پاکستان کے یہ مسائل بڑے سنگین اور گھمبیر ہیں ۔ ان کے بارے میں آج نہ سوچنا جُرم ہے ، گناہ ہے جس کی سزا اتنی بڑی بھی ہو سکتی ہے کہ قوموں کی تاریخ سے ہمارا نام ہی خارج ہو جائے ۔ بے یقینی کا زہر جو ہم نے پی رکھا ہے ۔ اس کا تریاق نہ ڈھونڈا ، اپنے فکر و یقین کا مرکز ہم نے بحال نہ کیا تو ہم زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہو سکیں گے نہ اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ

سکیں گے۔۔ نہ کھوئی عظمتوں کا سراغ ملے گا اور نہ ہی تاریخ کی عظمتوں سے ہمارا رشتہ برقرار رہے گا۔ فکری اساس کے بغیر بقول کرنل قذافی جتنے تجربے ہوں گے ناکام رہیں گے۔ جتنی پالیسیاں بنیں گی بانجھ ثابت ہوں گی۔

اپریل ۱۹۷۲ء

ہاتھی اور چیونٹیاں

زمین کے اوپر بسنے والی مہذب اور قابلِ ذکر دنیا میں ہاتھی سب سے بڑا جانور ہے اور چیونٹی بیچاری سب سے چھوٹی۔ شاید اسی لیے جہاں ہاتھی کے متعلق بڑی بڑی اچھی اچھی اور ڈھیروں ڈھیر باتیں مشہور ہوئیں، چیونٹی کے بارے میں سوائے ایک پر نکال لینے والی بات کے اور کچھ بھی مشہور نہ ہو سکا۔ اس ایک بات میں بھی تحقیر کا پہلو کتنا نمایاں ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ حالت یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگوں نے ہاتھی فقط تصویروں میں دیکھا ہوتا ہے یا کبھی کبھی چڑیا گھر میں شہر لاہور کے لوگ دیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ چیونٹی غریب ہر جگہ ہر وقت اور ہر کسی کے قدموں میں رینگتی رہتی ہے مگر اتنی چھوٹی اور ایسی خاکسار قسم کی چیزوں کا نوٹس لینا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ اس میں قصور کچھ ایسا ہمارا بھی نہیں۔ عادت انسان سے کیا کچھ نہیں کروا دیتی۔ یہ اور ایسی کتنی عادتیں ہمیں اس فرسودہ اور واہیات قسم کے معاشرے سے ملی ہیں جو طبقاتی نخوتوں اور کمتریوں کا معجونِ مرکب سا بنا پڑا ہے اور صرف بڑی بڑی ظاہری اور نمائشی چیزوں کو اہمیت دینا سکھاتا ہے۔ بس کچھ ایسی ہی عادتوں اور تربیتوں کی بنا پر ہم سب ہاتھی کے گن گاتے رہتے ہیں اور چیونٹی کو جانے اَن جانے میں قدموں تلے روندتے اور چٹکیوں میں مسلتے رہتے ہیں۔

نہ جانے کب، کس کے لیے اور کس سلسلے میں کسی نے کہا ہوگا، ہاتھی پھرے گراں گراں، جس کا ہاتھی اسی کا ناں۔ گماں ہمارا ہو یا نہ ہو مگر ہم سب ہاتھی کے

ہیں۔ ہاتھی کی کیا بات ہے بھئی مُوا بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ مردہ یا زندہ ہر حالت میں ہاتھی کے دانت بڑے اہم ہیں۔ پوری توجہ سے گنے جاتے ہیں۔ کھانے کے الگ دکھانے کے الگ۔ پھر ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ کیوں نہ ہو۔ آخر اتنا بڑا پاؤں۔ اس کا تو نشان بھی ایسا چوڑا چکلا کہ لال بجھکڑ کو چکی کے پاٹوں کا دھوکا ہو۔ یوں تو ایک کہانی ہاتھی اور درزی کی بھی ہے مگر خود ساختہ سی معلوم ہوتی ہے۔ ہاتھی کا جھومنا بھی مشہور ہے اور ڈیوڑھی پہ جھومنا تو اور بھی بڑی بات ہے کہ ڈیوڑھی امیروں کے گھروں میں ہوتی ہے۔ ایک چِٹا ہاتھی بھی ہوتا ہے۔ جسے پالنے کی توفیق ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتی۔ ہر کس و ناکس کو تو کسی بھی قسم کے ہاتھی کے پالنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ چٹے ہوں یا کالے، ہاتھی پالنا صرف بادشاہوں اور امیروں کا مشغلہ رہا۔ شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے کے لیے سواری کے لیے اور جنگ کرنے کے لیے بھی۔ پرانے وقت کے لشکروں میں تو ہاتھی کی حیثیت یقیناً وہی ہوا کرتی تھی جو آج ٹینک کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانے کی جنگوں میں ہمیشہ ہاتھی والا ہار جاتا اور گھوڑے والا جیت جاتا تھا۔ وجہ ہاتھی کی ایک خاص عادت ہے۔ وہ عادت یہ ہے کہ موقع بے موقع ریورس گیئر لگا دیتا ہے۔ اسی بنا پر پورس کے ہاتھیوں نے تاریخ میں نام پایا اور اسی وجہ سے قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں نے اپنے ہاتھیوں کو زنجیر پا کیا تھا۔ اسی سے کچھ ملتی جلتی کہانی شاہ سلیمان کے ہاتھیوں کی بھی ہے۔

بہرحال یہ اور ایسی کتنی اور باتوں کی وجہ سے ہاتھیوں کی کہاوتیں اور محاورے لوگوں میں عام ہوئے۔ مگر یہ سب تو بیتے دنوں کی باتیں ہیں۔ اب تو دونوں جانب یہ شغل ختم ہو چکا ہے۔ نہ نئے زمانے کے امیر ہاتھی پالتے ہیں نہ غریب ہی انکے قصے کہانیاں اور محاورے گھڑتے ہیں۔ وہ زمانے جب امن و جنگ ہر حال میں ہاتھی لازمۂ حیات تھے خود ہاتھیوں کے ساتھ ہی لد گئے۔ اب تو یہ عجیب اور عظیم جثے کہیں اگر پائے جاتے ہیں تو چڑیا گھر میں۔ بانس

کے جنگل جو کبھی ان کا ٹھکانہ ہوا کرتے تھے اب امن کا گہوارہ بنتے جا رہے ہیں۔
البتہ غریب امیر اور چونٹیاں ابھی تک ساری دنیا میں بکثرت ملتی ہیں۔ گو زندگی
کے بدلتے ہوتے چلن نے ان کے تعلقات پہ خاصا اثر ڈالا ہے مگر ایسا بھی
نہیں کہ چیونٹی کی حیثیت بدل جائے یا ہمارے دلوں میں اس کے لیے حقارت
کم ہو جاتے۔ وہ غریب تو اب بھی اسی طرح قدموں میں رینگتی ہے، ڈھیریاں
بناتی ہے۔ محنت سے خوراک جمع کر کے بچے پالتی ہے۔ ذرا سے پر نکال لے
تو سیدھی موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ گو کہ امیروں غریبوں کی دنیا اور
ان کے باہمی تعلقات خاصے انقلابی تبدیلیوں سے گزرے ہیں۔ ہوایوں کہ پہلے
یورپ اور امریکہ کے زیر اثر آکر مشرق کے امیر لوگ اچھے خاصے روایت شکن
اور جدت طراز بن گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنی بڑی بڑی۔ اونچی اونچی
دلانوں محرابوں اور ڈیوڑھیوں والی حویلیوں کو ڈھا ڈھو کر ان کی جگہ ہلکی ہلکی نیچی نیچی
اور بانکی بانکی کوٹھیاں بنا ڈالیں۔ ان کوٹھیوں میں بلندی کم اور پھیلاؤ زیادہ ہوتا
اور سامنے ڈیوڑھیوں کی بجائے پورچ ہوتے ہیں۔ جہاں ہاتھی باندھنے کی بجائے
کاریں کھڑی کی جاتی ہیں۔ یہ کاریں ہاتھیوں سے کم مہنگی تو نہیں ہوتیں مگر ہوتی
ہیں خوش رنگ، خوش مذاق اور خوش رفتار۔ امپالا، کرولا جیسے نام بھی ہوتے ہیں
ان کے۔ مگر اب ان نئی چیزوں کی نہ کوئی کہاوتیں ہوتی ہیں نہ ان پر محاورے
گھڑے جاتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ عوام کو نئی دنیا کی ان چیزوں سے دلچسپی نہ ہو۔
بات دراصل یہ ہے کہ اس دور کے عام لوگوں کو امیروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔
وہ انھیں دنیا کا انتہائی فالتو اور بے معنی حصّہ سمجھتے ہیں۔ پھر جب سے لیڈروں
نے انھیں استحصال والی بات سمجھائی ہے وہ دولت والوں اور ان کی کوٹھیوں،
کاروں سے دن دہاڑے جلنے اور کھلے خزانے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان چیزوں کا
نام تک لینا تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ سوائے ایسے وقتوں کے جب وہ گھیراؤ
جلاؤ کے موڈ میں ہوں۔ ویسے اس طرح کے حالات پیدا کرنے کی ساری ذمہ داری

لیڈروں کی نہیں ہے، خود امیروں کا بھی اُس میں خاصا ہاتھ ہے۔ پرانے وقتوں کی باتیں کتابوں میں پڑھو تو پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں بڑے چھوٹے لوگ تو ہوتے تھے مگر ان کی بستیاں الگ الگ اور دُور دُور نہیں ہوا کرتی تھیں۔ سوسائٹی میں تضاد بے شک تھے مگر ایک ظاہری وحدت سی قائم تھی۔ مثال کے طور پر راجہ بھوج اور گنگوا تیلی دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا۔ الپ اور ارسلان کے محل کے عین نیچے ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ اس قسم کے ہمسائے ماں جائے نہ سہی کچھ نہ کچھ قرب کا احساس تو رہتا ہی ہو گا۔ حقوق و فرائض سے ہٹ کر رعایا پروری ایک ایسا ٹانک بھی تھا کہ جس سے بڑے لوگوں کی اَنا تندرست و توانا رہتی تھی۔ پھر جب اتنے قریب سے کوئی دیکھ رہا ہو تو کھاتے پیتے لوگوں کو نظر بد دُور کے لیے کچھ نا کچھ کرنا ہی پڑتا ہو گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں قسم کے لوگ ساتھ ساتھ رہ کر اچھی خاصی گذر بسر کر لیتے تھے۔ ایک حال مست رہتا تو دوسرا مال مست، ایک طرف سے عیش و کلچر کے لوازمات بڑھتے رہتے تو دوسری طرف سے زبان میں محاورات اور کہاوتوں کا اضافہ ہوتا رہتا۔ اچھی خاصی جمہوریت سی قائم تھی۔ اب تو ان دونوں طبقوں میں سماجی یا اخلاقی سطح پر کوئی رشتہ ہی باقی نہیں، سوائے نفرت تعصّب اور فاصلوں کے۔ امیر غریبوں کو سرے سے انسان ہی تسلیم نہیں کرتے۔ پرے پرے کھنچتے جا رہے ہیں۔ اپنی بستیاں الگ کرتے جا رہے ہیں تو غریب بھی اس دن کے انتظار میں ہیں کہ کب چاند کی دنیا میں بستیاں بسیں اور کب یہ آدمی گزیدہ مخلوق اس دھرتی سے اپنا بوجھ اُٹھائے۔ پھر ان صحت افزا کوٹھیوں میں ان کے بچّوں کے لیے سکول کھلیں ہسپتال بنیں۔ اس صورت حال نے امیروں کو بہت ہراساں کر رکھا ہے۔ وہ جو تھوڑی بہت مہربانی اپنی آخرت سنوارنے کے لیے ان سے روا رکھتے تھے۔ اس سے بھی دستبردار ہو گئے ہیں۔ اب اِتنے سخت تناؤ کی حالت میں کب یہ ممکن ہے کہ عوام امیروں کے لوازمات زندگی نہیں محاوروں میں پروتے پھریں یا ان کی داستانیں گھڑ

کر اپنے بچوں کو سنائیں ۔ اس صورتِ حال سے اور تو کسی کا کچھ بگڑا ہی نہیں، ہاں البتہ زبان پہ بہت کچھ اثر پڑا ہے ۔ نئی اردو اچھی خاصی بے محاورہ ہوتی جا رہی ہے ۔ طرح داری کا ذکر ہی کیا ۔ کئی لوگ جن کے پاس زندہ رہنے کا کوئی اور سامان نہیں اس بات پہ دکھی ہوتے رہتے ہیں کہ دلی کے بادشاہوں اور لکھنؤ کے نوابوں کا کلچر پرانی داستانوں کے ساتھ ہی ساتھ بوسیدہ ہوتا جا رہا ہے ۔ اس کا تحفظ جو کچھ تھا وہ اس زبان کے ساتھ جسے میر امن لکھتے رہے اور میر انیس بولتے رہے ۔ اس میں قیامت کی بات تو ذرا بھی نہیں کہ عوام الناس نے ساری دلچسپی اور توجہ کا مرکز اپنے آپ کو بنا لیا ہے ۔ ادب اور آرٹ کے سارے تانے بانے اپنی دنیا کے گرد بُننے لگے ہیں ۔ اُس دنیا کا کوئی کردار کسی کہانی میں آتا ہے یا بڑے لوگوں کا ذکر بھی آتا ہے تو بطور وِلن کے ظالم اور حاسد کے لٹیرے اور استحصالی کے ۔ شہریاروں اور گلفاموں کی جگہ ماچھیوں، کمیوں اور مُصلیوں کو مل گئی ہے ۔ شاعروں کا یہ حال کہ انھیں شیریں، شہزاد اور بدرِ منیر جیسی اجلی چیزوں کے مقابلے میں گندی پھاتاں، میلی نوراں اور بھدی گڈو اچھی لگنے لگی ہیں ۔ فاصلے جو بستیاں الگ کرنے سے شروع ہوتے تھے وہی دلوں کے فاصلے بنکر ابھر آئے ہیں ۔

عام طور پر اس کشیدگی کی ذمہ داری لیڈروں کے سر تھوپی جاتی ہے مگر حق کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ان فاصلوں کو کم کرنے کی کتنی ترکیبیں اب تک آزمائی ہیں ۔ ان خلیجوں کو پاٹنے کے لیے یا یوں کہہ لو کہ قطبین کو ملانے کے لیے ہی تو شہر میں کئی سڑکیں بن جاتی ہیں ۔ یہ کوئی معمولی قسم کی سڑکیں نہیں ہوتیں بلکہ نہایت چکنی چپڑی اور چمکیلی چوڑی، سیاہ ناگنوں کی طرح لہراتی شاہراہیں ہوتی ہیں جنکے ایک سرے پہ تو کوئی جگمگاتی سی خوش رنگ بستی ہوتی ہے تو دوسرے پر کوئی بھنکتا سڑتا ہوا سا بدرنگ محلہ مگر بستیوں کو ملانے والے یہ خوب صورت رابطے دلوں کو ملانے کے کام نہیں آتے ۔ آگے پیچھے تو ان پر ادمنی بس ہی چلتی رہتی ہے ۔ مگر جب الیکشن کی مہم شروع ہو تو رابطے کے

دوروں میں بیچارے لیڈروں کی تتلیوں جیسی البیلی کاریں اِدھر سے اُدھر بھاگ بھاگ کر ہانپ جاتی ہیں۔ اِدھر بھی ووٹ ہوتے ہیں اُدھر بھی، اِدھر گنتی لاکھوں انسانوں کی ہوتی ہے۔ اُدھر اتنا ہی زر ہوتا ہے اور ملی جلی سیاست کے لیڈروں کے لیے دونوں کی اہمیت بے حساب۔ لاکھوں گنے جاتے ہیں تو چند تولے بھی جاتے ہیں۔۔۔ مگر اس تول و تعداد میں توازن اور توافق ہو تو کیسے؟ ہمارے ملک کے سیاست دان کسی نہ کسی طور کام بنا ہی لیتے ہیں۔ بھولے اور انجان تو وُہ (وہاں دکھائی دیتے ہیں) جہاں قطبین کے فاصلے سڑکوں سے ناپتے رہتے ہیں۔ زندگی کے کل تضادوں کا فرق عوامی سوٹ اور امریکن سوٹ کے درمیان کا فرق سمجھتے ہیں اور یہی کرتے بھی ہیں کہ گلبرگ میں میٹنگ ہو تو ولایتی سوٹ و اکسفورڈ کی زبان چلے گی۔ موچی دروازے کا جلسہ ہو تو دیسی لباس اور بولی سے کام لیا جائے گا۔ ان نادانوں کو کوئی سمجھاتا بھی نہیں کہ لوگ اب سیانے ہوچکے ہیں۔ زندگی اور ناٹک کا فرق سمجھتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی۔ ایک ہی ڈبے میں محنت کش اور زرگر کے ہاتھ ووٹ کی پرچی خواہ کتنی بار ڈالتے رہیں کسی قسم کی مساوات برآمد نہیں ہوگی۔ بستیوں کے فاصلے بھی بڑھتے رہیں گے اور دلوں کے بُعد بھی۔ تاوقتیکہ کوئی بڑا دھماکہ ہو اور ان چوڑی سڑکوں کے دونوں سِرے پر یا تو گلبرگ آباد ہو جائیں یا موچی دروازے۔

اس صورت حال کا آغاز کب ہوا اور کیسے ہوا؟ یوں تو کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے مگر ایک جیتی جاگتی سند بھی ہے۔ وہ ہے میرے ابا کی دادی یعنی یعنی میری دادی کی ساس۔ میرے ابا ایک بوڑھے آدمی ہیں اور میری دادی کو انتقال کیے اتنے برس ہو چکے ہیں جتنے میں ایک پوری نسل پروان چڑھتی ہے مگر انھیں بہو کہہ کر پکارنے والی اپنی یادوں کی پٹاری سمیت ابھی زندہ بیٹھی ہیں۔ ہاں تو یہ محترمہ جنھوں نے دنیا میں آنے سے پہلے سوا سو سال اپنے نام لکھوائے اور پُوری چار نسلوں کو اپنی آنکھوں تلے مرتے جیتے دیکھا، کئی نظام و دستور بدلتے دیکھے

میری دادی روایت کرتی ہیں کہ جب انھوں نے آنکھ کھولی تو سکھوں کا زمانہ تھا پھر "کمپنی" آ گئی اس کے بعد کمپنی کی "نیک بیٹی" وکٹوریہ کا دَور آیا، پھر اس کے بیٹے پوتے تخت پر بیٹھے۔ آخر میں گاندھی اور جناح آزادی کا دَور لائے جو اب تک چل رہا ہے ان بڑی اماں کا خیال یہ ہے کہ "کمپنی" اگرچہ بڑی کمپنی اور بدچلن تھی، مگر اس کا راج سکھوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھا۔ "کانے" کے وقتوں میں تو اکالی فوج کسی مسلمان کے گھر میں اناج کی بوری گھی کا پیپا اور جوان لڑکی رہنے ہی نہ دیتی تھی۔ کمپنی نے آ کر امن قائم کیا۔ اس کی بیٹی وکٹوریہ کے تو کیا ہی کہنے بہت نیک صفت رانی تھی۔ بیچاری بڑی اماں کی باتوں سے ہم جو نتیجہ نکال سکتے ہیں وہ یہ کہ کمپنی کے راج میں شلجم جیسی گوری گوری اور چقندر کی طرح لال لال رنگت والے صاحب اور میمیں سمندر پار سے آتے تو انھیں یہاں کے کالے پیلے لوگ جنھیں وہ نیٹو اور بلیکی کہہ کر پکارتے تھے۔ دیکھنے میں بہت بُرے لگے۔ در اصل انھیں نیٹو کی کالی رنگت کے علاوہ ان کے ننگ دھڑنگ بچوں کی بہتی ناکوں، دکھتی آنکھوں اور ان پر بیٹھی ہوئی ڈھیروں ڈھیر مکھیوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ آبادیوں سے دُور ستھرے ستھرے گھر بنا کر الگ تھلگ رہتے۔ کالے آدمی کو نوکر رکھتے تو اس کے ہاتھ پاؤں فینائل سے دھلوا لیتے۔ اس طرح اپنی رنگت اور صحت کے علاوہ تہذیب کی بھی حفاظت کرتے۔ اُسی دَور میں دیسی صاحب بننے شروع ہوئے۔ ان لوگوں نے اپنا چلن بدل ڈالا سوائے رنگ روپ کے باقی سب کچھ بڑے صاحبوں جیسا بنا لیا۔ دیکھا دیکھی یہ بھی آبادیوں سے کھسکنے لگے۔ انھوں نے اپنی کوٹھیاں بڑے صاحب سے ذرا چھوٹی اور فاصلے پر بنوائیں۔ اس طرح حاکم اور رعایا کے درمیان باقاعدہ طور پر حائل ہو گئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ سوسائٹی کی وحدت ٹوٹی۔ بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی کی جگہ طبقے ابھرنے شروع ہوئے۔ یہ ہندوستان تھا جہاں پہلے ذاتوں کی اونچ نیچ تھی، مذہب کی تقسیمیں تھیں۔ اب طبقات کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ بہت دنوں تک تو یہ فرق

فاصلے غیر محسوس طور پر بڑھتے رہے۔ وقت کی رفتار دھیمی تھی، زندگی زیادہ تر اونگھتی رہتی تھی۔ مگر بیسویں صدی کے طلوع کے ساتھ ہی اس نے کروٹ بدلی آنکھیں کھول کر دیکھا افق پر کچھ روشنی پھیلی تھی، پھر بڑے زوروں سے آزادی کی ہوا چلی، آندھی آئی، بجلی کڑکی، آگ بھڑکی خون برسا، دیر بعد مطلع ذرا صاف ہو تو پتہ چلا کہ سب کچھ اتھل پتھل ہو چکا ہے۔ گورا صاحب جو سمندروں پہ تیرتا ہوا آیا تھا، ہواؤں پہ اڑتا ہوا "ہوم" چلا گیا۔ آزادی مانگنے والوں کو حکومت مل گئی۔ دوسرا درجہ اوّل درجہ بن گیا اور وہ سب جو نیٹو کہلاتے تھے۔ پناہ گیر مہاجر شرنارتھی، لوکل اور مقامی قسم کی چیزیں بن کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ کتنے ہی دوسروں کے چھوڑے ہوئے دیہاتوں میں جا بسے اور ہر کسی کو کچھ کیلئے زمین الاٹ ہو گئی۔ کئی ایک مہاجر کیمپوں سے نکلے تو اپنے زورِ بازو اور عملی ذہانت سے کام لے کر شہروں کی متروکہ جائداد کے حصے بٹورنے لگے۔ کچھ مقامی اور لوکل بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ کتنوں نے وقت سے فائدہ اُٹھا کر ذاتیں بدل ڈالیں۔ میراثی سیّد کہلانے لگے۔ دھوبیوں نے چوہدری ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ مگر ان آنے والوں میں بعض ایسے بھی آئے جو نہ تو کہیں گئے، نہ انھوں نے کچھ لیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس نہ ہمت تھی نہ عقل۔ بس ایک پوٹلی سی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، جسے وہ شرافت کہتے تھے۔ اس پوٹلی کو سینے سے لگائے کچھ دن تو رفیوجی کیمپ کے دال چاول کھاتے رہے۔ پھر جب کیمپ بند ہو گئے تو اپنی پوٹلی سنبھالے سنبھالے فٹ پاتھوں پہ جا بیٹھے۔ اور یہیں کہیں اندھیرے سویرے ان کی یہ پوٹلی چوری ہو گئی۔ چرانے والے نے جانے کیا متاع سمجھ کر چرائی مگر جب کھولی تو اس میں سے گلی سڑی شرافت نکلی۔ اس نے تو ناک چڑھا منہ بنا پوٹلی اٹھا کر گھورے پہ پھینک دی۔ مگر اگلوں کے پاس جینے کا ذرا سا سہارا بھی نہ رہا۔ پھر جب ترقی کا دور آیا اور نئے ملک میں صنعتی انقلاب کے ساتھ پلاسٹک کی صنعت نے ہاتھ پاؤں

نکالے تو ان سب نے جن کی پوٹلی چوری ہوگئی تھی اپنے ہاتھ پاؤں پہ پلاسٹک کے کوڑھ سجا لیے اور گھات میں بیٹھ گئے کہ جہاں کوئی صحت مند اور خوش پوش خاتون خوب سے خوب تر کی تلاش میں پوشاک محل یا ساڑھی ہاؤس کا رُخ کرتی دکھائی دی۔ اس غیر شریف مخلوق نے اپنا کوڑھ بھرا ہاتھ اس کے منہ پہ جا نچایا۔ یہ اور ایسے ایسے کتنے اور کام تو عام لوگوں نے کیے۔ مگر خاص لوگوں نے جو اب حکمران بھی تھے۔ زندگی گذارنے کے سنہرے اصول اور زیادہ چمکدار بناتے۔ ستاروں پہ کمندیں ڈالنے والی قوموں سے جہاں اور بہت کچھ سیکھا۔ لائف و کلچر کو حرارت بخشنے والے پلانٹ بھی امپورٹ کیے اور پھر اپنی صحت کا تحفظ خاطر خواہ کرنے کے لیے اپنی بستیاں ہی الگ بسا لیں۔ پھولوں، کونپلوں جیسے ان کے نام رکھے۔ اب ان دو دنیاؤں کے درمیان کا کم از کم فاصلہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ کوئی مکھی یا مچھر جیسی مخلوق اُڑ کر بھی جانا چاہے تو راستے میں ہلاک ہو جاتے۔ بھوک پیاس سے مَر جاتے۔ اس صورتِ حال نے لیڈروں کے لیے پریشانی کے خاصے سامان کیے۔ یہ بیچارے تو نہایت مخلص ہیں۔ غریبوں اور امیروں کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ دونوں کی دنیاؤں کو بلکہ ساری دنیا کو اپنا سمجھتے ہیں۔ دن رات اس وسیع خلیج کو پاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ نظریات کے پُل بنا کر اِدھر سے اُدھر گھن چکر ہوتے پھرتے ہیں۔ سڑکوں کے طول تو خیر کاریں طے کر لیتی ہیں۔ پٹرول کا خرچہ پارٹی فنڈ سے نکل آتا ہے مگر وہ حالات کے کڑے کوس وہ ذہنوں کے فاصلے اور دلوں کے فرق!!

بہت تھوڑے وقت میں یہ فاصلہ اتنا پاٹ دار اس طرح ہوگیا کہ ترقی دونوں طرف سے رفتار پکڑ رہی ہے۔ غریب بھی زندگی کے ارتقا میں کچھ مرحلوں سے گزرے ضرور ہیں۔ وہ جو پہلے رعایا کہلاتے تھے، بعد میں دو صدیوں تک نیٹو رہے پھر رفیوجی مہاجر، لوکل و مقامی بن کر رہ گئے۔ اب آخر میں عوام کہلانے لگے ہیں۔ مگر اس سے آگے کچھ اور بننے کے لیے تیار نہیں

ہیں۔ اب تو یہ لوگ خاصے خود مختار ہو چکے ہیں۔ اپنے معاملات سے خود ہی الجھ رہے ہیں۔ یہ شاید خود شناسی کا کوئی مرحلہ ہے۔ یہ لوگ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے چکر میں پڑے ہیں۔ اب کوئی انھیں آسانی سے بنا نہیں سکتا۔ بلکہ یہاں تک سُنا گیا ہے کہ یہ لوگ پرانی تقدیر کا مسودہ کھوج رہے ہیں، تاکہ اسے پھاڑ کر زندگی کا نیا عہد نامہ لکھیں۔ مگر پرانے مسودے کو تو پہلے ہی دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ اس بات کا انھیں شاید علم نہیں۔ علم ان کا کتنی اور معاملات میں بھی کم ہے۔ یہ بات بھی ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والا بدنام زمانہ غیر ملکی حکمران تو چلا گیا۔ آزادی ملے بھی تہائی صدی ہونے کو آئی مگر ان کے دکھ درد کم نہیں ہوتے اور ٹیکس تو پہلے سے دگنے چوگنے ہو چکے ہیں تو کیا ان کے دکھوں کی جڑیں غیر ملکیوں کی آمد سے پہلے کے زمانوں تک پھیلی ہیں؟ یا کوئی اب بھی چوری چوری لوٹ کھسوٹ کر رہا ہے؟ بہرحال جس دن بھی انھیں بات کا سراغ مل گیا۔ اسی دن کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ دکھ درد کی جڑیں کٹ جائیں گی یا پھر لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی گردنیں۔

ہاں جو لوگ ایسے ایسے مشکل سوال حل کرنے میں جتے ہوں۔ ان سے اب یہ کہاں ممکن کہ ٹھیٹھ رعایا والے انداز سے بیٹھ کر امیروں کے ٹھاٹھ باٹھ اور ناز نخروں والی باتوں پر محاورہ بندی کریں۔ یا ہاتھی جیسی دقیانوسی اور بورژوا صفت مخلوق سے دل چسپی رکھ کر اپنے غیر ترقی پسند ہونے کا ثبوت مہیّا کریں۔ جبکہ یہ مخلوق کچھ دنوں بعد چڑیا گھروں سے بھی ناپید ہونے والی ہو۔ دنیا سے ناپید ہو جانا ہاتھی کا مقدر ہے اور شاید امیروں کا بھی۔ کہ ہر بڑی اور جسیم شے کا مقدر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جتنی بڑی نام آوری اتنی بڑی گمنامی... اس زمین کے کتنے بڑے بڑے خدا پتھر کے میناروں میں چنے گئے۔ اعظم اور عظیم کے لقب سے پکارے جانے والے زار آج لینن گراڈ کے عجائب گھروں میں تماشہ بنے رکھے ہیں۔ فاتح عالم کے تاج پہننے والے تاریخ کے صفحوں پر دھبے

بن کر چمٹ گئے۔ انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنانے والوں کو آنے والے وقتوں میں وحشی درندے کہہ کر پکارا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد لوگ دیکھیں گے کہ فرعونوں زاروں اور ہٹلروں کی قطار کے آخر میں ہاتھی کا مجسمہ بھی رکھا ہوگا۔ جس کے سرہانے لگی تختی پہ اس کی تاریخ مختصر لفظوں میں درج ہوگی۔ مگر جو چیز ہاتھی کو لوگوں کے حافظے سے محو نہ ہونے دے گی۔ وہ یہ تختی نہیں بلکہ وہ حقیر و ناچیز چیونٹی ہوگی جو اس وقت بھی کہیں آس پاس خاموش اور بے نام سی مصروفیت میں اُلجھی رینگ رہی ہوگی۔ جبتک یہ چیونٹی اس زمین پہ رینگتی رہے گی۔ لوگوں کی یادوں میں کتنی داستانیں جاگتی رہیں گی۔ وہ داستانیں جن میں ہاتھی اور چیونٹی کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ یہ داستانیں دو مختلف زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک کا زمانہ الہامی تھا۔ دوسری کا عوامی ہے۔ الہامی سے مراد وہ زمانہ ہے جب دنیا میں پیغمبر آیا کرتے تھے۔ یہ وہ دن تھے کہ جب خدا دنیا سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ یہ ذکر سلیمان کے زمانے کا ہے حضرت سلیمان جو پیغمبر ہوئے اور بادشاہ بھی ہوئے۔ پیغمبروں میں تو پتہ نہیں۔ ان کا درجہ کونسا ہے۔ مگر بادشاہ ان کے مقابلے کا نہ ہوا نہ ہوگا۔ وہ شرق و غرب جن و انس چرند پرند، درند، کیڑے مکوڑے، پتنگے پروانے سب کے بادشاہ تھے۔ ہوا پانی، غائب حاضر سب پہ ان کی حکمرانی تھی۔ اس سلطنت بے مثال کا انتظام بھی لاجواب تھا۔ انٹیلی جنس کا محکمہ جنوں کے سپرد تھا جو ملک کے گوشے گوشے پہ نگاہ رکھتے تھے اور اکاش سے لے کر پاتال تک خبریں لاتے۔ سلطنت میں ہر طرف امن ہی امن تھا۔ ظاہر ہے جب ایک ہی بادشاہ ہو تو بدامنی کون پھیلائے گا۔ مگر ایک دن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک بہت ہی سینئر قسم کا جن جو شاید نہیں، بلکہ یقیناً ڈائریکٹر تھا۔ انٹیلی جنس کے محکمے کا خبر لایا کہ سلیمان کی سلطنت میں دو باغی موجود ہیں۔ ایک زمین کے اُوپر حسین و جمیل ملکہ صبا جو غرورِ حسن کے ساتھ دماغ سلطنت بھی رکھتی ہے۔ دوسری زیرِ زمین ایک حقیر و ناچیز چونٹی جو اپنے چھوٹے منہ کے ساتھ آزادی و خود مختاری جیسی بڑی بات کہتی ہے۔ سلیمان بادشاہ نے یہ بات سُنی تو

دونوں کو دربار میں طلب کیا۔ ملکہ صبا کو بھی اور چیونٹی کو بھی۔ ملکہ حاضر ہوئی تو سلیمان نے اس کے سامنے وہی شرائط رکھیں جو ازل سے مرد عورت کے سامنے رکھتا آیا ہے۔ بلقیس ملکہ صبا نے بھی کوئی نئی بات نہیں بلکہ وہی کیا جو ازل سے عورت مرد کے سامنے کرتی آئی۔ یعنی سرِ تسلیم خم۔ ایک بغاوت تو اس طرح بخیر و خوبی فرو ہوئی۔ مگر دوسری داستان اتنی سادہ و رنگین ثابت نہ ہوئی۔ چیونٹی نے جن و انس کے بادشاہ کا فرمان سنا تو کہلا بھیجا کہ وہ ایک آزاد قوم کی خود مختار ملکہ ہے، اس قسم کے احکام سننے اور سمجھنے کی عادی نہیں ہے۔ ہاں اگر آپس کی غلط فہمیاں دُور کرنے کے لیے وفود کے تبادلے یا اعلیٰ سطح کے مذاکرات کی ضرورت ہو تو اس کا باقاعدہ اہتمام کیا جا سکتا ہے پھر بنیادی پالیسی طے کر لینے کے بعد دونوں مملکتوں کے مابین سفارتی تعلقات کے قیام کے بارے میں بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ اپنے جواب کے آخر میں چیونٹی نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ اگر امن و صلح کی فضا میں اختلافات کا حل تلاش نہیں کیا جاتا تو چیونٹیوں کی امن پسند قوم اپنی آزادی و خود مختاری کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں اترنے سے گریز بھی نہیں کرے گی۔ شرق و غرب کے بادشاہ کا چیونٹی سے لڑنا مناسب تو نہ تھا مگر اس حقیر و ناچیز کیڑے کی کھلی بغاوت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میدان جنگ میں ہاتھی بھیج دیئے گئے کہ وہ اس گستاخ مخلوق کو کچل کر پیوندِ زمین کر دیں۔ عجب نظارہ تھا۔ شاہ سلیمان کے دیو قامت ہاتھی قطار در قطار آگے بڑھے تو لگا جیسے پہاڑوں کے سلسلے چل پڑے۔ ایک ایک گرانڈیل و کوہ پیکر وجود حرکت کرتا تو اس کے قدموں تلے زمین دھنستی چلی جاتی ــ اُدھر سامنے سے دائیں سے بائیں سے اور ہر طرف سے چیونٹیاں نکلیں ــ اِتنی نکلیں کہ جیسے رات زمین پر اتر آتی ــ اندھیرے کا فرش ہر طرف بچھ جائے اور کسی سیاہ کالی شے کا سمندر زمین پہ امنڈتا چلا جائے ــ یہ حقیر چیونٹی نہ تھی، چیونٹی کا اجتماعی وجود تھا ــ عظیم وجود! پاتال کی دنیا کا مظاہرہ

تھا۔ زمین کے اوپر چیونٹی کی ڈھیری ڈھا دینا، چیونٹی کو چٹکی میں مسل ڈالنا
جتنا آسان ہے اس کے اجتماعی وجود کا مقابلہ کرنا اتنا ہی مشکل اتنا زیادہ مشکل کہ
سلیمان بادشاہ کے ہاتھی کئی دنوں کی جنگ کے بعد جب اس کالی بلا کے چنگل
سے آزاد ہوئے تو ہڈیوں کا پنجر تھے جو بھوری زمین پہ ہر طرف بکھرے پڑے
تھے۔ یہ تو میدان جنگ کا نقشہ تھا۔ پھر مذاکرات کی میز پر کیا ہوا چیونٹی نے
سلیمان کے سامنے کون سی شرائط رکھیں، صلح نامے کی شہ سرخی کیا تھی، باقی
مدوں میں کیا کچھ درج ہوا؟ الہامی کتابیں اس پر خاموش ہیں۔ یہ بڑی مشکل
ہے کہ الہامی کتابیں ہر اہم نتیجے والی بات پر خاموشی اختیار کر لیتی ہیں، بلکہ آئندہ
سوچ بچار پر بھی مناہی کی حد لگا دیتی ہیں۔ لہٰذا اس وقت ہم پہ واجب یہی ہے
کہ شاہ سلیمان اور چیونٹی کی جنگ کے نتائج پر کسی قسم کی قیاس آرائی کیے بغیر بانس
کے جنگلوں کی طرف چلیں جہاں زمانہ حال میں تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ
یہی داستان با انداز دیگر دہرائی گئی ہے۔

تو سنو! ہوا یہ کہ جنگل کے بادشاہ شیر نے کچھ عرصہ پہلے انتقال کیا۔ اس نے
اپنے پیچھے نہ تو کوئی ولی عہد چھوڑا، نہ ہی وصیت لکھی۔ اس صورت حال سے
فائدہ اٹھا کر ہاتھی نے جنگل پہ حکومت کرنے کا خواب دیکھا۔ بادشاہت کی
وراثت تو اس کے پاس تھی نہیں۔ لومڑی نے اسے ایک ترکیب بتائی جو
واقعی بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ چند ہی دنوں میں یہ خبر عام ہو گئی کہ آئندہ جنگل
کا نظامِ حکومت جمہوری بنیادوں پر استوار ہوگا۔ بادشاہ کی بجائے ایک صدر
ہوا کرے گا۔ جس کے اختیارات بادشاہوں سے زیادہ ہوں گے اور طاقت تو
کہیں زیادہ۔ یہ صدر اپنی من مانی لوگوں سے کراتے گا۔ یعنی پہلے اپنے حق
میں سب سے ووٹ ڈلواتے گا۔ پھر سب پر حکومت کرے گا۔ چناؤ کے وقت
ان سارے جانوروں کے نمائندے مقررہ جگہ جمع ہوتے اور ہر کسی نے ہاتھی
کو سلام کیا۔ اس سلام کا مطلب تھا کہ ہاتھی کی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہی ان کا

ووٹ تھا۔ سب سے آخر میں چیونٹی آئی جس نے محفل کے رنگ میں بھنگ اس طرح ڈالا کہ نہ صرف ہاتھی کو ووٹ دینے سے انکار کیا، بلکہ اس کے خلاف تقریر بھی کی۔ ہاتھی جو کرسیٔ صدارت پہ پہلے سے جلوہ افروز تھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور غصے کے عالم میں چیونٹی کی گستاخی پر چنگھاڑنے لگا۔ دراصل اس نے چیونٹی کی تقریر خود نہیں سنی تھی۔ بلکہ اس کا سارا متن پولٹیکل ایڈوائزر بی لومڑی نے نمک مرچ لگا کر سنایا تھا۔ چیونٹی کا موقف یہ تھا کہ ہم یعنی چیونٹیاں ایک الگ قوم ہیں۔ ہماری تاریخ بلکہ جغرافیہ بھی باقی تمام جانوروں سے مختلف ہے اور جداگانہ ہے۔ ہم نے کبھی شیر کی حکومت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ رہی جمہوریت تو اس میں ہماری تعداد کو دیکھتے ہوئے حکمرانی کا حق ہمارا ہے۔ پھر ہمارے پاس محنت کی قوت ہے۔ اس لیے ہاتھی صرف بڑے جانوروں پر حکومت کر سکتا ہے۔ ننھی چیونٹی پر حکمرانی کرنے کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ہاتھی نے چیونٹی کبھی دیکھی تک نہ تھی۔ مگر یہ باتیں سن کر اسے دیکھنا چاہا مگر باوجود آنکھیں پھاڑنے کے نہ دیکھ سکا۔ آخر شیروں کی نشان دہی پر بہت گہری پستیوں میں نگاہ کی تو اس حقیر وجود کو دیکھا۔ چیونٹی کو دیکھتے ہی ہاتھی کا غصہ کافور ہو گیا۔ اس نے بھرے جلسے میں اُونچے اُونچے قہقہے لگا کر چیونٹی کی تحقیر کی اور پھر نئی نئی صدارت کے نشے میں جھومتا جھامتا چلا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہاتھی کے کان میں کوئی قیامت سی برپا ہوئی۔ اس نے زور زور سے سر کو جھٹکا۔ کانوں کے پنکھے ہلائے۔ مگر قیامت بڑھتی چلی گئی۔ اس نے درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر سر کو زخمی کر لیا، زمین پہ لوٹا، کیچڑ میں اتھل پتھل ہوا مگر کان کے اندر کی شورش بڑھتی چلی گئی۔ بات سارے جنگل میں پھیلی۔ بہت سے غمگسار اور وفادار بھاگے بھاگے آئے۔ اور تو کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر بی لومڑی جو اب جمہوریہ جنگل کی ایجوکیشن سیکرٹری تھیں۔ بات کو پا گئیں۔ اس نے اپنی عقل سے جان لیا کہ صدر ہاتھی

کے کان کی شورش چیونٹیوں کی تخریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ صدر کے کان کا پنکھا اُٹھا کر اندر جھانکا تو چیونٹیوں کے ایک دستے کو مصروفِ کار پایا۔ ڈاکٹر سارس کی خدمات فوراً حاصل کی گئیں اور یوں ایک ایک تخریب کار کو چُن چُن کر کچل یا مسل ڈالا گیا۔ ہاتھی کے کان کو تو سکون مل گیا مگر دل کا سکون بحال نہ ہو سکا۔ صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے جنگل میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا۔ دفعہ ایک سو چوالیس تو خیر سارے جنگلیوں پر لگ گئی مگر چیونٹیوں کی قوم کو باغی قرار دے دیا گیا۔ سارے جنگل میں ایک ہول سا طاری ہو گیا۔ گوشے گوشے میں سول انٹیلی جنس کے ایجنٹ چوکنے ہو گئے۔ چیونٹی دل کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ان ٹھکانوں کی نشان دہی ہونے لگی جہاں چیونٹیوں نے اپنے گڑھ بنا رکھے تھے۔ ذہین جانوروں نے بہت جلد یہ اطلاعات صدر کو پہنچائیں کہ چیونٹیاں اگرچہ زیرِ زمین رہتی ہیں مگر خوراک جمع کرنے والی تنظیموں نے اپنے ٹھکانے بانس کی جڑوں میں بھی بنا رکھے ہیں۔ بانس کے جھنڈ تو ہاتھی کی پسندیدہ سیرگاہ تھی کہ وہ وہاں سے اپنا من بھاتا ناشتہ یعنی بانس کی کونپلیں حاصل کرتا تھا۔ اب تو اس نے یہ معمول بنا لیا کہ ہر روز خوشامدیوں اور مددگاروں کی ٹولی ساتھ لے کر جنگل میں جاتا، بانسوں کی پھُنگ پھُنگ کاٹ کر منہ میں ڈال لیتا اور پھر بانس کے تنے سونڈ میں لپیٹ کر جھٹکے دیتا تو وہ جڑ سے اُکھڑ جاتے اور ساتھ ہی نرم نرم مٹی کے بڑے بڑے چکتے بھی نکل آتے۔ اس طرح چیونٹیوں کی خوراک کے ذخیرے بکھر جاتے۔ پیٹ بھرنے کے بعد تو وہ اور بھی بدمست ہو جاتا۔ اپنے پہاڑ سے جسم کے ساتھ اُچھل کود کرکے ایک تباہی مچا دیتا۔ چیونٹیاں اس قسم کے حالات کی عادی ہیں۔ انسان بھی اکثر ان کی ڈھیریوں پہ ہل چلا دیا کرتا ہے۔ سیلابوں اور بارشوں میں بھی بہت سی تکالیف آجاتی ہیں۔ مگر کچھ دنوں ہی میں انھیں علم ہو گیا کہ یہ سب کچھ تو ہاتھی کر رہا ہے اور انتقامی جذبے سے کر رہا ہے۔ ہاتھی سے چیونٹیوں کو

یوں بھی بڑی نفرت تھی کہ اس نے جنگل میں جمہوریت کے نام سے فرعونیت قائم کر رکھی ہے۔ جنگل کے جانوروں کو خوشامدی چغلخورے اور لالچی بنا کر ان کا کردار بگاڑ رہا تھا۔ اُس دَور میں اور اِس دَور میں کچھ بھی فرق نہ تھا۔ سوائے ناموں کے۔ بادشاہ صدر اور رعایا عوام کہلانے لگی تھی۔ وہی طاقتور کی حاکمیت اور کمزور کی محکومی تھی۔ مگر چیونٹی تو کمزور نہیں اس کے پاس تو بڑی قوت ہے۔ تعداد کی فوقیت، اتحاد کی قوت اور محنت کی دولت اور پھر اس کا اجتماعی وجود! ہاتھی کے پاس زیرِ زمین سے وفد آیا کہ وہ بانس کے جنگلوں میں تباہی مچانا بند کر دے، ہاتھی کو اپنے کان میں پیش آنے والا واقعہ یاد تھا۔ اس لیے اب کی بار وہ چیونٹی کی بات کو قہقہوں میں نہ اڑا سکا۔ مشیروں کا اجلاس ہوا ساری بات ان کے سامنے رکھی تو ان خوشامدی احمقوں نے صدر ہاتھی کو یہی مشورہ دیا کہ چیونٹی انتہائی حقیر اور ذلیل چیز ہے۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اسے کچل دیا جائے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ بس پھر تو اگلا دن حشر کا دن تھا۔ بانس کے جنگلوں میں قیامت ٹوٹ پڑی۔ بڑے بڑے دھماکے ہوئے۔ کئی دنوں کی توڑ پھوڑ کے بعد حالت یہ تھی کہ زمین کے سینے پہ گھاؤ ہی گھاؤ تھے اور ہر طرف بانسوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ صدر کے مشیروں نے گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ تباہی توقعات سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ لہٰذا رپورٹ پیش کر دی کہ جنگل میں امن قائم ہو گیا ہے۔ ایک چیونٹی بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی، دوسرے جانور بھی عبرت پکڑ چکے ہیں۔ باغیوں اور تخریب کاروں کا مکمل صفایا بہت بڑی خبر تھی، ہاتھی نے سنی تو خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ اپنے مشیروں اور بہادروں کو تمغے و انعامات بانٹے۔ اعزاز اور ترقیاں بخشیں اور بہت بڑے بڑے جشن کا اہتمام کروایا۔ رات گئے تک سب ناچتے گاتے اور فتح کے شادیانے بجاتے رہے پھر تھکن اور نشے سے چُور ہو کر سو گئے۔

مگر صبح کا سورج نکلا تو مشیروں وزیروں نے دیکھا کہ صدر ہاتھی کی خوابگاہ

میں کچھ ہڈیاں اور دانت پڑے تھے۔ یہ چیونٹیوں کی مکمل تباہی کے بعد کا واقعہ ہے۔ خُدا جانے رات کے کون سے حصّے میں اور کن راستوں سے چیونٹی دل حملہ آور ہوا۔ کس وقت گوریلا دستوں نے صدر کی سونڈ کے اندر کے گلابی گوشت کا ناشتہ کیا اور باقی لشکر نے کب اس کے پہاڑ سے جسم کو ننھے ننھے ریزوں میں تبدیل کر کے اپنے خوراک کے ذخیروں میں منتقل کیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ صدر ہاتھی کی آخری مدافعت کیا تھی؟ ہاں البتہ وُہ حقیر ذلیل اور بے معنی سی چیز یعنی کہ چیونٹی اس خرابے میں ایسے رینگتی پھر رہی ہے کہ جیسے کبھی کچھ ہُوا ہی نہیں۔

مارچ ۱۹۷۳ء

کیمپ اور قافلے

" ہمارے پاس نہ آئیڈیل تھے نہ سیاست ، صرف بگڑی ہوئی زندگیاں تھیں جس کا نتیجہ اس بگڑی تاریخ میں ظاہر ہوا ، یہ سب" اس نے چاروں طرف ہاتھ پھیلایا "تم دیکھ ہی رہے ہو، تاریخ کی کونسی شکل ہے۔ یہ وہ نسل ہے جو ملک کی تاریخ میں عرصے عرصے بعد پیدا ہوتی ہے جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا جو پیدائش کے دن سے اُداس ہوتی ہے اور اِدھر سے اُدھر سفر کرتی رہتی ہے۔ ہم ہندوستان کی اُس بدقسمت نسل کے بیٹے ہیں" یہ الفاظ عبداللہ حسین نے لکھے۔ وہ ۱۹۴۷ء کا سال تھا جب لاکھوں انسانوں کے قافلے اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر کو سفر کر رہے تھے۔ برِصغیر کی آبادی وسیع پیمانے پر نقل مکانی کر رہی تھی۔ اپنی مرضی سے نہ اپنے ارادے سے محض مجبوری سے یہ مجبوری بھی ان کی کسی ضرورت کی مجبوری نہیں تھی۔ نہ تو کہیں قحط پڑا تھا نہ ان کے جانوروں کا چارہ ختم ہُوا تھا، نہ پانی کی کمی تھی۔ دونوں طرف کے لوگوں نے اپنے کھیتوں میں فصل بوئی تھی ، پانی دیا تھا ، ساونی کی بوائی ختم کر کے وہ ابھی نئی نئی ملنے والی آزادی کے بارے میں خیال آرائی کرنے کے لیے بیٹھے بھی نہ تھے ، نئے آزاد ہونے والے دونوں ملکوں کے درمیان حد فاصل کے لیے ابھی چونے کی لکیر بھی نہیں کھینچی گئی تھی کہ لہو کا دریا بیچ سے پھُوٹ نکلا اور دونوں طرف کے لوگوں کو ایک عجلت میں اسے عبور کرنا پڑا۔ کچھ ڈوب گئے کچھ پار اُترے۔ کچھ لوگ اپنے ہل بیل ساتھ لے آئے۔ کچھ خالی ہاتھ ہی آسکے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ ہندوستان کی نئی تاریخ بن رہی تھی۔ ہندوستان اب دو قوموں کا مُلک

تھا، اس نے پُوری دو صدیوں بعد برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کر لی تھی، مگر اس کے شمال مغرب اور مشرق کے علاقوں نے خود ہندوستان سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ یہ علاقے پہلے بھی آزاد ہو جایا کرتے تھے۔ اپنے مخصوص جغرافیے کی وجہ سے اب کی بار سب کچھ با.نداز دگر ہُوا تھا۔ اب کی بار اس کارروائی میں تاریخ کا ہاتھ زیادہ تھا۔ عجب مُلک رہا یہ ہندوستان بھی اور عجب لوگ تھے یہاں کے۔ قوسِ وقزح کے رنگوں کی طرح پہلے دُور دُور سے آکر آپس میں ملتے رہے۔ پھر اچانک سے الگ الگ ہونے لگے۔ سبز سُرخ نیلا پیلا اپنے اپنے رنگ جُدا جدا کرنے لگے۔ جہاں جہاں پہ یہ رنگ نمایاں اور صاف تھے وہاں تو تقسیم کی لکیر لگ گئی مگر جہاں باہم گڈمڈ ہو چکے تھے، وہاں کسی کا بس نہیں چلا۔ سارے لیڈر بے بس سارے دانشور بیکار۔ لیڈر اور دانش ور تو یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے بھی نہیں۔ ان کا بیان تو یہی تھا کہ خود لوگ یہی چاہتے تھے اور بہت دنوں سے چاہتے تھے۔ یہ ان لوگوں کی چاہ ہی تو تھی کہ پون ہزار برس تک آمنے سامنے رہ کر اُنھوں نے مُلک کی بوڑھی کبڑی تاریخ کو سیدھی کھڑی ہو کر ڈگ بھرنے کا حوصلہ بخشا۔ محمد بن قاسم اور شہاب الدین غوری کے ساتھ جو لوگ آتے تھے وہ بڑے جی دار اور من مرضی کے لوگ تھے۔ انھوں نے پہلے کے لوگوں کو صحیح سالم چھوڑ دینے میں اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کیا اور خود بھی اپنے طور سے زندہ رہے۔ تڑپ کرنے کی بجائے جذب کرنے کا عمل شروع ہُوا۔ عجیب عمل تھا یہ کہ لوگ ایک جیسے بھی رہے اور مختلف بھی اور ان کے چہروں مہروں اور نقش و نگار میں جتنی مناسبت تھی عبادت گاہوں میں اتنا ہی تضاد تھا۔ کئی صدیوں بعد ایک تیسرے مذہب کی قوم نے آکر اور تو جو کیا سو کیا، ان دونوں کا اعتماد ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ آزادی کے وقت ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے سے خوف زدہ تھے۔ دونوں ایک ہی بات سے ڈرتے تھے۔ اپنی آزادی

کو پھر سے کھو دینے سے ڈرتے تھے۔ شاید اسی خوف میں انھوں نے 'ملک بانٹ لیا۔ یہ کام تو لیڈروں نے بدرجہ احسن کروا دیا مگر نقل مکانی کا کام لوگ خود ہی کر رہے تھے اور بری بھلی طرح کر رہے تھے۔ چلتے چلتے بھی ایک دوسرے کے پیٹ میں چھُرے گھونپ رہے تھے۔ وہ لوگ جو گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے انھیں رزق اور موت کے خوف میں مبتلا کر کے نکال دیا گیا۔ یوں صدیوں اکٹھے رہتے رہتے لوگ الگ تو ہوئے اس طرح ہوتے کہ ایک سلامتی کے لیے ہاتھ پھیلا رہا تھا دوسرا موت کے گُرز برسا رہا تھا۔ مگر بات فقط یہیں پہ ختم نہیں ہو جاتی۔ ان لوگوں کی تھاہ لینا بڑا مشکل کام ہے۔ ابھی چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ لوگ پچھتا رہے تھے۔ اپنے کیے پہ نادم ایک دوسرے کو چٹھیاں لکھ رہے تھے اور سندیسے بھیج رہے تھے۔ اُدھر تقسیم کی لکیر کے دونوں طرف لوگوں میں باہم لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ مہاجر اور مقامی کے جھگڑے، زبان اور کلچر کے تعصب، علاقوں اور صوبوں کی اُلجھنیں لوگوں کی آباد کاری سے بھی پہلے ہی شروع ہو گئیں۔ یہ بات تو شاید ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ سارے تضاد مذہب سے پیدا نہیں ہوتے مگر اندر کی بات جو سارے جھگڑوں کی جڑ تھی وہ ابھی تک اُن سے پوشیدہ تھی شاید اس لیے کہ یہ سمجھنے سمجھانے کا قصہ سب لوگوں کا تو نہیں ہوتا۔ آبادیوں میں بستے ہوئے یا قافلوں میں چلتے ہوتے سارے لوگ ایک جیسے کہاں ہوتے ہیں۔ اُن میں بھی اکثر لوگ تو وہی تھے جنکی زندگیوں کا مقصد ازل سے زمین آباد کرنا ہوتا ہے، جہاں بھی زمین مِل جاتے یہ لوگ ہل چلا کر اناج بو دیتے ہیں اور فصل کاٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی سوچیں سوچتے ہیں۔ بڑی سوچیں سوچنے والے دوسرے لوگ ہیں جو تاریخ بدلنے کا مشن بناتے ہیں، تہذیب کی دیکھ بھال اور زبان و کلچر کی سدھار کرتے ہیں اور بہت کچھ تلپٹ کر کے اکثر ناکام و ناخوش ہی مر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ تاریخ چند لوگوں کا کہا نہیں

مانتی وہ تو اُدھر کو چلتی ہے۔ جدھر کو بہت سے لوگ چلیں چاہے کسی طور سے چلیں، عبداللہ حسین کا بوڑھا پروفیسر بھی ایسے ناکام لوگوں میں سے ہے۔ اسے اس طرح قافلوں میں چلتی ہوئی تاریخ اچھی نہیں لگ رہی۔ مگر اس منہ زور دھارے کے آگے تمنائیں کیا معنی! یہ بوڑھا جب جوان تھا تو انقلابی تھا، ملک کی آزادی کا حامی، سامراج دشمن۔ صدیوں سے مسلط سیاسی غلامی کے علاوہ جنم جنم سے چلتی ہوئی اقتصادی اور طبقاتی غلامی کے خاتمے کی آرزو کرنے والا۔ یہ کوئی چھوٹا سا آئیڈیل تو نہیں۔ یہ تو بہت بڑی: شاید انسانی ذہن کی سب سے بڑی آدرش ہے جو ناکامیوں کی دُھول میں اَٹ کر بے آب ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر یہ لوگوں کی آدرش ہے۔ چند لوگوں کی نہیں۔ چند لوگ خواہ کتنا ہی کچھ کریں:۔ ملک تقسیم کر دیں، حکمرانی حاصل کرلیں۔ ساری دولت پہ قابض ہو جائیں، انقلاب نہیں لا سکتے۔ انقلاب سیاست سے مختلف نوعیت کا عمل ہے۔ اسی لیے ہندوستان میں انقلاب نہیں آیا۔ اسی لیے پاکستان میں انقلاب نہیں آیا۔ کہ بعد میں یہاں بھی وہی تکنیک چلائی گئی۔ سیاست بازی کا جو انداز نوآبادیاتی دور کے ہندوستانی لیڈروں نے اختیار کیا، اُس کے اثرات آج تک زائل نہیں ہوتے۔ انقلاب کا نعرہ لگانے والے بھی یہی کرتے رہے: وہ لوگوں کی بستیوں میں سے نہیں اُٹھے نہ لوگوں کے ساتھ ساتھ چلے، بلکہ بڑے بڑے شہروں میں جلسے بُلاتے رہے، خود اُونچے اُونچے پلیٹ فارموں پر چڑھ گئے اور تقریریں کرتے رہے، آئیڈیلسٹ بن گئے اور پھر انقلاب کی آرزو کو میونسپلٹی کے باغ سے توڑے ہوئے پھول کی طرح انھوں نے سینے پر سجا لیا اور ٹھنڈی چھاؤں میں آ بیٹھے (شاید اس پھول کو تر و تازہ رکھنے کے لیے) یہ چند لوگ سیاسی آزادی کی دہلیز پہ ہی دم توڑ گئے۔ اس وقت جب لکھو کھا لوگوں کے قافلے اس خونی دریا کے پار اُتر رہے تھے۔ انقلاب کی آرزو کا وہ پھول مسلا ہوا مٹی سے لتھڑا ہوا کہیں راستے میں گرا پڑا

تھا۔ جانے کتنے قدم اسے روند روند کر گزر گئے تھے۔ ہو سکتا ہے بلوائیوں کے ہاتھوں مارے جانے سے پہلے بوڑھے انقلابی نے کچھ اور بھی سوچا ہو۔ زندگی کا سارا بوجھ پیٹھ پر لاد کر آگ اور خون سے گزر جانے والے ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچا ہو۔ یہ لوگ انقلاب کے ہراول بن جاتے تو کتنی ناکامیوں کے داغ دُھل جاتے، کتنی نسلوں کے سُکھ کی ضمانت مل جاتی! مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب، نہ ماضی میں ان لوگوں سے کوئی کام لیا گیا۔ انھیں محض اجاڑ دیا گیا ہے وہ دوسری جنگ کے بعد کا زمانہ تھا جب انقلاب ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا مگر لوگ عبادت گاہوں کے لیے لڑنے لگے اور ملک بانٹ لیا۔ بعد میں عبادت گاہوں کا بھی کچھ نہ بنا البتہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ نئی مملکت میں سنگ وخشت کے جہاں پیدا ہوئے تو بنکوں کی عمارات مسجد کے میناروں سے سربلند ہوگئیں، انقلابی لیڈروں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور بلیک میں سیمنٹ خرید خرید کر ہاؤسنگ سوسائٹی و گلبرگ میں اپنے لیے آرام دہ گھر تعمیر کر لیے اور پھر اپنی نیلگوں خواب گاہوں میں بیٹھ کر کبھی کبھی اپنی اور اپنے اجداد کی کم نصیبیوں کو یاد کرتے تاریخ کے اوراق الٹتے تو ان پہ خون کے چھینٹے دیکھ کر نڈھال ہو جاتے۔ اسے بگڑی تاریخ کہہ کر اپنا ضمیر مطمئن کر لیتے۔

آج اس تاریخ کا ایک اور باب کُھلا ہے۔ یہ ان بوڑھوں کے پوتوں کی نسل کا دَور ہے۔ لوگوں نے پچیس برس تک کشتی کاٹنے کے بعد حالات کو پلٹا دینے کی کوشش کی ہے مگر نتیجہ پھر وہی نفرت، آگ، خون، بٹوارہ قافلے اور کیمپ۔ اب کے نفرت کا سبب عبادت گاہیں نہیں اور بہت ساری باتیں ہیں مگر اصلی بات آج بھی سامنے نہیں آئی۔ ۱۸۵۷ء، ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء نے کتنا کتنا خون دیا آزادی کے لیے۔ کوئی حساب نہیں۔ عجب کہانی اور عجیب تاریخ ہے۔ اب اسے کیا کہیں۔ اس زمین پر جہاں اُداس نسلیں عرصے عرصے بعد پیدا ہوتی تھیں۔ اب تسلسل سے پیدا ہونے لگی ہیں۔ یہ نسلیں اور آئندہ

نسلیں اسی طرح اداس رہیں گی جب تک ...... جب تک .... پتہ نہیں کب تک اس خوفناک منظر کے سامنے کھڑے ہو کر پیش گوئیاں تو نہیں کی جاسکتیں نا، مگر سوچنے کی بات ہے آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ کب تک یہ لوگ قتل اور تقسیم ہوتے رہیں گے۔ مسائل کا حل لوگوں کو اجاڑنے اور اور تقسیم کرنے میں کیوں دیکھا جاتا ہے کسی اور طرح کیوں نہیں، ڈیڑھ صدی سے دنیا کے اس خِطّے میں جس کا نام ہندوستان تھا یہی ہو رہا ہے۔ جتنی تحریکیں لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے اُٹھیں، انھیں اجاڑنے اور مزید دکھی کرنے کے نتائج پر ختم ہوئیں۔ آج یہاں تین سلطنتیں قائم ہیں، پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش — یہ سب لوگوں کے لیے اور لوگوں کے برتے پر قائم ہوئیں، بظاہر یہ تینوں مُلک ایک دوسرے سے مختلف یا متضاد نظریوں پر چلتے ہیں، کسی بات میں یکساں نہیں ہیں۔ مگر ان تینوں آزاد ملکوں کے لوگ یکساں طور پر دُکھی اور اُداس ہیں۔ اچھے وقت کا انتظار کرتے کرتے اُن کی نسلیں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ کس کس سے امیدیں نہیں لگائیں انھوں نے۔ پتہ نہیں یہ لوگ خود کیوں نہیں سوچتے۔ یہ لوگ، ہم لوگ، وُہ لوگ، پاکستان کے لوگ بھارت کے لوگ، بنگلہ دیش کے لوگ آپس میں کیوں بات نہیں کرتے۔ یہ سب مِل کر کیوں نہیں سوچتے اپنے مسائل کے لیے، اپنے دکھوں کے لیے۔ مگر اس میں بھی شاید ہمارے ماضی کی کارفرمائی کا دخل ہے کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ غیروں کی بات مانتے ہیں اور ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں.. روز بروز اور نسل بہ نسل۔

یہ ۱۹۷۳ء کا سال ہے۔ شہر لاہور میں مشرقی سرحد سے لوگوں کے قافلے پھر چلے آرہے ہیں۔ کیمپ لگ رہے ہیں۔ واہگے کی سرحد پر ایک استقبالیہ کیمپ ہے اور یہ جہاں میں کھڑی ہوں dispersel کیمپ ہے۔ درمیان میں کئی اور کیمپ ہیں، جہاں مشرقی پاکستان کے لوگ آتے ہیں۔ مشرقی پاکستان جو اب بنگلہ دیش ہے۔ یہ لوگ بھارت سے آرہے ہیں، جہاں ان کے

کیمپ قید خانے کہلاتے تھے اور سارے ملک میں پھیلے پڑے تھے۔ پاکستانی مسلمانوں کے کیمپ بنگال سے پنجاب تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء کا سال تھا کہ جب اِسی شہر میں مہاجروں کے کیمپ پھیلے پڑے تھے۔ تب ان کیمپوں کے کوئی نام نہیں تھے۔ لوگوں کے کئی نام تھے، مہاجر، پناہ گیر، رفیوجی، مگر پھر بھی وہ داستان آسان اور سادہ تھی، پاکستان بنا تھا، مسلمان بھارت سے نکال دیئے گئے تو وہ پاکستان آگئے، پہلے کیمپوں میں اُترے پھر آباد ہو گئے مگر اُس کیمپ سے اس کیمپ تک آتے آتے اس خطے کے مسلمانوں کی کہانی کتنی گنجل دار ہو گئی ہے پانی کی طرح کہانی بھی چلتی رہے تو صاف رہتی ہے۔ رُک جاتے تو اس میں کتنی گنجلیں پڑ جاتی ہیں۔ یہاں تو زندگی کو بُری طرح جامد و ساکت رکھا گیا اتنی بُری طرح کہ پچیس برسوں میں قوم صرف دو کیمپوں کے درمیان کا فاصلہ ہی طے کر پائی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک قوم کا قافلہ جانے کہاں بھولتا بھٹکتا رہا۔ کیسا گھور اندھیرا، کتنی لمبی رات کہ وقت بدلا ہی نہیں۔ دوسرے لوگ کتنے آگے نکل گئے، کتنی منزلوں سے گزر گئے اور ہم کیمپوں میں بیٹھے انتظارِ سحر دیکھتے رہے۔ کسی سے کیا کہیں ہم کہاں رہے کیا کرتے رہے؟ ہمیں کچھ خبر بھی تو نہیں۔ ہم جو جانتے ہیں وہ اتنا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا تھا تو لوگوں نے بھارت سے ہجرت کی، پاکستان میں آکر کیمپ لگاتے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان ٹوٹا تو لوگوں نے ہجرت کی پاکستان سے پاکستان طرف کیوں؟ بہت لمبی بات ہے، درمیان میں دو سال بھارت کے کیمپوں میں گزرے کیوں؟ خبر نہیں وہاں یہ لوگ قیدی تھے۔ یہاں کیا ہیں؟ پتہ نہیں۔ ہیں نا عجب پاگل پن کی باتیں، مگر یہ تاریخ پاگل کر دینے والی نہیں تو کیا ہے۔ یہ اُداس نسلوں کا سفر ہے کہ آگ کا دریا ہے خبر نہیں!!

کئی دانا کہتے ہیں کہ لڑنا ہی تھا تو یہ ملک کیوں بنایا۔ اس سے تو وہی لڑائیاں اچھی تھیں جو مذہب کے نام پہ ہوا کرتی تھیں کچھ مزا تو تھا ان میں

کچھ جواز تو تھا اُن کا۔ یہاں تو اَن گنت باتیں ہیں۔ پتہ نہیں ان داناؤں کو وہ اندر کی بات معلوم ہے یا نہیں۔ وہ بات جس کے لیے لوگ لڑوائے جاتے ہیں اور تقسیم کیے جاتے ہیں۔ جرمنی ویت نام کوریا کمبوڈیا فلسطین اور پاکستان نہ مذہب کے لیے توڑے پھوڑے گئے نہ لوگوں کے لیے، فقط اُسی ایک بات کے لیے جو صرف خداؤں کو معلوم ہے۔ کچھ بیوقوف لوگ ایسے بھی ہیں جو اِس ذلیل عمل کو ہجرت کا نام دیتے ہیں۔ وہی ہجرت جو مکے کے لوگوں نے مدینے کی طرف کی تھی اور کچھ اِسے اِسی مُلک کی تاریخ کے حوالوں سے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے پہلے بھی کچھ نہ کچھ ہوتا رہا۔ محلوں اور میناروں والے اس شہر میں لوگوں کے پڑاؤ ڈالنے اور پناہ حاصل کرنے کا دستور بہت پرانا بھی ہے۔ مغرب کی طرف سے کتنے لوگ:۔ لشکری بادشاہ، درویش اور گدڑی پوش اس شہر میں وارد ہو کر اوّل کیمپ ہی لگاتے ہوں گے۔ مگر وہ لوگ اس زمین پر پیدا ہونے والی اداس نسلوں کے لوگ نہیں تھے بلکہ اس پر وارد ہونے والی خوش نصیب نسلوں کے لوگ تھے۔ اپنی ضرورتیں اور مقاصد لے کر آتے۔ ان کی ضرورتیں یہاں آکر پوری ہوئیں۔ ان کے مقاصد یہاں پایہ تکمیل کو پہنچے۔ اُنھوں نے یہاں آکر کیا نہیں کیا۔ راج رچے محل سجاتے، دین پھیلاتے اور نئی نئی تہذیبوں کو فروغ دیتے۔ بھول ان سے یہی ہوئی کہ اُنھوں نے اپنی اولادوں کا مستقبل تعمیر نہیں کیا۔ اپنے لیے زیورات سے مہنگے مقبرے بنانے والوں نے یہ کب سوچا ہوگا کہ ایک زمانے میں ان کی نسلیں اُداسیوں کے بوجھ تلے گردنیں جھکائے اُدھر سے اِدھر سفر کر رہی ہوں گی۔ کوئی زمین انھیں نہیں اپنائے گی، کسی خطے پہ ان کا حق مستحکم نہیں ہوگا۔ یہ سب لوگ جو ان کیمپوں میں بکھرے پڑے ہیں، وہ لوگ جو شہر کی سڑکوں پر چل رہے ہیں اور وہ تمام لوگ جو دفتر لاٹ صاحب کے گیٹ پر ہاتھوں میں عرضیاں، چہروں پہ مایوسیاں اور دلوں میں دُکھ لیے کھڑے ہیں یہ سب اُن خوش نصیبوں کی ساتویں نسل کے لوگ ہیں۔

دو سو برس سے ہندوستان کے مسلمان لُوٹے اور اجاڑے جا رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں بنگال کو گورا تاجر لوٹ رہا تھا، دلّی کو مرہٹے پامال کر رہے تھے تو پنجاب اکالی دل کے بوٹوں کے نیچے کراہ رہا تھا۔ انیسویں صدی میں جنگِ آزادی کی شکست ہندوستان کے مسلمان کی شکست تھی۔ پھر جب امن قائم ہوا تو ایک دوسری نوعیت کی لوٹ مار اور ذلت شروع ہو گئی۔ یہ زرگری کا دَور تھا جس میں مسلمان کے حصّے میں صرف محنت آتی تھی۔ بے اجر اور بے وقت محنت اور کمتر سے کمتر سماجی حیثیت۔ ہندو ڈپٹی کلکٹر بن سکتا تھا، مسلمان فقط چپڑاسی۔ ہندو ملیں اور کارخانے لگا سکتا تھا۔ مسلمان محض خوانچے اور چھابڑیاں۔ یہ سب کچھ بڑا نمایاں تھا۔ اس تضاد کو پڑھے لکھے اور امیر کبیر مسلمان محسوس کر رہے تھے، اسی لیے وہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کوشاں تھے، شاید اسی لیے مسلمان جاگیر دار ہندو ساہوکار کے مقروض کسان سے ہمدردی رکھتا تھا اور پاکستان کی تحریک میں سرگرمی سے شریک تھا کہ پاکستان میں ان سب بے انصافیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ مگر جب پاکستان بنا تو وہی جاگیردار اُسی کسان کی ہڈیاں پیسنے لگا جس سے اسے بڑی ہمدردی ہوا کرتی تھی۔ آزادی مل گئی مگر لوگ وہی پان، سگریٹ، گنڈیریاں اور چھان بورا بیچتے رہے۔ سیٹھ کا نام البتہ بدل گیا تھا، اب ملیں جمنا داس کی بجائے احمد بھائی کی ہو گئیں اور تجوری کی کنجی ہزاری مل کی بجائے آدم جی کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس اندھیرے میں بنگال کو پھر دُور کی سُوجھی پچیس سال بعد اس نے آزادی کے لیے پھر بہت کچھ داؤ پر لگا دیا، بہت سا تازہ خون دے کر لٹیروں سے نجات چاہی، مگر نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور کراچی کے سیٹھوں کی جگہ بنگالی سیٹھوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔

لوگوں کی سمجھ میں ابھی تک یہ بھی نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہُوا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جو کچھ لوگ چاہتے ہیں وہی نہیں ہوتا۔ جو بناتے ہیں بگڑ جاتا ہے۔ اس

لیے کہ ان کا آئیڈیل کوئی نہیں یا یہ زہریلی سیاست ان لوگوں کی ہے ؟ یہ تو بالکل عام لوگ ہیں۔ دھان اُگانے، ہتھوڑا چلانے، مچھلیاں پکڑنے اور بوجھ اٹھانے والے یہ تو خود ہی ایک آئیڈیل ہیں۔ آج ساری دنیا کی سیاست ان کے گرد گھومتی ہے۔ مگر ان لوگوں کی سب سے بڑی سیاست تو زندگی کو متحرک رکھنا ہے۔ روٹی پیدا کرنے اور آزادی کی زندگی گزارنے سے بڑا نصب العین اور کونسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں کے سیاست دان ان لوگوں سے زیادہ غیر ملکی امداد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کتنی جلدی یہ بات بھلا دی گئی کہ آزادی کے لیے لڑنے والے یہی لوگ تھے۔ برطانوی حکمرانوں نے چند لیڈروں کے کہنے پر تو ہندوستان نہیں چھوڑ دیا تھا نہ پاکستان مان لیا تھا۔ وہ کروڑوں کی قوت تھی جس نے آزادی دلوائی۔ آزادی جو صرف چند لوگوں کے کام آئی۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ لوگ جو آزادی کی جنگ گھروں میں بیٹھ کر لڑ رہے تھے۔ آزادی کے بعد کیمپوں میں پڑے ہوں گے۔ بار بار اجاڑے جائیں گے، دشمن ملک کی پناہ مانگیں گے اور پھر وہاں پناہ گیر ہوں گے جہاں سے نکالے گئے تھے، کیا یہ زہر ان لوگوں کی سیاست کا تھا؟ یہ قید یہ قافلے یہ کیمپ، چھ نکات اکیس نکات، نفرت، علیٰحدگی، کشت و خون کیا ان لوگوں نے یہ سب کچھ چاہا تھا؟ بیٹوں کے خون اور بیٹیوں کی عصمت سے کبھی کسی سیٹھ نے آزادی کی قیمت نہیں چکائی۔ اتنے مہنگے دام ادا کر کے بھی آزادی نصیب نہیں، مجبوری اندھیرے اور لاعلمی کا یہ عالم کہ انھیں خبر تک نہیں۔ کس نے وہ زمین بیچ ڈالی جو ان کے بچوں کو رزق دیتی تھی، وہ کونسا مداری ہے جو آورشوں کے عمل بدل دیتا ہے، کل تک مذہب ایک آورش تھی، سُکھ کی، نجات کی، آج وہ زہر بنا دی گئی۔ لوگوں نے اس زہر کو پی کر ایک دوسرے کے دل چبا ڈالے، بچے کاٹ کھائے۔ کسی وقت سیاست انسانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے والا عمل تھا۔ آج لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کا ذریعہ ہے۔ آزادی ذلتوں اور پستیوں سے نکال لے جانے والی قدر ہے مگر ہمارے لیے آزادی نے

یہ شکل اختیار کر لی ہے۔ اس ملک میں کتنے بوڑھے ہیں جو جوانی میں غیر ملکی حکمرانوں سے نفرت کرتے رہے، آزادی کے سہانے تصور باندھتے رہے، آج بڑی حسرت سے انگریزی راج کو یاد کرتے ہیں۔ کتنے جوان ہیں کہ جن کے پاس یاد کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں۔ اپنی ساری زندگی روزگار تلاش کرتے کرتے مایوس بوڑھے بن جاتے ہیں یا پھر جرائم سیکھتے ہیں پیٹ بھرنے کے لیے۔ ان لوگوں کے حصے کی ساری چیزیں دوسروں نے آپس میں بانٹ لی ہیں۔ مذہب پہ مُلا نے قبضہ کر لیا ہے سیاست راہنماؤں نے سنبھال رکھی ہے۔ دولت کچھ خاندانوں نے تجوریوں میں بند کر کے رکھ لی ہے۔ زمین کا پٹہ جانے کس کس کے نام لکھا جا رہا ہے۔ ان سب کا آپس میں دوستانہ ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور یہ سب لٹیرے اس مخلوق کے خلاف ہیں جو چپ چاپ سر جھکاتے کیمپوں میں بیٹھی ہے گلیوں بازاروں میں پھرتی رہتی ہے یا کھیتوں ملوں میں کام کرتی رہتی ہے۔ ان سب میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کے دکھ درد بانٹ کر لے جاتے۔

وقت کتنا آگے نکل گیا ہے۔ ہم کتنا پیچھے ہیں۔ یہ بچھڑ جانیکا احساس بھی کتنا خوفناک ہوتا ہے۔ انسان چاند پہ اپنی مرضی چلا رہا ہے۔ ہم یہاں زمین پہ اپنی مرضی کے مالک نہیں بن سکے خود اپنی زمین پر نہ جانے کس کس کے مطیع ہیں۔ کتنے دن پہلے لوگ آزادی کی راہ دیکھتے تھے، نو آبادیاتی نظام کے خلاف جنگ آزما تھے کہ نجات کی گھڑی کا وقت معین تھا، آج عجب گھپلا ہے۔ جانے یہ کونسا نظام ہے کہ لوگ ہرچند کہ آزاد ہیں مگر نہیں ہیں۔ کہنے کو سکہ اپنا، جھنڈا اپنا، ترانا اپنا، فوج اپنی دستور اپنا مگر مرضی اپنی ہے نہ فیصلے اپنے، سنا ہے یہ سب کچھ تو بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔ عجب کردار ہے۔ ان بڑی طاقتوں کا بھی۔ کمزور قوموں کو بدحال رکھنا، ان کے مستقبل کو غیر یقینی بنائے جانا۔ ان کے حق میں بُرے بُرے فیصلے کرنا پھر ان فیصلوں کو مسلط کرنا، جنگیں، خانہ جنگیاں، خون ریزیاں، لعنتیں شکستیں ذلتوں بھرے معاہدے، لوگوں کی انا

اور اعتماد کو توڑنے والے کام، یہ سب بڑی طاقتوں کے مفاد کی باتیں ہیں۔ ایسے مفاد وہ باہم مل کر حاصل کر لیتی ہیں یا حاصل کر کے آپس میں بانٹ لیتی ہیں۔ یہ باتیں تو سمجھ میں آنے والی ہیں۔ مگر ان بے اختیار و کمزور لوگوں کو مارنے اجاڑنے میں آخر کس کا فائدہ ہے؟ یہ بہاری بنگالی جو اجاڑے گئے۔ یہ بڑی طاقتوں کی سیاست کے تازہ ترین شکار، ان میں نہ کوئی لیڈر ہے، نہ سیٹھ، نہ سیاست داں، آخر ان کے قتل سے کس کو فائدہ ہوا۔ امریکہ کو روس کو چین کو کہ ہندوستان کو یہ پرانے وقتوں کا دستور تو یہ تھا کہ جب کوئی باہر کا زور آور کسی ملک کو مطیع کرنا چاہتا تو اندر کے طاقتور لوگوں کو مار ڈالتا، مگر اب باہر اور اندر کے طاقتور لوگ آپس میں مل جاتے ہیں، اقتدار بانٹ لیتے ہیں اور کمزور لوگوں کو مار ڈالتے ہیں یا اجاڑ کر پناہ گیر اور رفیوجی قسم کی چیزیں بنا دیتے ہیں، پھر ان لوگوں کے کیمپ لگ جاتے ہیں، جھگیاں بن جاتی ہیں۔ کبھی اپنی زمین پر کبھی غیروں کی۔ تب یہ بڑی طاقتیں اس صورتِ حال کا ازسرِ نو جائزہ لیتی ہیں اور ایک بار پھر سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ اس مخلوق کے لیے ان کی آبادکاری کا مسئلہ خالص انسانی مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسانوں سے ان لوگوں سے اور آبادکاری سے بھی زیادہ اہم یہ مسئلہ بذاتِ خود بن جاتا ہے۔ اسی کی بنیاد پہ اندر والے ایڈ کی درخواستیں بھیجتے ہیں اور اسی مدار پہ ساری عالمی سیاست گھومنے لگتی ہے۔ پھر دنیا کی لمبی ڈونگی اور گنجل دار نہ سمجھ میں آنے والی سیاست انڈے بچے دیتی ہے: امن کانفرنسیں، مذاکرات کے دور، قرار دادیں، ووٹ، ویٹو، التوا، سرد خانے، ضمنی جنگیں، نئے معاہدے۔ دنیا بہت بڑی ہے، کسی اور حصے میں ایسا ہی کوئی مسئلہ جاگتا ہے تو یہ فائل نیچے چلا جاتا ہے۔ پھر صدیوں کے حصے گذرنے لگتے ہیں۔ سیاسی یرغمالوں کی نسلیں کھو جاتی ہیں۔ سیاست بدل جاتی ہے، قیادت بدل جاتی ہے مگر یہ حالت نہیں بدلتی، بیسویں صدی تیسری دنیا کی آزادی کی صدی ہے

اس صدی میں یہ عمل کتنے وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ سارے ایشیا میں بے گھر لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ مشرقِ بعید سے لے کر مشرقِ وسطیٰ تک کیمپ پھیلتے چلے گئے ہیں۔ یہاں اِس زمین پر پچھلے پچیس برسوں میں یہ دوسرا دور ہے اور آزادی کے بعد یہ تیسری نسل ہے جو دکھ جھیل رہی ہے مگر نجات کا کوئی راستہ یوں... یوں میں ان بے ترتیب سوچوں سے جکڑا ذہن لیے کسی پاگل کی طرح ڈسپرسل کیمپ کے دروازے میں کھڑی تھی، جانے کب تک اور اِسی طرح کھڑی رہتی کہ ایک نو دس گز لمبی کار نے مجھ سے راستہ مانگا۔ کوئی بیگم صاحبہ کیمپ دیکھنے آئی تھیں۔ یہ ہوتا ہے جب کیمپ لگتے ہیں تو بیگمات ضرور آتی ہیں۔ پرانے کپڑے، کمبل، گڑ، چنے جانے کیا کیا چیزیں کاروں کی ڈگیوں میں بھر بھر لاتی ہیں۔ آفت کے ماروں کے لیے۔ مدد کرنے، فرض ادا کرنے سوشل ورک کرنے، نیکیاں کمانے، نام پیدا کرنے اور ہاں تصویریں اتروانے بھی۔ مجھے یاد ہے، ہاں مجھے یاد ہے، ۱۹۴۷ء میں جب ہم پناہ گزیں ہوکر یہاں آئے تھے تو کتنی بیگمات چلی آتی تھیں، کیمپوں میں گٹھڑیاں اُٹھائے۔ ایک بیگم صاحبہ نے ہمیں پہننے کے لیے کپڑے دیئے تھے۔ دوسری نے اماں کو وضو کرنے کے لیے لوٹا بخشا تھا اور تیسری نے ایک نئی نکور رضائی۔ چند دنوں بعد جب بوندیں آئیں تو اس رضائی کو بھیگنے سے بچانے کے لیے ہم بہن بھائی اس کے اُوپر لیٹ گئے۔ مگر جب موسلا دھار بارش برسی تو وہی رضائی اٹھا کر اپنے اُوپر تان لی۔ اب بھی شاید اسی قسم کے کام ہوں گے شاید اس لیے کہ تب سے اب تک بہت سا فرق اِدھر بھی پڑا ہے۔ اس وقت یہاں نہ اتنی شاندار بیگمات تھیں نہ ان کے پاس ایسی شاندار کاریں ہوا کرتی تھیں۔ یہ کیمپ تو خالص پاکستانی ہے نا، اسی وجہ سے بہت زیادہ شاندار بھی۔ پچھلے پچیس برسوں میں بڑی بیگمات اور بڑے صاحب پیدا کرنے اور بڑی کاریں امپورٹ کرنے اور بڑے گھر بنوانے میں اس ملک کا ریکارڈ ہے۔ اس کی وجہ معلوم

نہیں کہ اسی نسبت سے دل ظرف اور حوصلے کیوں گھٹتے چلے گئے۔

بہ حال ان لوگوں میں جن کا خدا بڑا مہربان ہے، دُکھ باٹنے والے تو پہلے بھی نہیں ہوا کرتے تھے، مگر تب انکی ضرورتوں میں لوگوں کو کچھ نہ کچھ دینا بھی شامل تھا۔ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے یا اپنے سکونِ دل کے لیے۔ مگر اب تو یہ لوگ خود ہی بہت ضرورت مند ہو گئے ہیں۔ اتنے ضرورت مند کہ کیمپ والوں سے بھی مدد مانگتے ہوئے نہیں شرماتے۔ چند مہینے پہلے جب پنجاب سیلاب میں ڈوبا ہوا ہوا تھا۔ یہ بیگمات لمبی لمبی کاریں لیے آفت زدہ لوگوں کے کیمپوں کی طرف بھاگی جا رہی تھیں۔ دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا کہ مدد کرنے جا رہی ہیں مگر بعد میں پتہ چلا کہ خود مدد حاصل کرنے گئی تھیں۔ شہر میں جو مرغی بیس روپے میں بِک رہی تھی وہاں سے انھیں دو روپے یا پانچ روپے میں مل گئی۔ اسی طرح بکرے۔ بڑی بڑی دعوتیں جو ان پر dues تھیں انھی دنوں کر ڈالیں اور گوشت سے فریج بھر کر الگ رکھ لیے۔ اچھی ہاؤس وائف کی خوبی تو یہی ہے نا کہ فصل پر سستی جنس خرید کر ذخیرہ کر لے۔ سو گوشت تو بڑی مہنگی جنس ہے۔ اس کی سستی فصل تو کبھی کبھار ہی آتی ہے۔ اچھی بیبیاں فائدہ اٹھانے سے کیسے چوکیں پھر یہ لوگ اتنے گریٹ بھی تو ہیں کہ سارا ملک لے کر بھی اور کی تکرار کرتے ہوئے شرماتے ہرگز نہیں۔

آپ کہیں گے میں بات بدل رہی ہوں، کیمپ کے دروازے پہ کھڑے ہو کر باہر کی باتیں لے بیٹھی ہوں، نہیں چلئے اندر چلتے ہیں، وہ دیکھئے ایک شاندار سی بیگم لال بھبھو کا چہرہ لیے، غصّے سے پھوں پھوں کرتی، پرس جھلاتی تیز تیز قدموں سے اپنی کار کی طرف جا رہی ہیں۔ کچھ بڑبڑا بھی رہی ہیں "دماغ خراب ہے ان کا۔ ٹکے ٹکے کے لوگ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو" ذرا اور آگے دیکھئے کتنے سارے لوگ ایک جگہ جمع ہیں۔ تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ بنگالنیں۔ بہارنیں، مرد عورتیں سب مل کر بنگالی بول

رہے ہیں - یہ ان کی خاص پہچان ہے - جب کوئی بات بچاکر کرنی ہو تو بنگالی میں بات کرتے ہیں - اس وقت ان کے چہروں پہ خفگی ہے اور دُکھ بھی کچھ زیادہ ہی دکھائی دے رہا ہے - یہ ڈھاکہ کی نسیمہ ہے - وہ راج شاہی کی فلک آرا، میمن سنگھ کی رقیہ - جیسور کی انورا ، فریدکوٹ کی آمنہ اور اس کی بہن جہاں آرا، راجشاہی کا ابوالقاسم اور سعیدالرحمٰن یہ سب لوگ میرے دوست ہیں - مجھے دیکھتے ہی چپ ہو گئے اور پھر میری طرف لپکے - اب وہ سب اردو بول رہے تھے - "تم نے دیکھا باجی ان بیگم صاحب کو، ہم سے بچے مانگنے آئی تھیں ،نوکر رکھنے کو، لو بھلا سنو تو ہم کیسی کیسی مصیبتوں سے ان بچوں کو ظالموں سے بچاکر لائے ہیں تو کیا ان کے نوکر بنانے کو! اب ہم اپنے وطن میں آلیے اب کاہے کی پھکر - ہم نے تو جتا دیا" دوسری بولی، ہمارا بڑا لڑکا کیڈٹ کالج میں پڑھے تھا، مگر ظالموں نے ..... اس نے سسکی لی ... مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری - اب ہم اس کو پڑھا لکھا کر افسر بنائیں گے،" وہ اپنے دس سال کے لڑکے کو چمٹاتے ہوئے بولی - " ہاں ، اب کاہے کی چنتا - بُرے دن بیت گئے - اللہ اِس پاکستان کو سلامت رکھے - اپنا ملک ہے تو سب کچھ ہے - اور سنو تو، دوسری بولی،"ہم سے کیا کہا - ہم کو بول رہی تھیں آیا لگ جاؤ ہمارے ہاں کوٹھری روٹی، کپڑا اور سو روپے تنخواہ - ہم نے کہا بی بی ہوش کی لو - خود ہمارے گھر میں کئی کئی نوکر چاکر تھے تم کیا جانو ہم کون ہیں ، کتنا کاروبار تھا" یہ جہاں بانو ہے اس کا لب و لہجہ بتا رہا ہے کہ ضرور ایسا ہی ہوگا - " ہمیں تو جرا سی بھی پھکر نہیں، ہمارے ہاتھ اتنا ہنر ہے بیسے کے پیسے مل گئے تو سلائی کی مشین خرید لیں گے اور بس کپڑے سیا کریں گے - کرتے پاجامے صدریاں، ہمیں سب آتا ہے - تو اور کیا عجت کی جندگی کے لیے محنت میں کیا بُرائی - دوسری نے جواب دیا - یہ رقیہ ہے جس کا شوہر ریلوے میں ملازم تھا ، مارا گیا اب وہ اس کی انشورنس کے کاغذ اور بہت سی امیدیں سینے سے لگائے بیٹھی ہے کہ

محنت سے وہ اپنے چھ بچوں کو عزت کی زندگی مہیا کر دے گی جنھیں بچا کر وہ پاکستان لے آئی ہے ،" اسے دیکھ رہی ہیں آپ" نجمہ نے اپنی چھوٹی بہن رخسانہ کی طرف اشارہ کیا ، جس کے چہرے پر حیرت بھری بنگالی آنکھیں دیکھ کر وہ ساری تشبیہیں بیکار معلوم ہوتی تھیں جو اب تک دنیا کے شاعروں اور صورت گروں نے آنکھوں کے لیے گھڑی ہیں ، اس کے رشتے کی بات کر رہی تھیں - ایک بیگم صاحبہ اپنے ڈرائیور کے لیے" اور پھر آنکھوں پہ ساری کا پلو رکھ کر رونے لگی - مگر فوراً ہی آنسو پونچھ کر بولی ہمیں اپنی آدھی جائداد کے برابر بھی مل گئی نا تو ہم ، . . . . میرے خدا یہ لوگ امیدیں لے کر آئے ہیں - ابھی تک باعزت زندگی کا سودا ان کے سروں میں سمایا ہوا ہے - یہ سب کچھ ہو گزرنے کے بعد بھی پاکستان ان لوگوں کی امیدوں کا مرکز ہے - جیسے آج سے ستائیس سال پہلے تھا - کاش ایسا ہو سکتا ، فقط یہی ہوتا - یہ ملک انھی لوگوں کے لیے ہوتا جو اس سے کبھی ناامید نہیں ہوئے - جو ہر حال میں اس کے وفادار ہیں - اِسی سے امیدیں لگاتے ہیں - یہاں انھیں برباد کر دیا جائے یا اجاڑ کر رکھ دیا جائے تو بھی یہ اسی ملک کی خیر مانگتے ہیں - مگر ہوا تو کچھ اور ہی ہے - پاکستان ان لوگوں کو ذرا سا تحفظ بھی نہ دے سکا اور ان لوگوں کے کام آیا جو اس پر بھروسہ ہی نہیں کرتے - اپنے مستقبل کے لیے دوسرے ملکوں پر اعتماد کرتے ہیں - اپنی عیش کو ملک کی بقا سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں - یہاں کے کتنے کروڑ پتی عرب پتی ہیں کہ جو چوری چوری اور اعلانیہ اپنی دولت یہاں سے نکال لے گئے ہیں کہ یہاں ان کا مستقبل محفوظ نہیں - پاکستان کی ساری دولت سارے وسائل ان لوگوں کے مستقبل محفوظ کرنے سے قاصر رہے ہیں - نہ جانے یہ مستقبل کیا چیز ہے - اس کے صحیح معنی کاش کوئی سمجھا دے ! ان بے ٹھکانوں کا مستقل تو یہیں ہے ، یہاں پر جو لوگ مزدوری تک کے حصول کے لیے بھٹکتے رہتے ہیں ان کا مستقبل بھی یہیں ہے ، وہ جنھیں سر چھُپانے کو چھت

تک میسر نہیں اور وہ سب جنھیں شام کی دو روٹیوں کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی زمین پر اپنی کل کا یقین رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے پاکستان ہوگا جب میں نہیں ہوں گی۔ میرے بچّے اسی زمین سے رزق کمائیں گے، یہیں سے خوشیاں پائیں گے اور یہیں یہ دُکھ جھیلیں گے۔ اگرچہ میرا یہاں کچا گھروندا بھی نہیں۔ مگر یہ لوگ جو زمین پر محل کھڑے کر چکے ہیں، جن کی قبریں تک سنگِ مرمر کی بنتی ہیں، ان کا مستقبل خطرے میں پڑا رہتا ہے۔ سنتے ہیں کہ اُنھوں نے روز روز کے خطرات سے تنگ آکر اپنے مستقبل غیر ملکی بنکوں میں رکھوا دیئے ہیں۔ حالانکہ بنک یہاں بھی بہت ہیں اور سب ان کے ہیں۔ اس طرح کی باتیں مَیں نے ان نوواردوں سے نہیں کہیں۔ اُمیدیں لگانے والوں کے لیے یہاں کتنی مایوسیاں ہیں؟ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ اُنھیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔

کیمپ میں جاکر ہر روز کچھ وقت گذارنا میرا معمول سا بن گیا تھا، ہر ہفتے نئی کھیپ بھارت سے آتی تو نئے لوگ آجاتے۔ نئے بھی کیا، وہی صورتیں، وہی حالتیں، وہی کہانیاں قصے۔ جگہ کی تنگی البتہ بڑھتی جارہی تھی، یہی حال راشن کی مقدار اور نوعیت کا تھا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب ہائی پاورڈ قسم کی کمیٹی جو ساری کی ساری بیگمات پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے بیٹھی۔ ہر ممبر نے انکے عدم تعاون کی شکایت کی اور کہا کہ یہ لوگ بیٹھ کر کھانا چاہتے ہیں، کچھ تو پہلے ہی ایسے تھے اُوپر سے بھارت نے انھیں قید میں رکھ کر بگاڑ دیا ہے۔ ان کا علاج یہی ہے کہ کیمپ ختم کر دیئے جائیں۔ ان کا راشن بند کر دیا جائے۔ خود ہی سیدھے ہو جائیں گے۔ ایسا کرنے کے لیے تشدّد سے پہلے عدمِ تشدّد کی پالیسی اپنائی گئی، کچھ مدد مجھ سے بھی مانگی گئی۔ سوشل ویلفیئر کی ایک افسر قسم کی چیز نے بمشکل غصّہ دبا کر فرمایا۔" دیکھیئے آپ لوگ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ ان لوگوں سے ہمدردی کرنا بند کر دیں۔ اسی وجہ سے ان کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یہ کوئی جاب تو پکڑتے نہیں۔ ہم زیادہ دن تک انھیں کھانا نہیں دیں گے اور یہ جگہ بھی انھیں

خالی کرنی پڑے گی،، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، مگر جہاں تک میں سمجھتی ہوں یہ لوگ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں، جیسے جیسے کام ملتا جائے گا۔ یہ لوگ چلے جائیں گے، مَیں نے اس کا غصّہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔" جی نہیں، کام یہ لوگ کرنا ہی نہیں چاہتے، آپ کو معلوم نہیں، یہاں جو بیگمات، آتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے دو دو تین تین آدمی اپنے گھر میں کھپانے کی آفر کی مگر یہ لوگ تو ڈھیٹ بن چکے ہیں۔ بھارت سے دو سال مفت کی کھا کر آتے ہیں نا! اب یہ آپ کا فرض ہے کہ انھیں سمجھائیں، یہ لوگ آپ کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔"
میرے جی میں تو آیا کہہ دوں، سب سے پہلے میرا فرض تو آپ کو سمجھانے کا ہے۔ آیئے آپ کو سمجھ دار بناؤں یہ جاننے کے لیے کہ یہ ملک ان کا بھی اتنا ہی ہے جتنا آپ کا اور ان بیگمات کا جو لوگوں کو نوکر رکھتی پھر رہی ہیں۔ مگر میں اپنا کوئی فرض بھی ادا نہ کر سکی۔ نہ تو سوشل ویلفیئر، افسر کی کھوپڑی کا علاج کر سکی۔ نہ ان لوگوں کو سمجھا سکی کہ وہ کیمپ چھوڑ کر بیگمات کے نوکر ہو جائیں بیکاری روٹی چھوڑ کر ان کے ٹکڑوں پر جا پڑیں۔ نہ ان بیگمات کو جو ہنگامی اجلاس بلواتی پھر رہی تھیں کہ بیبیو ٹھہرو ذرا، ہوگا وہی جو تم چاہتی ہو۔ ذرا سا دم تو لو، ابھی یہ عدمِ تحفظ کا شکار ہیں۔ بچوں کو جُدا کرتے ہوتے ڈرتے ہیں وہ یہ بچے گولیوں اور سنگینوں سے بچا کر لاتے ہیں۔ ان کے لیے اتنے ہی قیمتی ہیں جتنے تمہارے اپنے بابا لوگ جو چیفٹ کالج میں پڑھتے ہیں۔ اور پھر ابھی اُمید کے چند تار باقی ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کا مان لے کر آتے ہیں، لُوٹ لینے دو جب یہ مایوس ہوجائیں گے تو وہی کریں گے جو تم لوگ چاہتے ہو۔ تمہاری خدمت کریں گے، جھوٹا کھائیں گے اترن پہنیں گے۔ یہ باعزت زندگی کی طلبگار عورتیں تمہاری آیائیں بن جائیں گی اور یہ بچے جنھیں وہ افسر بنانا چاہتی ہیں بالآخر تمہاری کاریں دھوئیں گے، تمہارے لیے پھُول بیچیں گے۔ یہ بوڑھے سب تمہاری کوٹھیوں کی صفائی کرنے پر مامور ہوجائیں گے۔ آخر تم لوگ

اتنی جلدی میں کیوں ہو۔ ذرا صبر کرو۔ ابھی یہ لوگ سمجھتے نہیں۔ آج تو قومی خدمت اور سوشل ویلفیئر کی خاطر تم انھیں کام دے رہی ہو۔ کل یہ لوگ خود تمہارے دروازوں پہ آئیں گے۔ ہاتھ جوڑ کر کام مانگیں گے تم لوگ انھیں دھتکارو گے۔ یہ لوگ پھر بھی لوٹ کر آئیں گے۔ یہ تو تمہاری نیت اچھی ہے جو ان کے بھلے کی سوچتی ہو۔ ورنہ یہ بیکار مخلوق جیسے اُدھر سے نکال دیا گیا۔ اِدھر بھی کس کام کی اور پھر تمہیں نوکروں کی کیا کمی۔ کون سا کام ہے جو تمہارے لیے نوکر نہیں کرتے۔ کوئی تمہارے لیے اناج اُگاتا ہے کوئی اینٹیں گھڑتا ہے، کوئی اینٹیں ڈھوتا ہے، کوئی چنائی کرتا ہے، کوئی پلستر لگاتا ہے، کوئی تمہارے محلوں کو رنگ روغن سے سجاتا ہے۔ کوئی باغ بغیچے لگاتا ہے، کوئی پھول پروتا ہے، کوئی لباس تیار کرتا ہے، کوئی انھیں دھوتا ہے، کوئی استری کرتا ہے۔ کوئی تمہارے لیے کھانے تیار کرتا ہے، کوئی انھیں تمہارے آگے چنتا ہے، کوئی تمہارے جھوٹے برتن دھوتا ہے۔ کتنے لوگ تمہاری راہوں میں اس لیے کھڑے رہتے ہیں کہ وہ تمہارے لیے دروازے کھولا کریں۔ کاروں کے دروازے اور کاروں کے لیے کوٹھیوں کے گیٹ۔ اے دنیا کے قیمتی اور مہنگے انسانو! ہم نے ساری قوم تمہاری خدمت پہ لگا دی ہے! ان پناہ گزینوں کی کیا مجال جو تمہارے نوکر چاکر نہ لگیں اور پھر ان اعزازوں پر فخر نہ کریں! مگر میں یہ باتیں بھی نہ کہہ سکی کہ میں بھی تو ایک نوکر ہی ہوں۔ خوف اور عدمِ تحفّظ کا احساس مجھ پر بھی مسلط رہتا ہے۔

دو چار دن بعد شہر میں عید تھی۔ یہ بھی ہمیشہ ہوتا رہتا ہے جب شہر میں کیمپ لگے ہوں تو عید بھی خراماں چلی آتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے کیمپوں میں بھی عید آئی تھی۔ اسی طرح ظالم بے رحم! اس دن لوگ کچھ زیادہ ہی روئے تھے اپنے ان پیاروں کو یاد کر کے جو ان کے ساتھ پاکستان نہیں آئے تھے۔ شہر کے لوگ زردے کی دیگیں اور سویوں کے تھال سجا لائے تھے۔ پناہ گیروں کے لیے۔ تب اور ہی بات تھی۔ لوگوں کا لوگوں سے معاملہ

تھا۔ سرکاری طور پر کچھ نہیں ہوا۔ مگر ۷۳ ۱۹ء کے کیمپوں میں جو عید آئی اُس میں شہر کے لوگوں نے اپنا سکونِ دل برباد نہیں کیا، بلکہ اب کے عید زیادہ دھوم سے منائی گئی۔ کتنے گھروں میں صرف اس لیے جشن تھا کہ فوجی قیدی واپس آگئے تھے، کچھ لوگ جشن خاص منا رہے تھے کہ جنگ کی فضا ختم ہو کر امن کے معاہدے ہو گئے تھے۔ پھر پہلے کی طرح ایک طویل خوشحالی کا دَور شروع ہونے کے امکانات روشن تھے۔ گو کہ یہ سب جشن منانے والے مل کر بھی چند سے زیادہ نہیں تھے، لاہور شہر کی لاکھوں کی آبادی جانے کہاں تھی، کیا کر رہی تھی۔ البتہ 'بہاریوں' کے لیے حکومت نے خاصے اہتمام کیے۔ صبح سویرے ایک عوامی وزیر کے نمائندے نے اپنے دستِ خاص سے عید کارڈ اور عیدی لوگوں میں تقسیم کی وہ اس طرح کہ مرد عورتیں اور بچے سب قطاروں میں لگ گئے اور باری باری اپنا لفافہ لیکر سلام کرتے ہوئے ہٹتے چلے گئے۔ اس دوران ٹیلی ویژن کا کیمرہ برابر تصویریں لیتا رہا۔ شام کی خبروں میں یہ تصویر تفصیل سے دکھائی گئی تو میں سوچتی رہی کہ لوگ ان تصویروں کو دیکھ کر بلوہ کیوں نہیں کرتے۔ آخر فوج کے سرنڈر کی فلم میں کیوں ساری ذلتیں پنہاں ہو گئیں تھیں۔ ہاں تو وہ لفافے جن میں رکھ کر عید کارڈ اور عیدی دی گئی تھی ڈاک کے لفافے کے برابر تھے مگر اندر عید کارڈ ریلوے ٹکٹ کے سائز کا تھا جس میں ایک روپے کا اجلا سا نوٹ تہہ کر کے رکھا ہُوا تھا۔ اِس اندرونی تفصیل کی کوئی تصویر ٹیلی ویژن پر نہیں آتی، یہ تو فقط آنکھوں دیکھی ہے اور پھر اور باتوں کی طرح بعد میں یہ بھی سننے میں آیا کہ خزانے سے تو ایک ڈرانوٹ فی کس کے حساب سے نکالا گیا تھا مگر ان لوگوں تک آتے آتے چھوٹا رہ گیا۔ درمیان کے اخراجات معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ تھے۔ عوامی وزیر کے نمائندے کی شیروانی ہی اتنی بڑھیا تھی کہ بس۔ بہر کیف پلاؤ زردے کی دیگیں اس کے علاوہ تھیں جو حکومت کے سر سے پکیں۔ مَیں نے یہ سب دوسروں کی زبانی سُنا ہی تھا کہ اس روز میں کیمپ نہیں گئی تھی۔ شہر میں کیمپ لگے

ہوں اور عید بھی آئی ہو تو گھر کے اندر بھی پناہ ڈھونی پڑتی ہے سو میں نے اپنے بستر میں پناہ لے رکھی تھی۔ بے انصاف اور استحصالی معاشرے میں تہواروں کا رنگ بھی وہی ہو جاتا ہے۔ ہر سال عیدیں براتیں آتی ہیں۔ چند لوگوں کے لیے بے پناہ خوشیاں لے کر۔ بے شمار لوگوں کے لئے محرومیوں کا احساس بڑھانے اور دکھوں کی یادیں تازہ کرنے۔ جن کے پاس پیسے ہیں وہ عید کی دیوی کو بھینٹ کر کے خوشیاں حاصل کر لے جن کے پاس نہیں وہ پہلے سے بھی زیادہ دکھی ہو جاتے۔ سب لوگوں میں جب دولت مشترک نہیں خوشیاں مشترک نہیں تو تہوار کیوں مشترک ہیں ؟ غریبوں کے تہوار بھی الگ ہونے چاہئیں۔ میں ان فضول باتوں میں وقت کاٹ رہی تھی کہ نسیمہ اور نجمہ اپنے بچوں کو لے کر آگئیں۔ دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ مگر میں نے خلافِ معمول اس وقت بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ دونوں کو لے کر باورچی خانے میں گھس گئی اور خوب کھانے پکانے کا پروگرام بنا ڈالا۔ پورے تین سال بعد ان لوگوں کو چولھا جلانے پیاز بگھارنے اور ہنڈیا بھوننے کا موقع مِلا تھا۔ ایسی مگن ہوئیں کہ شام تک رونے دھونے کا خیال بھی نہیں آیا۔ عورت سے ہنڈیا چولھا چھین لینا بھی کتنا ظلم ہے۔ کیمپوں میں رہ کر یہ لوگ اس ظلم کا بھی شکار تھیں۔

شام کو قاسم اور سعید الرحمان آئے دونوں کے ہاتھوں میں مٹھائی کے لفافے تھے۔ تہوار کے دن بہن کے گھر خالی ہاتھ کیسے آتے۔ یہ دونوں لڑکے بنگالی ہیں اور لوگ کہتے ہیں بنگالی پنجابی سے نفرت کرتے ہیں، دشمن بن چکے ہیں.... ڈھیر ساری کوئی چیز میرے گلے میں اٹک گئی اور آنکھوں میں سخت کڑوا دھواں سا گھل گیا۔ کیسے کیسے الزام سہے ہیں ہم نے۔ ہماری محبتوں نفرتوں کے فیصلے بھی دوسروں کے ہاتھ میں ہیں۔

عدم تشدّد کی پالیسی فیل ہوگئی تھی۔ اب تشدّد سے کام لیا جا رہا تھا۔ وہ دن بھی آگیا جب پولیس اور بسوں کی مدد سے لوگوں کو کیمپوں سے نکال کر

باہر بھیجا گیا۔ کسی کو سیالکوٹ جانا تھا کسی کو جھنگ، کسی کو ساہیوال تو کسی کو سرگودھا۔ یہ ترکیب ان کی آبادکاری کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ لاہور کا بوجھ بانٹ کر دوسرے ضلعوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ بات خاصی معقول تھی۔ تھوڑے تھوڑے کر کے لوگ اچھی طرح کھپ جائیں گے۔ آباد ہو جائیں گے۔ شاید پنجاب کی زمین ہی ان سے وفا کرے۔ مَیں نے سوچا تھا مگر بعد میں جب کبھی کسی کا خط آیا کیمپ ہی سے آیا۔ چند ماہ بعد ان سب کو وہ بات معلوم ہو چکی تھی جو میں نے ان سے چھپائی تھی: امیدیں لگانے والوں کے لیے یہاں کتنی مایوسیاں ہیں۔ رقیہ کا خط آیا کہ اسے بیمے کی رقم ابھی تک نہیں ملی اور بڑے لڑکے کو کسی دکان پر رکھوا دیا ہے۔ نسیمہ نے دستکاری سکول میں کام شروع کر دیا تھا مگر اس کا بیٹا آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑ کر بُری عادتیں سیکھ رہا تھا لہٰذا اسے بھی کہیں کام پہ لگانا پڑا۔ نجمہ کو نہ باپ کی نہ شوہر کی جائیداد کا کوئی حصّہ نہیں مِلا۔ اُس نے رخسانہ کی شادی ایک بھلے آدمی سے کر دی جو اپنے آپ کو ڈاکخانے کا بابو بتاتا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو ڈاکیہ ہے۔ قسمت کی بات ہے نا قاسم نے اپنی ایم ایس سی کی ڈگری لگا کر ملازمت کی جتنی درخواستیں بھیجی تھیں سال بھر میں سب کے جواب آ گئے۔ یہ سب جواب نفی میں تھے۔ سعیدالرحمان پاک فوج کے لیے مکتی باہنی سے لڑتا رہا۔ پاکستان کے لیے بنگلہ دیش چھوڑ آیا۔ بس اسی بنا پر اسکی ملازمت بحال نہ ہو سکی اور فلک آرا نے اپنے چھ بچوں میں سے دو کو یتیم خانے بھیج دیا تھا، دو بڑوں کو کہیں نوکر رکھوا دیا۔ آخری دو کے ساتھ کیمپ میں پڑی تھی وغیرہ وغیرہ۔ ہاں البتہ ایک بات تھی جو ان سب نے لکھی اور شاید اسی بنا پر زندہ رہنے کا فیصلہ بھی کیا ہو گا۔ نسیمہ نے سرگودھا سے لکھا "باجی یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ ہر طرح ہماری مدد کرنے کو تیار ہیں۔ لاہور میں تو بس ایک آپ تھیں ہماری ہمدرد" جی میں تو آیا لکھ دوں میں بھی تمہاری ہمدرد کہاں تھی، کیا کر سکی میں تمہارے لیے۔ تمہارے پاس آتی تو اپنے دل

کی بے چینیاں لے کر تم سے خبریں لینے، سچ جاننے، تمہارے دلوں کی تھاہ لینے۔ آخر تم لوگ چاہتے کیا تھے جو تمہارا جرم بن گیا۔ دو سال سے برابر جھوٹ سُن سُن کر پاگل ہوئی جارہی ہوں۔ کیسا کیسا جھوٹ بولا ہمارے اخباروں نے کتنی دھول ہماری آنکھوں میں ریڈیو نے، ٹیلی ویژن نے ۔ ٹوٹتی حکومتیں اور ہارتی فوجیں جھوٹ کا سہارا تو لیا ہی کرتی ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ شکست نامے پہ دستخط کے انتظامات کرتے وقت مکمل فتح کا اعلان بھی کیا جائے۔ وہ شکست جو اتنے اہتمام سے تسلیم کی گئی۔ ساری دنیا اس کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی، مگر ہم جن کا اپنا معاملہ تھا بے خبر رکھے گئے۔ تب سے اب تک ان صحافیوں ادیبوں اور تاریخ نویسوں نے جھوٹ کا جو کاروبار پھیلا رکھا ہے، اس کی کتنی بڑی بڑی رقمیں اکٹھی کر لی ہیں۔ کتابیں رسالے اور اخبار بیچ بیچ کر۔ سقوطِ ڈھاکہ سے پردہ اُٹھاتے اُٹھاتے کتنے پردے ڈالے ہیں ان لوگوں نے سچ پر۔ فوج سے زیادہ یحییٰ خان سے زیادہ اور دائیں بائیں کے سارے لیڈروں سے بڑھ کر تو ان لکھنے والوں نے ہمیں پاگل کر رکھا ہے۔ یہ جھوٹ بیچتے ہیں مگر کتنا مہنگا۔ اپنی تاریخ تک نیلام کر ڈالی، ردّی میں دے دی ان لوگوں نے چند سکّوں کے لیے۔ کتنا سہل کاروبار ہے تاریخ نگاری کا۔ جانے کون لوگ اسے مشکل ترین بات کہتے ہیں۔ یہاں تو یار لوگوں نے بیس دن کے اخبار جمع کر کے کتاب بنالی اور نوٹوں کی گڈیوں کے ساتھ نام آوری بھی کمائی ترقی بھی پائی۔ دیوانی قوم کاغذ کے ایک ایک چیتھڑے پہ سچ تلاش کرتی پھری۔ اب جو جیتی جاگتی سچائیاں چل کر یہاں تک آتی ہیں تو انھیں کھوجنے صبح شام ان کے پاس آبیٹھتی ہوں انھیں اپنے گھر لے جاتی ہوں اس کا کچھ فائدہ تو ہُوا ہی ہے۔ ان لوگوں نے میرا بے سرو سامان سا گھر دیکھ لیا ہے اور یہ بھی جان لیا کہ وہ مکان بھی میرا نہیں سرکار کا ہے، تب انھیں یقین آیا کہ میں کوئی بیگم صاحب نہیں ہوں، غریب عورت ہوں اور اس طرح کے غریب اس حصہ ملک میں اور بھی بہت ہیں جو اچھے کپڑے پہن کر اپنی اصلیت

چھپاتے پھرتے ہیں۔ اس طرح امیروں میں شامل تو ہو نہیں سکتے۔مگر اپنا طبقہ الگ بنا لیتے ہیں۔کیونکہ یہاں غریب ہونا بہت بری بات جو سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ جو غلط فہمی یہ لوگ ساتھ لائے تھے اسے تو ان بیگمات نے اور تقویت بخش دی۔ کہ مغربی پاکستان وہ حصہ ملک ہے جہاں صرف دولت مند مغرور اور خودغرض قسم کی مخلوق آباد ہے۔ جو بات سارے بنگال کو معلوم نہ ہو سکی، وہ بات ان چند بوڑھوں اور بچوں کو تو معلوم ہو ہی گئی۔ ہاں، یہ آنے والے زیادہ تر بچے اور بوڑھے ہیں۔ ان میں جوان مرد اور عورتیں بہت کم ہیں۔ وہ لوگ قتل ہوئے ہیں یا اغوا، بنگال کے ماضی اور مستقبل کے درمیان کی کڑی ٹوٹ گئی ہے۔ باری باری قتل و غارت کے جتنے دَور چلے سب میں جوانوں کا صفایا کیا گیا۔جھگڑا ابھی سارا انھیں کا تھا۔جوان نسل جو ایک طرف بنگلہ دیش بنانے میں بہت مصروف تھی تو دوسری طرف پاکستان بچانے میں آگے آگے۔ انقلابی تنظیموں کے علاوہ مکتی باہنی الشمس اور البدر بھی جوانوں کی تنظیمیں تھیں جو ایک دوسرے کے قتل پر مامور کی گئیں۔بڈھے تو سارے گھروں میں بیٹھے رہے۔ میدان میں یہی نسل نکلی۔تقسیم بھی یہی نسل ہوئی۔پاکستان کا المیہ دراصل اسی نسل کا المیہ ہے۔ فوجی جبر کے ساتھ تصادم سے کہیں بڑھ کر تو ان کا آپس میں تصادم ہوا ہے۔ اختلافات کی خلیجیں تو انہی کے درمیان پیدا ہوئیں، حق تلفی کا احساس بھی انہی کو تھا۔ اب، خلا بھی اسی کڑی کے ٹوٹ جانے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ بہت اہم لوگ تھے۔ سچ جانتے تھے، سچ بولنے کی جرأت رکھتے، سچ کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے بڑے خطرناک بھی تھے۔اسی لیے تو ایسی ایسی مخالف طاقتوں نے ملکر اس خطرے کا قلع قمع کیا۔اصل خبریں تو انھیں لوگوں سے مل سکتی تھیں مگر انکے بچے کھچے لوگوں کے پاس تو وہی پرانی خبریں ہیں جنھیں لکھنے لکھتے دنیا کی صحافت کا قلم گھس گیا ہے اور سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ وہی

قتل دہی گھر اجاڑنے اور گولی چلانے کی باتیں۔ اغوا اور عصمت دری کے قصے، قید کی صعوبتیں اور کیمپوں کے دکھ۔ ہاں مگر ان کہانیوں میں ایک بڑا فرق ضرور ہے کچھ کہانیاں مختصر ہیں کچھ طویل مختصر اور بعض تو اتنی طویل کہ نسلوں تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ جیسے نسیمہ کی کہانی۔ پاکستان بنا تو اس کی ماں اسی عمر کی تھی جس کی آج نسیمہ ہے۔ پٹنہ میں اس کا گھر جلا دیا گیا۔ شوہر اور بڑا بیٹا قتل کر دیئے، جوان بیٹی اغوا ہوئی اور وہ خود تین بچوں کو لے کر مشرقی پاکستان کی پناہ میں چلی گئی۔ تب نسیمہ کی عمر اتنی تھی جتنی آج اس کی بیٹی شہناز کی ہے۔ ٹھیک پچیس سال بعد پاکستان ٹوٹا تو نسیمہ کا گھر جلا، شوہر اور بیٹا قتل ہوتے، جوان بیٹی اغوا کر لی گئی اور وہ اپنے تین بچوں کو لیکر مغربی پاکستان کی پناہ میں آگئی ہے۔ اب وہ پنجاب میں اسی خلوص سے آباد ہونا چاہتی ہے۔ جس خلوص سے اس کی ماں بنگال جاکر اباد ہوئی تھی۔ بہار۔ بنگال، پنجاب۔ خدا جانے یہ نام کس نے کب رکھے ہوں گے ان ناموں کے ساتھ لوگوں کو پکارنے کا رواج کب چلا ہوگا؛ ہاں البتہ ان ناموں پر لوگوں کو قتل کرنے کا دستور ابھی چلا ہے ہمارے سامنے کون جانے پچیس سال اور گذر جانے پر کس قسم کا دستور چلے گا۔ نسیمہ کی کہانی کتنی اور آگے چلے گی۔ ابھی تو اس کی بیٹی شہناز کی عمر دس سال ہے پچیس سال پہلے نسیمہ کی عمر دس سال تھی۔ اس سے بھی پچیس سال پہلے نسیمہ کی ماں نورالنسا کی عمر بھی دس سال تھی۔ یہ ساری نسلیں سزا باقی رہیں کہ بیگناہ تھیں، جلاوطن ہوتیں کہ وفادار تھیں۔ ہوں گے کوئی وقت جب غدّاروں کو جلاوطن کیا جاتا تھا، گناہ گار سنگسار ہوتے تھے۔ اب تو سب کچھ اُلٹ ہوتا ہے۔ بہرکیف ان لوگوں نے میری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ فقط یہ کہانیاں سناتی رہیں۔ ہاں البتہ ایک قاسم ہے جو اپنی کہانی نہیں سناتا۔ باتیں کرتا ہے مگر ان میں بھی گیپ چھوڑ دیتا ہے۔ کسی مصلحت کے لیے یا ہمارے تخیّل کے لیے۔ اس کے نزدیک باپ بھائی کا قتل یا بہن کا اغوا اتنا اہم نہیں جتنا یہ بتانا کہ مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی نہ جغرافیائی فاصلوں کی زیادتی سے ہوئی

نہ تاریخی فیصلوں کی غلطی پر ۔ ۔ ۔ وہ بنگلہ دیش بنانے کے لیے تھی نہ پاکستان توڑنے کے لیے ، یہ ساری باتیں تو نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہیں ۔ کچھ اور باتیں بھی سامنے آسکتی ہیں ۔ اصل بات تو انقلاب کی راہیں روکنا اور انقلابی قوتوں کو توڑنا اور تقسیم کرنا تھا ۔ سب کے لیے یہی بات اہم تھی ۔ بھارت روس امریکہ اور خود پاکستان کی حکومت یہ جانتے تھے کہ مشرقی بنگال وہ دروازہ ہے جہاں سے انقلاب کے ہراول بھارت میں داخل ہونگے اور پاکستان میں بھی سب نے مِل کر اسی دروازے کو بند کرنے کی کوشش کی ہے ۔ بنگلہ دیش نہیں بنایا بلکہ بنگال کو isolated کیا ہے ۔ خود پاکستان بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کے زعما تو کسی سطح پر بھی سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کے خواہاں نہیں تھے اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ملک کا ایک حصّہ بدل جائے دوسرا نہ بدلے ۔ تیسری صورت جو ممکن تھی بنا لی گئی ۔ اس سے انقلاب کا عمل دھیما ضرور پڑگیا ہے کہ اس کے ہراول مارے گئے ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ آدمی مستقبل سے ناامید ہو جائے ۔ بنگالی بورژوازی کو دس سال اور بل جائیں گے ۔ اس عرصے میں اُدھر بھی بائیس چوبیس سیٹھ پیدا ہو سکتے ہیں مگر کس کے روکے رُکا ہے سویرا ! بنگلہ دیش میں نیا سورج طلوع ہوگا تو کیا بھارت اور پاکستان میں کالی لمبی رات چلتی ہی رہے گی ۔ قاسم راج شاہی یونیورسٹی کا طالبِ علم ہے ۔ مخصوص بنگالی انداز سے چیزوں کا حساب کتاب رکھتا ہے ۔ اندازے لگاتا ہے ۔ اب اس نے ۱۹۸۵ء کے سال پر سرخ نشان لگا رکھا ہے ۔ مگر یہاں آکر اس کے کئی اعداد و شمار بدل بھی گئے ہیں ۔ سب سے زیادہ تو اُس کی سوچ تو پنجاب کے بارے میں بدلی ہے ۔ پنجاب بنگال سے نفرت نہیں کرتا نہ اسے غلط سمجھتا ہے نہ ہی اس کی خوشحالی کے افسانے سچے ہیں ۔ یہاں کتنے لوگوں کے گھر ہی نہیں ہیں ، حیرت کی بات ہے ، ایک بنگالی ہونے کی حیثیت سے اُس کے لیے حیرت کی اور کئی باتیں بھی ہیں ۔ مثلاً یہ کہ پنجاب نے بھی فوجی آمریت کے خلاف آواز اٹھائی تھی ، پنجاب بھی جمہوریت کی جدوجہد کرتا رہا

ہے۔ اور اب پنجاب میں ہر طرف انقلابی ابھار اٹھ رہا ہے۔ وہی پنجاب جہاں رنجیت سنگھ سے لے کر جان لارنس اور پھر ٹوانے، دولتانے و فیلڈ مارشل تک شاہی شان سے حکمرانیاں کرتے رہے۔ اسی پنجاب نے سوشل ازم کے نام پر، فقط نامی گرامی سہگلوں، مولویوں اور جاگیرداروں کے برج الٹ کر رامے، رشید اور مبشر جیسے عام لوگوں کو ووٹ دیئے۔ یہ ساری باتیں قاسم پہلے نہیں جانتا تھا۔ مشرقی پاکستان کا کوئی آدمی نہیں جانتا تھا۔ اب اس کی یہ آرزو ہے کہ کسی طرح بن پڑے تو سارے مشرقی پاکستان کو یہاں اُٹھا لاتے یا پھر مغربی پاکستان کو سالم وہاں لے جائے تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہاں کی غلیظ بستیاں، دکھی لوگ اور مفلس گاؤں پھر چاہے بنگلہ دیش ہی رہے مگر وہ غلط فہمی تو دور ہو جائے جس کی بنا پر لوگوں سے نفرت کروائی گئی اور انھیں پتہ بھی چل جائے کہ لوگ کن معنوں میں ایک جیسے تھے اور آپس میں مل کر کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اب اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ دونوں طرف کے لوگ پہلے ہی پچھتاوے کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا۔

چند مہینوں بعد گھوم پھر کر قاسم نے مغربی پاکستان دیکھ لیا۔ سندھ سرحد اور بلوچستان کے دور دراز علاقوں سے پھر آیا تو کہنے لگا "اِدھر تو بڑا بڑا فیوڈل ایریا ہے۔ مگر لوگوں میں پھر بھی بڑی جرأت ہے۔ عوام کے پاس لیڈرشپ تو بالکل نہیں ہے۔ یہ کام بھی فیوڈل لارڈ کو کرنا پڑتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ہر صوبے میں ایک جیسے ہیں۔ ایک دم بوگس اور ٹوڈی اور ٹیچر تو سب سے زیادہ رِی ایکشنری ہے۔ طالب علم کے پاس بھی لیڈرشپ نہیں ہے۔ سب لوگ نوکری کرتے ہیں۔ بال بچہ پالنے کے لیے۔ چھوڑو۔ ان لوگوں کو تم یہ بتاؤ کہ اس حصے میں انقلاب کے لیے حالات کیسے ہیں؟ بہت روشن۔ کم از کم بلوچستان میں تو ایسا ہی ہے۔ بلوچستان میں؟ ہاں، وہاں کا تو ایک ایک پتھر جاگ رہا ہے۔ مغربی پاکستان میں انقلاب کی لہر بلوچستان کی طرف سے آئے گی۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ بلوچستان

کی سرحدوں پر وہ سلطنتیں ہیں کہ جہاں ابھی تک جشنِ تاجپوشی و بادشاہت کی جوبلیاں منائی جاتی ہیں" اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بلوچستان کا انقلاب وہیں سے اُٹھے گا اور اٹھنا بھی چاہیے کہ وہاں ہر جھونپڑی کے نیچے کی زمین سردار کی ہوتی ہے۔ صدیوں کی محرومی اور لوگوں کے پاس چھن جانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہی لڑائیاں جو وہ سرداروں کے لیے لڑتے اور خون بہاتے تھے، اپنے لیے لڑ کر بہائیں گے تو انقلاب آئے گا ہی۔ اچھا تو پھر یہاں تم کس تاریخ پہ سُرخ نشان لگاتے ہو۔ سُرخ نشان تو یہاں کئی لگیں گے اور کئی کٹیں گے۔ ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ یہاں مشرقی پاکستان والے حالات کب اور کس طرح پیدا کیے جاتے ہیں۔ ہاں قاسم یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہاں بھی صوبائی اور لسانی نفرتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ مگر قاسم کے خیال میں ان نفرتوں کی کوئی جڑ عوام تک نہیں جاتی۔ یہاں جو کچھ بھی کیا جاتے گا۔ مصنوعی بنیادوں پر ہو گا۔ انقلاب دشمن قوتیں کیا کچھ نہیں کر لیا کرتیں۔ مصنوعی حالات، مصنوعی غدار، مصنوعی بغاوتیں اور مصنوعی انقلاب تک لے آتی ہیں بے پناہ قتل و غارت کے بعد بھی لوگ صرف وہاں تک پہنچ سکتے ہیں، جہاں بنگلہ دیش کے لوگ پہنچے ہیں۔

قاسم بنگلہ دیش واپس جانا چاہتا ہے۔ ایک بار پھر اپنی لڑائی لڑنے اُس کے وطن کو ابھی آزاد ہونا ہے۔ میرے وطن کو بھی آزاد ہونا ہے، فریب خوردہ لوگوں کے قافلے بنگال سے بلوچستان تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اِن شب گزیدہ راہوں پہ جانے کتنا سفر باقی ہے۔ جانے کتنی رات باقی ہے۔ کب یہ افسردہ لوگ اپنی منزل کو پہنچیں گے، اپنے گھروں میں آباد ہوں گے اپنی زمینوں کے مالک بنیں گے، اور اپنی دنیا آپ بنائیں گے!

الیکشن، جمہوریت، مارشل لا

ایک زمانہ تھا ہم سب، یعنی میری نسل کے لوگ بہت بھولے بھالے ہوا کرتے تھے درمیانی عمر کے اور درمیانی پیڑھی کے بچے، ہی تو تھے۔ فقط سُنا کرتے۔ بولتے پوچھتے کچھ نہیں تھے دوسروں کی کہی باتیں۔ کتابوں میں لکھے قول بڑے رعب ڈالنے والے لگتے۔ اور باتوں کے ساتھ یہ بھی سُنا ہی تھا یا کتابوں میں پڑھا تھا کہ الیکشن کے معنی چناؤ ہوتا ہے۔ اور جمہوریت کا لفظ ڈیموکریسی کا اُردو ترجمہ ہے۔ اور یہ بھی کہ جمہوریت اور الیکشن میں کوئی تگڑا بنیادی رشتہ ہوتا ہے۔ اس رشتے کی اصل بنیاد کا تو پتہ نہیں (یہ بھی تب کی بات ہے۔ جب ہم بھولے تھے) بس کچھ مرغی انڈے جیسی بات ہے۔ رہی بات، تقدم تاخر کی تو خدا بہتر جانتا ہے کہ تخلیق میں اوّلیت کس کی رہی۔ کون پہلے وجود میں آیا؟ مرغی انڈے سے نمودار ہوئی یا مرغی نے انڈے کو جنم دیا۔ امکانات کا جہان بہت وسیع ہوتا ہے۔ اور ابھی تو خود انسان کے بارے میں امکانات کے بے شمار دروازوں میں سے ایک دو بھی ٹھیک سے کھُل نہیں سکے۔ ڈاردن کے بعد کوئی تحقیق آگے جاتی ہی نہیں۔ شاید ڈرتی ہے کہ آدمی کی اصلیت کے علاوہ اور پتہ نہیں کون کون سی اصلیت کھُل جائے۔ کون کون سے بت ٹوٹیں۔ کیا خبر ماضی کا سارا علم ہی رد ہو جائے۔ عقیدوں کی تردید تو ہو ہی چکی ہے۔ آج اس بحث کو یا کسی اور بحث کو چھیڑ دیئے تو ہفتوں چلا لیجئے۔ ہمارے پاس دلائل کی کمی نہیں پڑے گی۔ مگر بات تو اُس دور کی ہے جب ایسے معاملات میں بلکہ ہر طرح

کے معاملات میں ہمارا علم بہت کم تجربہ معدوم اور مشاہدہ محض صفر کے برابر تھا۔

بس اسی صفر ے کو سرمایہ حیات بنائے ہوئے ہم سنِ طفولیت سے نکلے اور اُن حدود میں داخل ہوئے جہاں ایک نسل قومی اور غیر قومی ہر قسم کی ذمہ داریوں کے لیے اپنی دستار بندی کراتی ہے۔ یوں کہنے کو آزادی کی گود میں پل کر جوان ہوئے۔ مگر ہمارے سامنے نہ کبھی الیکشن ہوئے نہ جمہوریت کی ہیلم پری نے اپنے چہرے سے نقاب اُٹھائی۔ عجب سانحہ ہے کہ سارا عالم جوانی بیت گیا اور ہم جو سیاست کو اُوڑھنا بچھونا بنانے والی نسل کی اولاد تھے، محض کتاب کی خشک ٹہنی پہ لٹکتے رہے۔ نہ کبھی تجربے کی دھرتی پہ پاؤں ٹکانے کی توفیق ہوئی، نہ عمل کی فضا میں پرواز کرنے کے لیے ہمارے شہ پر کبھی کھُل سکے۔ اپنے بزرگوں کے قصے پڑھتے یا دنیا کے نوجوانوں کے حالات سُنتے تو دل میں اِک ہوک اُٹھتی۔ کبھی کبھار کوئی ولولہ بھی آنکھ کھول کر دبی زبان میں کہتا۔ کیوں نہ ہم بھی تعمیرِ وطن کے فرض کو نبھائیں۔ قوم کی خدمت کریں۔ اور ملک کی بگڑی بنائیں۔

اگرچہ یہ ولولے بڑی حد تک اُس خود غرضی کی تکمیل بھی چاہتے تھے جو ہمارے ماحول کی تربیت اور خالص نصابی تعلیم نے ہمارے اندر پیدا کر دی تھی یعنی شہرت کے چاند، سورج سینوں پر سجائیں کہ جب سامنے آئیں تو قوم ہم پر فخر کرے اور ملک ہم پہ نازاں ہو اور دنیا کے لوگ ہماری کہانیاں اپنے بچوں کو سنایا کریں۔ مگر، نہیں، کچھ واردات بھی تھی اور بطور دیگر بھی تھا اور ہوتی کیوں نہ۔ آس پاس کی دنیا میں تو یہ عالم تھا کہ ایک نسل لانگ مارچ کر چکی تھی۔ دوسری نے اِنقلاب بپا کر لیا تھا۔ اور تیسری ثقافتی انقلاب کے عمل میں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا عزم لیے میدان میں آچکی تھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے کتابیں چاٹ کر اور ڈگریاں حاصل کر کے تو حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اَن تھک جدوجہد تھی مسلسل کاوش اور جنگ تھی جس کی راہنمائی وہاں کے شعور والے لوگ خود ہی کر رہے تھے یہ باتیں کسی نہ کسی طور پر ہمارے کانوں میں بھی پڑ رہی تھیں۔ اگرچہ ہمارے تعلیم یافتہ گھرانوں

میں اُس وقت بھی بیڈ ٹی کے ساتھ پاکستان ٹائمز ہی پڑھا جاتا تھا۔ اور پاکستان ٹائمز میں اس وقت بھی وزیروں کے دورے اور ڈنر پارٹیوں کے حال احوال کے علاوہ موسم کا حال، گھُڑ دوڑ کی باتیں۔ نئی فلموں پر تبصرے اور اشتہاروں کے ساتھ اندر عورتوں کے صفحے پر پھول سجانے کی ترتیب پڈنگ بنانے کی ترکیب اور میک آپ کے ٹپس ہی چھپا کرتے تھے۔

مگر ہم چونکہ غیر تعلیم یافتہ گھرانوں کی پیداوار تھے، ذرا مختلف باتیں جاننے کا حوصلہ رکھتے بھی تھے۔ اور ہمارے ہاں سوٹ بوٹ، ڈنر لڑنے کا ایٹ ہوم کلچر بھی نہیں تھا جو ہمہ وقت مصروف اور مگن رکھتا۔ ویسے ہمارے اندر بھی متوسط طبقے کی اولادوں والی بیماریوں کے جراثیم کا فروغ ہو چکا تھا مرعوب ہونیکی بیماری تو پھیل چکی تھی۔ وقت کو پڑھنے کی بجائے کتابوں کی پڑھائی پر بھروسہ تھا۔ اپنے آپ سے زیادہ گزری نسلوں سے دلچسپی تھی۔ اور آئندہ نسلوں کی فکریں تو صرف اس لیے تھیں کہ وہ ہمیں اپنی یادوں میں بسا کر زندہ جاوید کر دیں گی۔ ایک طرف ماضی کے نقشِ قدم ڈھونڈ رہے تھے۔ تو دوسری طرف خود اپنا نقشِ قدم آنے والوں کو ورثے میں سونپنا چاہتے تھے۔ پھر اس خوف میں لرزاں بھی رہتے کہ ہمارے بعد آنے والے کس طرح کے نئے قدم اٹھائیں گے۔ ویسے یہ خوف اس لقین کا نہیں تھا کہ سچ مچ نئے لوگ کوئی نئی بات کریں گے بلکہ خوف تو اس بے یقینی کا تھا کہ جب ہم نہ ہوں گے تو کیا کچھ ہوگا۔؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ اور اگلے لوگ جامد و ساکت زندگی کے رہگزاروں پر ہمارا نقشِ پا دیکھنے کے لیے چراغ اُٹھائے پھریں گے۔ انچارج نسل ہماری ان باتوں سے خوش تو کیا ہوتی۔ اُلٹا ناراض تھی۔

پھر انچارج نسل کا دانشور، مہتمم کہیں زیادہ چالاک کمینہ اور خود غرض تھا۔ اس کی نگاہ میں یہ نڈھال سی سوچیں بھی خطرناک تھیں۔ اور اس کی منطق میں صرف قبضہ سچا اور جھگڑا قطعی جھوٹا تھا۔ لہٰذا ہمارا ہر کلیم رد کیا گیا۔ ملک قوم عوام، کام ذمہ داری اور سیاست

ہمیں ہر چیز لاتعلق اور الگ رہنے کی تلقین ہوئی۔ پھر حکم ہوا اور آخر میں تعزیر اور زنجیر دکھائی گئی۔ کسی طرف سے بھی آگے بڑھنے کا راستہ ہمیں نہیں ملا۔ بلکہ الٹا کئی الزام ہمارے سر تھوپ دیئے گئے یعنی کہ نئی نسل کے لوگ پیدائشی طور پر نااہل غیر ذمے دار اور روایتوں سے بغاوت کرنے والے ہیں۔ ادھر سینئر لوگوں نے کرسی پیڑھی مسند اور تخت جو ملا اپنے نام پکا کروالیا۔ اور چپک کر بیٹھ رہے۔ قوم اور ملک کے لیے وہ خود سب کچھ ہو گئے۔ عوام کے لیے سبھی دستور و آئین وہی غلاموں والے رہنے دیئے۔ البتہ توسیع ملازمت کے قوانین نئے بنائے۔ ریٹائرمنٹ کی عمر آگے کرلی خود ہی اپنے آپ کو (EXTENSION) دے ڈالی۔ کچھ نہ کچھ تو اوپر والے سے بھی ساز باز کر رکھی تھی شاید کہ اس حساب سے انہیں اُدھر سے بھی ایکسٹینشن ملتی رہی۔ اقتدار پسند بوڑھے وقت کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دینا چاہتے تھے۔ مگر وقت کے پاؤں میں زنجیریں ڈالنے کا اختیار کس کو ملا ہے۔ رفتار دھیمی رکھے یا تیز کرے وقت چلتا ضرور ہے سو اس وقت بھی یہی ہوا۔ اُدھر وہ تاحیات مختارِ کُل بنے بیٹھے تھے ادھر ہم عمر عزیز کے رائیگاں جانے پر دستِ ملال مل رہے تھے۔ کہ ہم سے بعد میں پیدا ہونے والے بچوں کی نسل قد نکال کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اور آنکھوں سے غصے کے شعلے اور نتھنوں سے نفرت کی پھنکاریں پھینکتے ہوئے ہم سے رستہ طلب کرنے لگی آگے نکلنے کا رستہ۔ چہ خوب! جیسے یہ رستہ ہمیں نے تو روک رکھا تھا۔ ہم بیچارے جو کہیں سے چلے نہ کہیں پہنچے۔ بس بیٹھے انتظار سحر ہی دیکھا گئے۔ مگر پھر بھی ہم راستے کا روڑہ تھے بلکہ کوڑا جیسے بالآخر وقت کی آندھی نے اُڑا کر کونوں کھدروں میں ڈال دیا۔ آج ہم اس حقیقتِ حال سے خواہ کتنی آنکھیں چرائیں یا اپنی انا کو سنبھالا دیں۔ مگر نتیجے تو وہی رہیں گے جو ہماری سہل انگاری سے پیدا ہونے چاہئیں۔ اپنا دامن جھاڑ کر دیکھ لیں وہاں کارگزاریوں کی شہرت کا مہر تاباں تو کیا کسی کوشش ناکام کا گہنایا ہوا چاند تک نہیں ضرورتیں پوری کرنے کے لیے قرض ادھار۔ اور فخر کرنے کے لیے صدیاں اُلانگھ کر اُن لوگوں کے نام گن لیتے ہیں۔ جن سے ہمارا کوئی رشتہ منطقی یا تاریخی لحاظ سے نہیں

نہیں، مگر جذباتی افتاد سے بچنے کا محفوظ طریقہ اور ہو بھی کیا۔

بہرحال یہ نئی نسلیں جو آج غصے میں پھنکارتی ہیں اور چوتھے دن سڑکوں پہ نکل کر مظاہرے کرنے لگتی ہیں۔ وہ ہمارے المیے کو سمجھنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ انہیں حالات کا اندازہ کہاں جن میں پل کر ہم جوان ہوئے تھے۔ ہمارے وقتوں میں تو درسگاہوں کے اندر ہونے والے روایتی مباحث کے عنوان بھی بڑے سوچ سمجھ کر رکھے جاتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھار پُرانی سیاست گری پر بات کرنیکی اجازت تھی۔ مگر نئے اور بدلے حالات سے لاعلمی کو ہی سعادت مندی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بحث طلب مسائل تو بس اس طرح کے ہوتے تھے۔ اچھی ڈرنک کونسی مانی جائے نیا کوکا کولا یا پرانی لسی۔ صحت کے لیے گرمی کا موسم بہتر ہے یا سردی کا۔ گندم کا صحیح استعمال چپاتی میں ہوتا ہے یا کیک میں۔ عورت ذات ابھی تک معقول عام قسم کا موضوع بحث تھی۔ اس بات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی، کہ اسے انسان کی نوع میں شمار ہونا چاہیئے۔ (فقط اس لیے کہ آدمی کے بچے پیدا کرتی ہے) ہنوز یہ مسئلہ حل طلب تھا کہ وہ صنف نازک ہے یا صنفِ ناقص قومی زندگی میں اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ چراغ خانہ ہو یا شمع محفل ہو جائے (حالانکہ دونوں جلتے ہیں) ادبیات کی بات آتی ہے تو شیکسپئر کے کئی قول دھواں دھار بنا دیئے جاتے ویسے یہ سب کچھ مسلط کیا گیا تھا۔ ہم بذات خود ایسے گھٹیا بھی نہ تھے۔ کچھ لوگ زندگی کے بہتر مصرف کے لیے سنجیدہ بھی تھے۔ اور سمجھدار بھی۔ کہ وقت کی کتاب کو پڑھ لیں۔ نوشتہ دیوار کو سمجھ لیں۔

وقت ابھی وہاں تک ہی تھا کہ لاہور میں بھگت سنگھ کی کال کوٹھڑی کے ملبے پر شادمان کی تعمیر شروع ہوئی ادھر کراچی میں حسن ناصر کے قدم بے رنگ ریت کے ساحلوں پر اپنے نقش بنا رہے تھے۔ نوجوانوں کی ایک کھیپ ایسی بھی تھی۔ جس کے ذہن میں سیاست کا تصور بدل گیا تھا۔ ادب میں آزادی کی قدروں کا چرچا ہونے لگا تھا۔ آگ کا دریا

لکھا جا چکا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ زندگی کے میدان میں نئی تمناؤں نے ابھی پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ زنجیر بڑے زور سے لہرائی بلکہ چھنچھنائی۔ مگر اس سے پہلے کہ دیوانے کا پاؤں درمیان میں آتا۔ ہمارے سینئر بھولوں کے ہار لیکر آگے بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے لوہے کی بندوق گلاب گیندے کی لڑیوں میں لپیٹ کر ایوانِ حکومت کی شہ نشین پہ سجا دی گئی۔ انہوں نے مارشل لاء کا سواگت کر لیا تھا۔ اب کیا تھا۔ پاک فوج کے بوٹوں میں سونے کے کیل لگ گئے۔ سبھی پالیسیاں فوجی ہو گئیں۔ اب تعلیمی پالیسی یہ تھی کہ جمہوریت کے خلاف اور جمہوریت کی خرابیوں پر لیکچر ہونے لگے۔ اخبارات پہ سنسر تھا۔ اب ان کے اڈیٹوریل فوجی حکومت کے نظم و نسق کو روشنی کے ہالوں میں سجا کر پیش کرنے لگے بات بن گئی۔ دھیرے دھیرے بندوق وردی کی جگہ اچکن و عصا نے لی۔ پیریڈ کرنے والے اب فکروفن سے ربط بڑھانے لگے۔ ادیبوں نے تعاون کیا۔ دانشوروں نے ساتھ دیا مغربی پاکستان میں سبھی ڈرتے تھے۔ سبھی پیچھے تھے، نوکر شاہی (بیوروکریسی) مارشل حاکمیت کا سہارا بنی۔ جو اُن سے نہ ہوا وہ انہوں نے کر کے دکھایا۔ چار چاند لگے۔ گوہر دمکے شہاب چمکے، رائٹرز گلڈ قائم ہو گئے ترقی پسند ادیبوں کو آدم جی داؤد جی ایوارڈ ملنے لگے یہی وقت تھا جب سیاست رد کی گئی۔ سیول فوجی بیوروکریسی کا عشق چلا۔ گردنیں تراشنے کا کام بڑی ادا کے ساتھ ہونے لگا۔ مگر یہی دور تھا جب حبیب جالبؔ کی زبان میں روانی آئی۔ جب ڈھاکہ شہر میں تند و تیز سیاست کے بیج پھوٹے۔ تشدد کی آیا انقلاب کا بچہ پیدا کر سکتی ہے۔ مگر یہاں مسلمانوں میں تشدد کو تاریخ کا ورثہ مان کر قبول کیا جاتا ہے بنگالی نے تاریخ سے کچھ سبق سیکھے ہوئے تھے، تشدد کو قبول نہیں کیا۔ وہاں دھیرے دھیرے چُپ کا احتجاج اور علیحدگی کے منصوبے پلتے رہے۔

ادھر امریکی امداد کا ریلا آیا مگر ساتھ ہی امریکی دانش برائے تیسری دنیا کے دفتر بھی چلے آئے۔ اس دانش کی رُو سے ملک کو پس ماندہ اور عوام کو بے مقام رکھ کر ترقیاتی

منصوبے تشکیل ہوئے۔ ویسے بھی زنجیر کا ایک ایک حلقہ ترقی کی کڑی تھا کہ یہ زنجیر نئے سامراج کی تھی۔ کہ جس کی تفصیلیں معاشرتی علوم کی کتابوں میں لکھی جا رہی تھیں۔ دانشور سرکاری نوکر ہو گئے اور سرکاری نوکر دانشور بن گئے اور شرطِ وفا کی بجا آوری کے لیے برکاتِ حکومتِ انگلشیہ کے وزن پر نئے دور کی برکات الاپنے لگے۔ طبع آزمائی اور خامہ فرسائی بھی طرح کے ذریعے کام میں لائے گئے۔ پرانے سیاست دان کچھ ملک سے باہر جا کر کچھ اندر ہی اپنے محلات میں آرام کرنے لگے۔ اُن کے پاس مربعے پہلے ہی بہت تھے۔ فیکٹریاں بھی لگوائیں سیاست حکمرانی اقتدار بھی کچھ جرنیل شاہی کا رائٹ لفٹ اور مرکز ہر جگہ فیلڈ مارشل جرنیل بہادر بادشاہ سلامت ہوئے عمل داری ہی عمل داری۔ شاہی لشکر الاماں میگھنا سے راوی تک۔ اٹک سے مہران تک چھاؤنیاں ہی چھاؤنیاں، آبادیوں میں سپاہ کے ڈیرے، شہر میں فوج کی عدالتیں۔ ملک مفتوح ہوا، شہرِ دل تاراج ہوا، انصاف کی قبا تار تار۔ توپ کی گردن میں ترازو کی ڈور بندھ گئی۔ کور کمانڈر آئین ساز بن گیا ونگ کمانڈر والئ شہر ٹھہرا اور معمولی میجر مُنصف کی مسند کا مالک ٹھہرا۔ لفٹ رائٹ مارچ! ترقی کی گاڑی توپ خانے کے سنگ سنگ چلی۔ غیر ملکی قرضے قوم گردی، پنج سالہ منصوبے، فیملی پلاننگ، ولایتی ماہر۔ صابن کی صنعت، بائیس خاندان گماشتے، سیٹھ، تاجر، دلال، سی ایس پی ادیب۔ ٹھیکیدار شاعر، زرخرید صحافت نیا نکور دارالخلافہ، کاروں کے نئے ماڈل، روٹ پرمٹ، کالونیاں، سوسائٹیاں، سٹیلائٹ، گلبرگ شاہ جمال وشادمان! شاد باد!! شاد باد!!

تدریسی نصاب تبدیل ہونے تو قوم کے بچوں کے لیے تاریخ و جغرافیے کی تعلیم ممنوع ہوئی اس کی بجائے سوشل سٹڈیز کا نسخہ تجویز ہوا۔ اس لیے نہیں کہ امریکہ میں اسی طرح ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ امریکہ اسی طرح چاہتا ہے۔ امریکہ تاریخی عمل پر یقین نہیں رکھتا۔ لہٰذا حاشیہ برداروں کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنی تاریخ کو DISOWN کریں۔ اور اپنے ہی

لوگوں کو چیزوں کے غلط معنی سکھائیں۔ پولٹیکل سائنس کی کتابوں سے جمہوریت کا مضمون ابھی نکالا نہیں گیا تھا اور جمہوریت کے معنی لکھے تھے۔

Democracy is a Government for the People

of the People by the people.

لیکن استاد ایک متبادل لیکچر تیار رکھتے اور طالب علم کو یہ سمجھا کر ہی گھر بھیجتے کہ ہماری قوم جمہوریت کے قابل ہرگز نہیں۔ جمہوریت چاہے اچھی چیز ہو مگر ہمارے لیے زہر ہے اس سے ایک تو ترقی رک جاتی ہے، دوسرے تخریب کاری کرنے والوں کی تعداد اور حوصلہ دونوں بڑھ جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم ابھی جاہل اور بیک ورڈ ہے۔ اس لیے جمہوریت کی نرمی اسے ہرگز راس نہیں آسکتی۔ بس اشتہار دیکھ کر وہی وحشی ہونے لگتی ہے نتیجہ یہ کہ یہاں ابھی جمہوریت کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ یہ سازگاری اُس وقت تک نہیں ہوگی جب تک یہاں کے عوام انگریزوں کی طرح تربیت یافتہ یا امریکیوں کی طرح تعلیم یافتہ نہیں ہوجاتے۔ سو یہ کام ایک دن میں ہوتا نہیں۔ انگریز کی جمہوریت چار سو سال پرانی ہے۔ امریکہ کی دو سو سال اور بھارتی ویسے ہی سو برس کی لیڈ رکھتے ہیں۔

سرکاری اُستادوں کی یہ باتیں سن کر طلباء ایک دم قائل بھی نہیں ہوجاتے تھے۔ کچھ لوگ حیران ہوتے کچھ پریشان تک ہوجاتے۔ اگر جمہوریت کے لیے انگریزی قسم کی تعلیم و تربیت لازم ہے اور وہ بھی لمبی چوڑی۔ تو پھر انگریز کو جانے ہی کیوں دیا۔ مزید ۔۔ ا سو سال کے لیے روک لیا ہوتا۔ تربیت کا وقت پورا ہوجاتا۔ پھر اپنی قوم یعنی پنجابی سندھی، پٹھان۔ بلوچ بے شک اکھڑ گنوار اور ان پڑھ ہے۔ مگر تخریب کار اور وحشی کیسے ہوگئی۔ لوگوں کی اکثریت کا نام اگر قوم ہوتا ہے تو یہ اکثریت تو چُپ چاپ دن رات مشقت ہی کیا کرتی ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ اشارے مشرقی پاکستان والوں کے لیے ہوا کرتے تھے۔ جمہوریت کا مطالعہ اکثر وہیں سے اُٹھتا اور

وہ لوگ گھر کے اندھیرے سے تنگ آئے ہوئے کبھی کبھی شاہراہوں کی بتیوں سے چڑجاتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی ہمت والا سوال کرتا یا ان باتوں کو رجعت پسندی کی جھلک قرار دیتا تو اُستاد محترم فوراً رجسٹر کھول کر اس کے نام کے نیچے سرخ لکیر کھینچ دیتے۔

ایسے ہی امن اور عافیت کے دور میں کسی نے چھپر میں کنکری پھینکی۔ ایک ذرا سی بات سُنی کہ فوجی دیوِ استبداد نے بالآخر جمہوری قبا پہن لینے کا اہتمام شروع کر دیا ہے۔ اب مُلک میں بنیادی جمہوریتیں لائی جا رہی تھیں۔ آخر کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ خربوزوں کے موسم میں قطعی محروم کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔ غریب کے بچے بھی شام سمے چھتا اس کا مال یا کانے مینے کچرے کھا ہی مرتے ہیں۔ سو غریب کے بچوں کے لیے فیلڈ مارشل کچھ کرنے والے تھے۔ کچھ تو زمانے کا تقاضا بھی تھا۔ بڑا ہمسایہ ملک جمہوریت میں خود کفیل تھا۔ وہاں سے گرد و غبار بھی ادھر تو آتا تو اس میں جمہوریت کی بُو باس رچی ہوئی ہوتی خربوزے کی یہ خاصیت تو ہے ناکہ گلا سڑا بھی ہو تو مہک دیتا ہے۔ ویسے تو اُن دنوں ہم نے بھی سیدھے سادے۔ ہمارے لیے جمہوریت کا نام ہی بڑا تازہ تھا۔ باسی یا تازے مال کی پہچان، ہمیں کہاں ہو سکتی تھی بھلا۔ بس ایک حسرت تھی۔ اس دیس کے باسیوں پر رشک بھی آتا تھا جو انگریزی تعلیم و تربیت میں سَو برس کی لیڈ لیکر آج جمہوریت کی بھاری فصل کاشت کر رہے تھے۔ ویسے اُن دنوں ہمارے ہاں گندم قدرے سستی تھی اور اس جمہوری ملک کو سمگل ہوا کرتی تھی میکسی پاک کی پہلی پہلی فصل تھی نا۔ چونکہ یہاں کا سمگلر اُن دنوں ابھی سیاست میں ملوث نہیں ہوا تھا لہذا گندم کے بدلے الائچی سپاری پان اور ساڑھیاں سمگل کرلاتا۔ گندم اور جمہوریت کا تبادلہ کرنے کی اُس نے کبھی سوچی نہیں۔ یا شاید یہ بات اُس کی پیشہ ورانہ دیانت داری کے منافی تھی

کیونکہ حکمرانوں نے جو خود جمہوریت کی تردید پر زندہ تھے۔ اسے سمگلنگ کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اُدھر یہ خبر بھی سننے میں آجاتی کہ بھارت والے پاکستان والوں پر گاہے گاہے رشک کرتے رہتے تھے، بلکہ باحسرت ویاس یہ کہتے سُنے گئے کہ وہ ملک اچھا ہے۔ جہاں لیڈروں کے بھاشن کی بجائے جنتا کو پیٹ بھر راشن مل جاتا ہے۔ بھلے مارشل لا لگا ہے۔ یہاں جمہوریت کو لیکر کیا جائیں۔ کہ پیٹ کی ضرورت تو تھالی بھر بات کی ہے۔ بات تو سچی ہے کہ چنگیر بھر گرم گرم روٹیوں میں جو خوشبو ہوتی ہے اس کے سامنے خربوزے تو کیا دنیا بھر کے پھل فروٹ اور میوے بیکار ہیں۔ شاید اسی لیے بھارت کے غریب غربا جمہوریت کی فالیز پر بیٹھے ہوئے گنک کی روٹی کھاتے والوں پر رشک کر رہے تھے۔

مگر گھپلا یہاں بھی بہت کافی ہے۔ سُنی سنائی باتوں میں گھپلے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ بات ایک اور بھی تھی۔ یعنی اُس سمے جیسے ہم آج سستا سماں کہتے ہیں بہت بھاری تعداد اُن لوگوں کی پاکستان کے دونوں حصوں میں آباد تھی۔ جو چنگیر بھری روٹیوں اور اُجلے بھات کی ٹیپی تک بھری ہوئی تھالی کا فقط سپنا ہی دیکھ سکتے تھے۔ گندم چاول بے شک سستی جنس تھی مگر ان کے لیے جن کی قوتِ خرید باقی رہی۔ ورنہ تو اُونٹ دو پیسے میں بھی مہنگا تھا۔ اور وہ جن کے پیٹ میں روٹی نہ ہو پیٹ میں پیسے نہ بچیں اُن کے لیے جمہوریت کی خوشبو اور مارشل لاء کے تعفن میں کیا فرق۔ سو اُدھر کی جمہوریت اور ادھر کی خوشحالی بھاری اکثریت کے لیے تو جھوٹ تھا۔ مگر ایک محدود طبقے کی خوش فہمی اور خوش فکری سارے جھوٹ کو نیلے پردوں میں ڈھک دیتی ہے۔ یہ دونوں جانب کے متوسط طبقے کی بات تھی، جو دانشمند ہونے کے زعم میں سدا غلط سوچتا ہے اور غلط نتیجے نکالتا ہے۔

یہاں پاکستان میں متوسط طبقے کو غیر ملکی امداد سے آنے والی خوشحالی میں حصہ ملا

تھا مگر خود مختاری میں اسے شریک نہیں کیا گیا۔ بھارت میں یہ طبقہ چیخ چنگھاڑ کرنے میں پیش پیش رہا یعنی اپنی جمہوریت کا حصے دار بنا۔ لیکن جسمانی آسائشیں اسے ذرا کم حاصل ہوئیں۔ ماڈرن کمفرٹس اس کی حسرت ہی رہی۔ لہٰذا دونوں ملکوں کے اس طبقے نے ایک دوسرے کو سامنے رکھ کر سب کے لیے سوچا اور ہمہ گیر نتیجے نکال ڈالے ویسے یہ تجزیہ بھی آج کے لیے ہے۔ اس وقت تو بھارت پر رشک کرنے والوں میں بھی پیٹ بھرے شامل تھے۔

بہر حال یہ حالات تھے جب ہمارے دیس میں بنیادی جمہوریت کا اجرا ہوا اسے چھوٹی جمہوریت کہا گیا۔ پھر بھی ہم مطمئن ہوئے۔ چلو فی الحال چھوٹی ہی سہی کبھی نہ کبھی تو بڑی ہوگی۔ ہم بھی اس لائن میں تو آجائیں۔ برٹن میں سب سے پرانی جمہوریت ہے وہ ہمارے پرانے آقاؤں کا ملک ہے۔ اس ملک میں جمہوریت کے تجربے اُن صدیوں میں بھی کیئے گئے جب ان کے نوآبادیاتی راج کی وسعتیں مشرق تا مغرب دنیا میں پھیلتی چلی گئی تھیں۔ امریکہ ہمارا نیا آقا ویتنام پر دن رات بمباری کرتا رہا ہے ساری دُنیا میں جمہوریتوں کے تختے الٹا کر فوجی راج مسلط کرواتا ہے لیکن خود بڑا جمہوری ملک ہے قریبی ہمسایہ، پرانا شریک اور نیا حریف سب سے بڑی جمہوریت کا دعویدار ہے۔ کیوں نہ ہو، آخر وہاں شودروں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہے۔ چلو دھیرے دھیرے ہمیں بھی کوئی نہ کوئی ڈگری مل جائے گی۔ آخر تو ایسی بڑی جمہوریتوں سے ہمارے تعلقات اور رشتے داریاں ہیں۔ یوں بھی چھوٹی سے بڑی تک، محدود سے لامحدود تک کا پروگرام ذرا منطقی ہوتا ہے۔

سو بنیادی جمہوریتوں کے الیکشن ہوئے، مگر بات کچھ بنی نہیں، کنٹرول زیادہ ہی رہا، نہ کوئی دھوم نہ دھڑکا۔ نہ رونق نہ میلا۔ حریفوں کے مقابلے نہ مجادلے، حق حساب سے بھی عوام کو فرق نہ پڑا۔ وہی ان کی کم نصیبی وہی مقدروں کی بے نیازی۔ ان جمہوریت

کے آنے سے بے تنک فیلڈ مارشل ایک نئے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ اور صدر مملکت کا عالیشان خطاب اور مقام ملا۔ مقام پر تو وہ پہلے ہی قابض تھے لامحدود اختیارات سے بھی مالامال وہ تھے اب بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے عوام کے لیڈر ہونے کی اعزازی ڈگری اور شیروانی انھوں نے حاصل کر لی۔

اس سارے معاملے میں آسمان سے جو الہام ہوئے ان کا عام آدمی کو کچھ پتہ نہیں۔ البتہ بنیادی جمہوریت کا ڈھانچہ اور بنیادی قوانین کسی سنیئر اور خاص قسم کے سی ایس پی نے اپنے شاندار دفتر کی کل دار کرسی پہ جھولتے ہوئے اور عمدہ کافی کے سِپ لیتے ہوئے سپرد کاغذ کیئے۔ پھر ریڈیو پر بار بار نشر ہوئے (ٹی وی ابھی ملک میں آیا نہیں تھا) سینما سکرین پر فلم سے پہلے بنیادی جمہوریت کا سبق پڑھایا گیا۔ مگر ان تمام رسموں کے باوجود جو تاثر ملا وہ یہی تھا۔ کہ بنیادی جمہوریت کوئی نکھٹو سی چیز ہوگی۔ بنیادی لوگوں کے کسی کام کی، نہ ہی فروعی لوگوں کے استعمال کی سوائے فیلڈ مارشل کے ڈپٹی کمشنروں کے اُسے کسی نے اہمیت نہ دی۔ الیکشن کے لیے کھڑے ہونے کا وقت آیا تو خاندانی امیروں نے کیا کہ بی ڈی ممبر بنوانے کے لیے اپنے منشی متصدی آگے کر دیئے۔ اور بابو شاہی مزاج کے لوگوں کو ناک بھوں چڑھا کر یہ کہتے سُنا گیا۔ لو صاحب اچھی جمہوریت آئی۔ نائی دھوبی اور جولاہے سب چیئرمین بن گئے۔

خیر ابھی ہم اس جمہوریت میں جمہور کے مفاد کا کوئی باریک نکتہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ ننگال سے کسی سینک سے کمیونسٹ نے اعلان کر دیا۔ بچّو زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہمارے جیسے سماجوں میں جمہوریت چھوٹی ہو یا بڑی۔ لوگوں کے لیے نہیں ہوتی۔ فقط چند لوگوں کے لیے ہوتی ہے۔ اب بھی بنیادی جمہوریت کے چیئرمین سے زیادہ علاقے کا تھانیدار طاقت ور تھا۔ عوام کے لیے اس جمہوریت کی تعریف کی جائے تو معنی ہجے سب بدل جاتے ہیں اور یہ جمہوریت کچھ اس طرح کی ہو جاتی ہے۔

Democracy is a Government far the people

off the people buy the people.

بلکہ اب تو خریدنے والی بات بھی کہاں رہی اب بیگار میں پکڑ کر ووٹ بنا لیے جاتے پاکستان میں اسی طرح سے ہے۔ وہی لوگ جن سے بیگار لی جاتی ہے انہیں کو بی ڈی ووٹر بنا لیا گیا۔ طنز کے انداز میں کہی گئی باتوں میں کیسی کیسی سچائیاں چھپی ہوئی ہوتی ہیں آخر علامہ اقبال نے بھی تو اسی نظام کو اپنے حساب سے دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب کیا تھا۔ جاگیر دار اور ٹھیکے دار قسم کے سماج میں عوام کو آزادی کی نیلم پری نہیں مل سکتی۔ یہ تو بی ڈی سسٹم اپنے فیلڈ مارشل کی عمل داری میں ایک توسیع ہے۔ انہوں نے اپنے نوکر چاکر بڑھائے ہیں۔ مگر ایک بات پھر بھی ہو گئی۔ یہ سب ڈھونگ رچائے تو تھے اپنے مفاد کے لیے اور لوگوں کو جُل دینے کے لیے۔ مگر ان کا کیا تھوڑا بہت ان کے آگے بھی آیا۔ اگلے الیکشن کا زمانہ آتے آتے اسی بی ڈی سسٹم میں جمہوریت کی جان دھڑکنے لگی۔ ننھا چوزہ متحرک ہو گیا۔ انڈے کا خول توڑنے کے لیے اندر سے ٹھونگیں مارنے لگا۔ پھر تو ہوا یہ کہ صاحب صدر کی چھوٹی جمہوریت کا بچہ جمہورا لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے رائے عامہ کا جن بنکر سامنے آکھڑا ہوا۔ اسی کمتر جمہوریت کو کام میں لاکر دونوں پاکستانوں کے عوام نے فیلڈ مارشل اور ان کے تمام سسٹموں کے لیے اپنی نفرتوں کا بھرپور اظہار کر ڈالا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی جمہوریت کے دوسرے الیکشن آتے آتے اچھی خاصی سیاسی کھپ ہو چکی تھی۔ پرانی سیاست کی ہانڈی سے کچھ کھرچن نکلی اور حزب اختلاف کی لیڈری کا پتلا تیار ہونے لگا۔ کچھ مٹی اِدھر اُدھر سے بھی لگائی گئی۔ مگر پھر بھی لیڈر شپ کا پتلا کمزور ہی رہا۔ مگر لوگ اور ان کے جذبے توانا ثابت ہوئے۔ بڑے بڑے جلسے مظاہرے ہونے لگے۔ ایوب شاہی مردہ باد، در و دیوار پہ لکھ دی گئی۔ پہلی بار عزت مآب صاحب صدر نے جو ابھی تک پکے پورے فیلڈ مارشل بھی تھے، محل کی کھڑکی سے عوام کو دیکھا

عوام کا جن!
اور پوچھا: یہ کیا چاہتے ہیں۔؟ مگر چالاک بیوروکریٹ نے بات ٹال دی۔ کچھ نہیں حضور بالا، یہ لوگ تقریر سننا چاہتے ہیں۔ آپ بھی تقریریں شروع کیجئے۔ اور صاحب صدر کے بڑے لائق سیکرٹری ان کی تقریریں ڈرافٹ کرنے میں جٹ گئے۔ فیلڈ مارشل ریڈیو پر اور ٹی وی پر اپنی دس سالہ ترقی کی کہانی رعب کی زبان میں سنانے لگے۔ پھر انہوں نے حکم دیا۔ بازار لگاؤ۔ ترقی کی گاڑی چلاؤ۔ ہمارے منصوبے نمائش میں رکھو۔ سب کچھ ہوا۔ مگر عوام جمہوریت کی بات سننے حزب اختلاف کے جلسوں میں جاتے رہے۔ زیادہ اور زیادہ لوگ سڑکوں پر آ گئے۔ زیادہ سے زیادہ دیواریں بولنے لگیں مردہ باد مردہ باد!!

اس وقت ایک اور اہم بات یہ ہوئی کہ ملک کے شرفا جو قیادت کی معتبری کے لیے جملہ حقوق اپنے نام لکھوانے کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں۔ اب فیلڈ مارشل کے مخالف ہوئے تو خاصے شریف النفس اور فراخ دل بھی ہو گئے۔ یا یوں کہیے اس وقت انہیں اپنی ذاتوں پر سے اعتماد ہی گھٹ گیا کہ سارے جبے عمامے پگڑیاں ٹوپیاں اور شیروانیاں اپنے حق سے دست بردار ہو گئیں اور جمہوری تحریک کی قیادت کا منصب ایک خاتون کو بخش دیا۔ ہر چند کہ وہ خاتون قائداعظم کی بہن تھی، مگر آزادی کی لڑائی میں اپنا حصہ ڈال چکی تھی۔ فاطمہ جناح بہادری سے سامنے آئی اور لوگ تھے کہ سمندر کی لہروں کی طرح اس کے ساتھ چلے برسوں بعد ایک بار پھر ڈھاکہ اور لاہور ایک ہی طرح سوچ رہے تھے۔ آمریت کا خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی۔ کم از کم پروگرام یہی تھا اور وہ اسی پروگرام پر متفق تھے۔ آگے کی بات ابھی طے نہیں تھی اور شاید اسے طے کر لینا ان کے بس میں بھی نہیں تھا۔

مگر اس الیکشن کا نتیجہ بھی قطعی انوکھا نہیں تھا۔ جیسے کہ ہوتا ہے، حکومت نے الیکشن کرائے اور خود ہی جیت لیے۔ مگر ڈھاکے لاہور اور کراچی نے اس فیصلے کو

غلط قرار دے دیا دھاندلی ہوتی ہے۔ حکومت نے کھلی دھاندلی کروائی ہے۔ اس طرح کے جملے تب پہلی بار سُنے گئے۔ یہی کچھ آج سُنتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ ہمارے ملک کے حکمران طبقے اپنی بنیاد سے ہی دھاندلی باز رہے ہیں۔ سو الیکشنوں میں دھاندلی قدرتی بات ہے۔ خواہ اختیارات ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ ہوں، خواہ وزیروں کے۔ ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان حکمرانوں کو طریقہ کار بدلنے کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ حکومت تو دھاندلی سے ہی کرنی ہے۔ پھر لوگوں کو زحمت دینے اور پولنگ پر خزانہ برباد کرنیکی تُک کیا ہے۔؟ مگر شاید اس لیے کہ دُنیا میں حالات خاصے بدل چکے ہیں۔ اب ہر ایک حکمران کے لیے مسند خلافت ساتھ لیڈری کی سند لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔

بہرکیف جو بھی ہوا۔ جس طرح بھی ہوا۔ تھوڑی بہت جمہوریت آئی تو ہمیں کچھ عقل بھی آئی۔ کم از کم لفظ جمہوریت کی شعبدہ گری کا انداز ہوا۔ فیوڈل جمہوریت اور بورژوا جمہوریت کے ساتھ فوجی جمہوریت کا اضافہ صرف ہمارے ملک میں ہوا۔ ے آئے تھے کہ جمہوریت میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ مگر اب نئے تجربے نے بتایا کہ جمہوریت کی جو قسم آمریت نے کاشت کی اُس میں بندوں کو گنا بھی نہیں کرتے۔ بلکہ بندوں کا ہونا یا نہ ہونا ضروری بھی نہیں۔ اہمیت صرف حکمرانوں کی ہے جو چاہے تو ننگی تلوار کے ساتھ حکومت کریں۔ دل چاہے تو جمہوریت کا ڈھونگ رچیں۔ کچھ اہمیت اس عملے کی بھی ہے جو پرچیاں بیلٹ بکس میں ڈلواتا ہے اور پرچیاں جو بیلٹ بکس سے برآمد ہوتی ہیں۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں بنتی کہ پرچی کس ہاتھ نے اور کیوں ڈبے میں ڈالا۔ اُن وعدوں کی نوعیت کیا تھی اور تعداد کتنی جو ووٹ ڈالنے والے سے کیے گئے اور وہ اُمیدیں جو کاغذ کے ٹکڑے سے وابستہ کی گئیں۔ ان ساری باتوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ یہ سب کچھ بھلا دینا ضروری ہوتا ہے ورنہ کئی خطرے ملک وقوم کو لاحق ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر

روٹی کپڑے اور مکان کی اُمید پر کسی نے ووٹ ڈالا تو ملک کا امن خطرے میں پڑے گا۔ اگر اصلاحات کے وعدے پر کسی نے ووٹ لیا تو اسلام خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور اگر حقوق اور آزادیوں کی بات تھی تو قوم کا اتحاد پارہ پارہ ہونے لگتا ہے۔

وہ ساری کارروائی جیسے جمہوری انداز کہتے ہیں۔ بس اتنی رہتی ہے کہ اگر زیادہ پرچیاں حاصل کرنے والا غریبوں کی بستی سے اُٹھا ہو تو امیروں کی کالونی میں جا بستا ہے شہری ہوا تو بڑا شہری بن جاتا ہے۔ اسمبلی میں تو کبھی کبھار آتا بھی ہے۔ مگر ان بستیوں کی طرف کبھی نہیں لوٹتا جہاں کے لوگوں نے اس کے ڈبے میں امیدوں کی پرچی ڈالی ہوتی تا وقتیکہ الیکشن کا موسم پھر کبھی آ جائے یا کوئی تحریک چل نکلے۔ ایسے وقتوں میں یہ بہروپیہ ان بستیوں میں اپنی شناخت لینے کو وارد ہوتا ہے کبھی نئے وعدوں کا پمفلٹ لیکر اور کبھی فقط سٹین گن۔ یہ جملہ معترضہ ہے ذرا طویل ہوگیا۔ دراصل ہم اپنے ملک میں جمہوریت کے ارتقاء کا جائزہ لے رہے تھے۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایوب شاہی دور کے دوسرے BD الیکشن ہوتے ہوتے لوگوں میں ہمت جاگ اُٹھی۔ شعور کی کمی تو پہلے بھی نہ تھا۔ سو عین اُس وقت جب آمریت کا دس سالہ جشن ترقی کے نام پر منایا جارہا تھا۔ لوگ پیاس پیاس! پکارتے سڑکوں پر نکل آئے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کا خیال بھی تھا یہ لوگ جمہوریت کے پیاسے نہیں تھے۔ بلکہ روٹی کے بھوکے صاف ستھرے پانی کے پیاسے اور چھت والے گھروں کے ضرورت مند تھے۔ بہت دنوں کی چُپ سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ پیٹ کی بھاپ اب دل کو چڑھنے لگی تھی۔ سو انہوں نے لاٹھی گولی کی پرواہ ہی نہ کی بڑے بڑے مظاہرے کرنے لگے۔ بات یہ تھی کہ ایوب شاہی دور میں امریکی امداد بہت زیادہ آئی اس امداد کے بدلے میں ملک کو سامراج کی غلامی میں دینے جانے والے معاہدے خفیہ اور ظاہر سبھی ہوئے۔ اس امداد سے صنعت وغیرہ کی بجائے خاندان بنتے چلے گئے

بائیس ۲۲ بتیس۔ ادھر سامانِ عیش کی ریل پیل اس طرح ہوئی کہ روزمرہ زندگی میں تضاد بڑھ گئے۔ بہت گہرے اور نمایاں ہو گئے۔ امیر امیر تر ہوئے اور غریب غریب تر۔ اس صورتِ حال نے نچلے متوسط طبقے کے حساس حلقوں کو بہت متاثر کیا۔ اسی لیے طالب علم اس تحریک کا ہراول بنکر نکلے۔ اور زیادہ ایجی ٹیشن ڈھاکے کراچی، لاہور کے شہروں میں ہوئی۔ وہ لوگ ترقی کا پول کھول رہے تھے۔ ترقی جو صرف اُوپر کے خاندانوں کی ہوئی تھی۔ اور دلالوں کی جنھوں نے سودے کرائے اور سمگلنگ کے سامان سے ملک بھر دیا۔ لوگ اچھی طرح جان گئے تھے کہ ترقیوں کی فہرست خواہ کتنی طویل ہو۔ ہمارے ملک کا نام پس ماندہ ملکوں کی فہرست میں سب سے نیچے لکھا ہوا ہے۔ واپڈا ہاؤس خواہ کتنا ہی جگمگائے۔ غریب کے گھر مٹی کا دیا بھی سرِ شام بجھنے لگتا ہے آخر کو سامراجی امداد اور خیرات ملکوں کی ترقی کے لیے تو نہیں ہوتی نا۔ اسی دور میں خاندانوں نے اور گماشتوں نے دولت باہر نکالنے کا دھندا بھی شروع کیا۔ اور یہ سب ڈھکا چھپا نہیں رہا۔

بات جو جشن کی مخالفت سے شروع ہوئی تھی۔ بہت بڑھ گئی۔ آمریت کا قلعہ باہر سے تو بہت فولادی اور آہنی قسم کا معلوم ہوتا تھا۔ مگر چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ بنیادوں کے نیچے ریتلی زمین تھی۔ جوں جوں نعرے بلند ہوئے توں توں ایوب شاہی ستون لڑکھڑائے فصیلوں میں دراڑیں پڑیں۔ لوگ اپنی ضرورتوں کے حوالے سے آواز اُٹھا رہے تھے اور فریب کا پردہ کرکے سچائی کو سامنے لانے کی جدوجہد میں لاٹھی گولی کی سرکار کا بھرم توڑ رہے تھے۔ اب آکر یہ اندازہ بھی ہوا کہ اقتصادی آزادی جمہوریت کی اصل بنیاد ہے یہ آزادی اگر نہ ہو تو جمہوریت کیا ہے۔ طبقاتی مفاد پرستی کا ایک اور حربہ جو عوام کے مفاد کو ضرب لگاتا ہے، مگر بڑی عیاری سے۔ اُوپر والے طبقے تو اپنی جمہوریت ہمیشہ قائم رکھتے ہیں، کلونیل دور میں بھی کیا تھا صرف اقتدار اعلیٰ ہی ان کا نہیں تھا۔ باقی ہر

قسم کی سیاست وہ کرتے ہی رہتے تھے۔ بعد میں متوسط طبقے نے بھی پیٹ بھر لینے کے بعد جمہوریت کی سویٹ ڈش مانگ لی۔ مگر محنت بیچنے والے طبقے کو تو ابھی دو وقت کی روٹی کما لینے کی آزادی حاصل نہیں ہوئی۔ تن ڈھانکنے کے لیے دو گز کپڑے اور سردی گرمی سے بچنے کے لیے ایک چھت کا تحفظ نہیں ملا۔ ایک مزارعے کے لیے ایک کان کن کے لیے ایک چھان بورا بیچنے والے کے اور کوڑے کے ڈھیر سے روٹی کے ٹکڑے چن کر پیٹ بھرنے والے بچوں کو برٹش راج کی غلامی اور کالا باغ دور کی جمہوریت میں کونسا فرق ملے گا۔ ایک بار پھر جملہ معترضہ بیچ میں آگیا۔

ہاں تو۔ ان دنوں بھری بہار کا موسم تھا جب ڈھاکہ اور لاہور کی سڑکوں پر لہو رنگ پھول کھلنے لگے۔ غریب آدمی کا خون بہت سرخ رنگ کا ہوتا ہے نا اسے دیکھتے ہی اُمرا کے تو دل دہل جاتے ہیں۔ عجب بات ہے لہو اُن کا بہتا ہے۔ دل اِن کا گھٹتا ہے۔ تب بھی یہی ہوا۔ دولت والوں کو دکھائی دینے لگا۔ اور بڑے خاندانوں کی تو آنکھیں پھٹ گئیں نیندیں حرام ہوئیں۔ یہ لال سُرخ لہو جو کہیں انقلاب کا رنگ بن جائے تو؟ اب دونوں طبقے متحرک تھے۔ وہ آمریت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ یہ اپنی دولت کا بند وبست کرنے میں لگے۔ اور کچھ سازش پکانے کا اہتمام بھی ہوا۔ اس لیے عین اسی وقت ایک نیا تماشا لگا۔ کچھ خرانٹ قسم کے موقعہ پرست اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے لیڈروں کے لبادے اوڑھے اور چور دروازوں سے قلعے میں داخل ہو گئے۔ اور پھر لمبی چوڑی گول میز کے گرد بیٹھ کر فیلڈ مارشل کے بیوروکریٹ کی وساطت سے اقتدار کی منتقلی کے کاغذات حاصل کرنے کی گفت وشنید کرنے لگے۔ مگر یہ فریب چلتا تو کیسے۔ اوّل تو عوام کو معلوم تھا۔ ان کا اپنا کردار کیا رہا۔ چور کا بھائی گرہ کٹ۔ اقتدار کی مٹھائی دیکھ کر رال تو ہر کسی کی ٹپکے مگر لوگوں کو سڑکوں سے ہٹا کر گھر بھیج دینے کی ضمانت کس کے پاس تھی۔ مگر جو اس

ٹولے کا مہری بھتا سدا سے عوام کی نفرت کا نشان رہا ہے۔ لاریب! کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ اور عوام کی اجتماعی خواہشوں اور ضرورتوں کا تحفظ حکومت کے بنیادی اصول کا نام ہے اگر یہ نہیں تو سب فراڈ ہے، مفاد پرستی ہے۔ تب تو جمہوریت لوگوں کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ لوگوں کے خلاف سودے بازی کرنے کے لیے ہوتی ہے یا سرمایہ داروں کی جنگ۔ جنگ زرگری جیسے کہ اقبالؔ نے کہا۔

سو فیلڈ مارشل اور مہرے پہیوں کی کانفرنس ناکام ہوگئی۔ لوگوں نے مظاہرے جاری رکھے۔ دارالخلافے کے محلات میں بوڑھی نسل کے گرگے اور بیورو کریسی کے جینیس بادام خریدے پی کر اس مسئلے کا حل ڈھونڈ رہے تھے کہ نئی نسل نئے نعرے لیکر نکل آئی۔ عجیب بات ہے۔ لاہور میں نہ ڈھاکے میں ایک نعرہ بھی جمہوریت کے لیے نہیں تھا۔ روٹی کپڑا اور مکان، مہنگائی کا خاتمہ بے روزگاری کا علاج۔ مگر ایک بات اور بھی علاقائی اور اور صوبائی حقوق کا بہت شور ہوا۔ ون یونٹ نے صوبوں کو شدید نفرت دی اور اپنی بقاء کا جذبہ تیز کیا۔ لوگوں نے اور علاقوں نے پہلی بار اپنی آواز استعمال کی چیختے چنگھاڑتے حقائق سامنے آئے تو دولت والے اور حکومت والے دونوں بے چین ہونے۔ جلدی جلدی دولت باہر نکلنے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جب مذہب والوں کی روح میں بھی اضطراب بپا ہوا۔ امیروں کی ملازمت اور مصاحبت میں تو ان کی عزت آبرو محفوظ ہوتی ہے اور مستقبل روشن۔ لیکن جب غریبوں نے اپنے مسائل کی بات چھیڑی تو بھی پاپاؤں کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ انہوں نے اپنے ترکش کا اکلوتا تیر نکال لیا اور مذہب کی دہائی دے ڈالی۔ "اسلام خطرے میں"! عام نعرہ تھا۔ علاوہ ازیں۔ خطرے کا ڈھونگ کئی قسم کے تعصبات وغیرہ۔ مگر جناب مڈل کلاس والوں کا تو سبھی کچھ خطرے میں تھا۔ مذہب ایمان، کلچر، زبان اور شرافت نجابت کچھ بھی بچتا دکھائی نہ دیا۔ ایسے لگتا ہے یہ سب چیزیں موم سے بنی ہوئی ہیں کہ ذرا سی حرارت سے پگھلنے لگتی ہیں۔ ویسے

تو ان کی عقل شریف بھی اتنی ہی کچی ہوتی ہے کہ بات کو سمجھے بوجھے بغیر اُوپر والوں کے قدموں میں بیٹھ کر تحفظ مانگتے ہیں۔ یہ ان کا مرض ہے۔ اور مرض نے زور پکڑا تو سازش گہری ہوئی حاکمُ ملا تو پہلے ہی اکٹھے تھے اب مڈل کلاسیئے بھی آن ملے۔ اُدھر سیٹھ اور فیوڈل اپنی دولت بچانے کو اس کا کچھ حصہ خرچ کر رہے تھے۔ دارالخلافے میں سازش نے اچانک رنگ بدلا۔ گلیاں اور محلے ہار گئے۔ دارالخلافہ جیت گیا اور جیت گیا CIA۔ پاکستان کے عوام ایک بار پھر بے بس تھے۔

۲۵۔ مارچ ۱۹۶۹ء کے اخباروں نے شہ سُرخی لگائی، پاکستان میں مارشل لا! ایک اور مارشل لا!! دوسری مرتبہ بڑا مارشل لا۔ اکثر پہلے اور چھوٹے والے کو بھی گن لو تب تیسرا نیا مارشل لا۔ ایڈمنسٹریٹر کمانڈر ان چیف جرنیل یحییٰ خان تھا۔ سیاہ حاشیے کے اندر اس خبر کو پڑھ کر ستره ستره کو ٹھیوں والوں نے شکرانے کے نفل پڑھے۔ میلاد کرائے ساٹھ ستر مربعوں والے تو یہیں بیٹھے رب کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ مگر سینکڑوں ہزاروں مربعوں کے مالک خانہ کعبہ جا کر عمرے کے ساتھ رب کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ رب جس نے ان کی حفاظت کے لیے دعائیں قبول کیں اور مارشل لا، وقت پر لگوا دیا۔ یہی حال سیٹھ کا تھا اُس نے جرنیل صاحب کی خدمت میں مکمل وفاداری کی ڈالی پہنچا کر سلام پیش کیا۔ بعد ہر طرح کے تحفظ کا وعدہ حاصل کیا۔ جمہوریت کے متوالے مذہبی سیاست گری کے خستہ خوار لیڈر نئے جرنیل بادشاہ کو تعاون کا نذرانہ پیش کر آئے CSP نے سوٹ کی سلوٹیں درست کیں اور نئے سرے سے کرسی پر اکڑا بیٹھا۔ مگر ان سب کے دل کو قرار اب بھی نہ ملا۔ دل وہ خلش رہ گئی۔ جو کبھی نہ دیکھا تھا، وہی دیکھے بیٹھے تھے۔ فیلڈ مارشل کا راج سنگھاسن ہلتے دیکھ چکے تھے۔ ابھی تک کانوں میں اُن نعروں کی گونج باقی تھی جو ملک کے دونوں حصوں میں اُبھرے تھے۔ پہلی بار دونوں حصوں میں ایک جیسی آوازیں گونجی تھیں۔ یہ آوازیں جمہوریت کی مانگ ہی نہیں کچھ اور بھی تھیں۔ یہ تو

زندہ رہنے کا مطالبہ تھا۔ کچھ وقت کی بات تھی۔ کچھ مستقبل کا معاملہ تھا۔ سو پورے ڈیڑھ دو برس تک پاکستان کے سرمایہ دار اپنی دولت باہر نکالتے رہے وہ ان کے بچوں کا مستقبل تھا جیسے غیر ملکی بنکوں میں بند کرتے رہے۔ کیونکہ ملک کے اندر ان تمام لوگوں نے جواب تک گردِ راہ بنکر جیئے تھے، اپنے مستقبل کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ اور یہ ہوتا ہے، جب نئے لوگ خواب دیکھیں تو پرانے لوگوں کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔ "اس ملک کا کوئی مستقبل نہیں"۔ خوف کی یہ خیال آرائی ہر عوامی تحریک کے ساتھ سرمایہ دار طبقے میں شروع ہو جاتی ہے۔ اور غریب آدمی کی روٹی کا مسئلہ چھیڑتے ہی متوسط طبقے کا مذہب خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اُوپر والوں کی دولت پھر دونوں ملکر اُس جمہوریت کا بھی گلا گھونٹ دیتے ہیں جو اُن کی اپنی تھی اور جیسے انہوں نے کسی مہنگی داشتہ کی طرح سجا بنا کر اپنے شبستانوں کی زینت بنایا ہوتا ہے۔ بیچارے اپنا سیاسی اقتدار خود لے جاکر فوج کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں اور پھر مارشل لاء لگتے ہی ان کا اور ملک کا مستقبل درخشاں ہو جاتا ہے۔ اور مذہب کی تقدیس بھی نِکھر نکلتی ہے۔

سو ۲۶۔ مارچ ۱۹۶۹ء کی صبح درسگاہوں کے مقفل دروازے پھر سے کُھل گئے۔ بھائیں بھائیں کرتے ہوسٹل آباد ہو گئے ـــ طالب علم جو اتنے دنوں لاٹھی گولی سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے، دل میں تو خبر نہیں کیا کچھ نیا لائے۔ ہاتھوں میں وہی پرانی کتابیں لئے لوٹ آئے۔ سیاسی ورکرز مزدور لیڈر سب اندر ہوئے۔ نئے مارشل لاء آرڈیننس ریڈیو پر بولے گئے۔ اخباروں میں چھپے C.M.L.A کی تقریر آئی۔ بھونڈی بھدی آواز بھدی بھونڈی باتیں بلکہ دھمکیاں۔ اب کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بہت بڑا شرابی کبابی تھا۔ اپنی کھوپڑی سے کم ہی سوچ سکتا تھا۔ لہذا بیوروکریسی کے اختیارات بڑھ گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ایک بار پھر قومی ترانہ بجا کر کمانڈر انچیف نے صدر

مملکت کا لقب اختیار کیا اور ریڈیو ٹی وی سے تقریر نشر فرمائی۔ "ہم آگئے ہیں۔ اب ہم سب کو فتح کرلیں گے اندر کردیں گے۔ ہم ہم!!

اُسی شام کو کسی نے دھیرے سے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دیکھا فلک آراء کھڑی تھی۔ یہ کلاس کی سب سے کم عمر دکھائی دینے والی بنگالی طالبہ تھی۔

EXCUSE ME "مس ہمیں آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔ ہاں ہاں آؤ۔ میں نے اسے اندر بلالیا تو اس منحنی سی لڑکی نے مجھ سے وہ بات پوچھ ڈالی جو میں خود کسی سے پوچھنا چاہ رہی تھی پاکستان میں بار بار مارشل لاء کیوں لگ جاتا ہے؟ فوجی لوگ صدر کیسے بن جاتے ہیں؟ صدر تو لوگوں کا ہونا چاہیئے۔ . . آزاد ملکوں میں. . . پولیٹیکل سائنس کی کتابوں میں. . . ہمارے ملک کا حال اُن کتابوں کے مطابق نہیں فلک آراء بی۔ نہ ہی آزاد ملکوں جیسی کوئی بات ہے وہ کتابیں جن میں صحیح باتیں لکھی ہیں۔ ہمارے جیسے حالات کے اسباب اور علاج درج ہیں، وہی کتابیں تم پڑھو۔ یوٹوپیا سے فرسٹریشن پیدا ہوتی ہے، اور ابھی آزادی کا معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔ اُوپر کے طبقے عیش کررہے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام آزاد ہیں، ملک خود مختار ہے۔ میں نے اسے تھوڑا بہت بتایا۔ مگر اُس نے اور سوال داغ دیئے۔ فلک آراء کی پریشانی یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء میں جو آزادی ملی تھی اس کا کیا بنا؟ پھر وہاں فوجی راج کا کوئی حوالہ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ سرے سے فوج کا ذکر ہی نہیں، وغیرہ وغیرہ خود اپنے دل کی مایوسی چھپا کر میں فلک آرا کو بتانے کی کوشش کرتی رہی۔ کہ صرف ہماری بات ہی نہیں۔ نوآبادتی نظام سے نکلنے والے اور ممالک بھی برٹش سامراج کے دستور بدل نہ سکے کیونکہ وہ امریکی سامراج کے شکنجے کو توڑنے میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور اب وہاں ڈکٹیٹرشپ ہے۔ فوجی راج یا نام نمود کی جمہوریت ہے تو عوام کو اس کا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ جس کی لاٹھی اسی کی بھینس۔ عوام کی جمہوریت تب ہی آسکتی ہے۔ جب ہر قسم کے استحصال کا خاتمہ ہو

پیدا واری ذریعے آزاد ہوں۔ ورنہ تو فوج کے جرنیل حکومت کریں یا وہ طبقہ جو پیداواری ذریعے کنٹرول کرتا ہے، بات ایک ہی رہتی ہے بلاواسطہ یا بالواسطہ عوام پر حکومت تو فوج پولیس کی مدد سے کی جاتی ہے۔ اور ان کا حق حصہ دبانے کے لیے اُسی طرح کے قوانین بنا کر نافذ کروا لیے جاتے ہیں۔

فلک آرا یہ باتیں سنتے ہوئے اپنی موٹی موٹی آنکھیں گھما کر دور کہیں دیکھ رہی تھی فلک آرا ہی کیوں، اُس وقت سارا بنگال ہی اندھیرے سے پرے کہیں مستقبل کی کرن دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اپریل ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ کلونیل آقاؤں کے جانے کے بعد پیدا ہونے والے بچے بھی اب ۲۲ برس کے ہو چکے تھے۔ مگر ان عاقل بالغ بچوں کی ساری نسل کے لیے کرنے کو کچھ نہ تھا۔ بڈھے کسی کام کو ہاتھ لگانے دیتے تھے نہ حاکم اس کی اجازت دیتے۔ بیکار زندگیاں فرسٹریٹڈ نسلیں! پرانی قیادت اب بڈھی بھر شٹ ہو چکی تھی۔ تب یہ نوجوان اپنی فرسٹریشن کا علاج ڈھونڈنے دوسری نسل یعنی کم بڈھوں کی طرف رجوع ہوئے۔ دونوں حصوں میں نئی پارٹیاں اُبھر رہی تھیں اور نئے لیڈر نوجوانوں میں ایکدم بہت مقبول ہوئے۔ یہ لوگ پرانی سیاست گری کے پٹے ہوئے مُہرے تو نہ تھے، مگر نئی راہوں کے مسافر بھی کہاں تھے۔ یہ لوگ جوان تھے اور نئی پرانی سوچ کا سنگم بنانا چاہتے تھے۔ کچھ ادھر سے۔ کچھ اُدھر سے ملا کر سوشلزم امپریلزم سب تھوڑا تھوڑا۔ میکسٹا کانمی۔ لینڈ ریفارمز۔ ایک ملغوبہ۔ مگر طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں، یہ بڑی بات تھی۔ لوگ دیوانے ہوئے، فریفتہ ہوئے۔ نیا لیڈر ہیرو کی طرح کندھوں پر اُٹھا لیا گیا۔ انداز نیا تھا۔ لفظ نئے تھے۔ اگرچہ سیاست ان کی وہی پرانے درخت کے تنے سے پھوٹنے والی بور زدہ شاخ تھی کہ جس سے جو پھول کھلتا۔ اس میں صرف امرت دھوتا۔ پھر بھی نئی کونپلوں میں حسن ہوتا ہے۔ پوست کے پھول کی سرخی لہو کی سرخی تو نہیں بن سکتی یہ بات لوگ جانتے بھی تھے۔ مگر خوش تھے۔ کہ مشرق کا لیڈر چھ نکات لایا

تھا۔ اور مغرب کا روٹی کپڑا اور مکان کا وعدہ

جہاں تک پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی لیڈر شپ کا تعلق ہے، اُن کی اپنی فرسٹریشن تھی یہ پرانے سیاسی خانوادوں کے فرزند تھے۔ جنہیں ابھی تک بزرگوں نے کاری مختاری کی کنجیاں نہیں دی تھیں۔ جوانی تھی کہ انتظار میں بیتی جا رہی تھی۔ ہر چند کہ کھانے اُڑانے کو بہت تھا۔ ہر قسم کے مشاغل بھی تھے۔ مگر سیاست کرنا تو امیرزادوں کا مشغلہ دلچسپ ہی رہا۔ ویسے بنگال کی فرسٹریشن فرق نوعیت کی تھی۔ وہاں مڈل کلاس خاصی بیدار اور باشعور ہو چکی تھی۔ نئے لیڈروں نے بات کو سمجھا اور کام کیا۔ ملک کے دونوں حصوں میں عوامی سطح پر سیاسی پارٹیاں اُبھرنے اور پھیلنے لگیں۔ ہر قسم کی تحریکوں کے سوتے اُن میں شامل ہونے لگے۔ سال ختم ہوتے ہوتے غیر معمولی قسم کا سیاسی و انقلابی اُبھار پیدا ہو چکا تھا۔ اور حالات کے کسی نہ کسی طور بدل جانے کے آثار زمین تا افق دکھائی پڑ رہے تھے۔ ایسے میں نئے مارشل لا، کے حاکموں کے لیے تفصیلی پروگرام کا وقت تو نہیں تھا کچھ نہ کچھ باندازِ دیگر کیا جا سکتا تھا۔ سو تعمیری کاموں کے بہانے کچھ ملبہ صاف کرنے کے بہانے کچھ وقت لیا گیا۔ پھر جب ٹینک کو دلدل میں پھنستے دیکھا تو الیکشن کا اعلان کر دیا۔

اصلی تے وڈا الیکشن جو سچ مچ ہونے والا تھا۔ اور ہم نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا۔ اس ملک میں ثابت و سالم پاکستان میں پہلا اور آخری الیکشن ہوا۔ اور کھُلے خزانے ہوا۔ اگرچہ فوج کے سائے میں ہوا۔ پھر بھی وہ ایک زبردست الیکشن تھا۔ کہ اُس میں غریب غربا کمی کمین سبھی نے زبردست حصہ ڈالا اور حصہ لیا۔ کیونکہ وہ جنہیں پہلے چوہڑے چمار کہا جاتا تھا، وہ نئی پارٹیوں کے مانی فسٹو میں محنت کش عوام پکارے گئے۔

کچھ لوگوں نے تو اسے ایک طرح کے انقلاب کا نام ہی دے دیا۔ یعنی خون کا قطرہ بہائے بغیر محض پرچی کے ساتھ مارشل لا سے نجات۔ یہی نہیں۔ لوگوں نے کتنی پرانی چیزوں کو رد کیا۔ پرانی سیاست گری خوار ہوئی۔ جبّے عمامے، پگڑیاں شیروانیاں رد ہوئیں

بلکہ عوامی پاؤں کے نیچے روندی گئیں۔ شرفا کی شرافت کا مول کسی نے نہیں ڈالا۔ ووٹ صرف اُن پارٹیوں کو ملے جنہوں نے عوام کی طاقت پر بھروسہ کیا تھا۔ اور اپنے مانی فسٹو میں محنت کش کو انسان تسلیم کر کے اس کی ضرورتوں کا نام لیا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار لوگوں کو موقع ملا اور انہوں نے اپنی مرضی کا فیصلہ کر ڈالا۔

سات دسمبر ۱۹۷۰ء کی ٹھٹھری صبح کو جین مندر کے پولنگ سٹیشن پر میں نے جو دیکھا وہ کبھی بھولے گا نہیں۔ وہاں میں الیکشن مشین کا ایک مہرہ ہی تھی۔ یعنی PRESIDING OFFICER افسر کا کام کر رہی تھی وہ نظارے زندگی میں پہلی بار ہی دیکھے تھے اور پھر دیکھنے کو حسرت دل میں ہے وہ ایک ملی جلی آبادی کا علاقہ تھا۔ ووٹروں کی قطاروں پہ نگاہ ڈالی تو امرا شرفا کا نام تک نہیں تھا، اور عوام، ہجوم در ہجوم آگے بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح، اپنا فیصلہ دینے کو بے چین اور پر عزم۔ یہ غریب مفلس گھرانوں کی عورتیں تھیں ہڈیوں کے ڈھانچے جسم میلے، بوسیدہ چیتھڑے۔ بچے انگلی لگے۔ گود میں اُٹھائے ہوئے ووٹ ڈالنے کو سویرے ہی آگئی تھیں، ایکدم سے پولنگ سٹیشن کا کمپاؤنڈ بھر گیا مگر وہ چلی آرہی تھیں۔ چلی آرہی تھیں ان کا انت کوئی نہیں تھا۔ کام کرنے والے عملے کا دم گھٹنے لگا۔ مگر ووٹر ووٹ ڈال رہے تھے وہ ہم سب پہ نگاہ بھی نگاہ رکھ رہے تھے آخر سرکاری عملہ دھاندلی کرنے میں ایوب شاہی کے وقتوں سے بدنام رہا ہے۔ مگر اب حالات بڑے فرق ہو چکے تھے ۶۸ - ۱۹۶۴ء سے قطعی مختلف۔ کسی دھاندلی کی ضرورت تھی نہ گنجائش لوگ فیصلہ کر کے آئے تھے اور لوگ ناقابلِ شکست دکھائی دے رہے تھے۔ ڈپٹی کمشنر اور الیکشن کمشنر کتنا ہی با اختیار ہوتا۔ مولوی کتنا ہی جنت دوزخ کے حوالے سے ووٹ مانگتا، قرآن کو بیچ میں لاتا۔ یہ طوفان تھمنے والا نہیں تھا۔ ملا مولوی کو تو پاکستان کے عوام نے کبھی بھیک میں بھی ووٹ نہیں دیا بلکہ یہی موقعہ اس کے لیے رد کیے جانے کا مناسب ترین رہا۔ ۱۹۶۰ء کے الیکشن میں عوام نے ملّا ازم کو قطعی رد کیا۔

اور اب تو بات ہی اور تھی۔ پہلی بار کسی نے انہیں انسان کہہ کر پکار لیا تھا ان کے فیصلے کو اہمیت دی تھی۔ اب یہ لوگ اپنے اختیار سے فیصلہ کر رہے تھے ووٹ دے رہے تھے۔ مگر ان کے تیور بتا رہے تھے کہ جان بھی دے سکتے ہیں یہ لوگ کیا نہیں کر سکتے۔ بے شک میرے وطن کے حالات بدل سکتے ہیں۔ یہ یقین میں نے اسی روز حاصل کیا۔ وہ ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کا دن تھا۔ اور لوگوں نے فیصلہ کر دیا۔ مولوی، چوہدری، جرنیل شاہی افسر شاہی سرمایہ داری، تمن داری سبھی تو ہار گئے۔ سارے ملک میں بنگال تا پنجاب وہی جیتے جنہیں عوام نے پسند کیا۔ منتخب کیا۔ معجزے سے بڑھ کر معجزہ ہوا تھا۔ چوہدری ملک وڈیرے اپنی جاگیروں پر خود اپنے مزارعوں سے ہار گئے۔ ملوں والے اپنے مزدوروں سے۔ اور پیر اپنے مریدوں سے شکست کھا بیٹھے۔

مگر یہ جیت عارضی جیت تھی۔ یہ کوئی انقلاب تو نہ تھا۔ وہ سارے جو الیکشن ہارے تھے۔ ہر چیز کے مالک تھے۔ زمین کارخانے۔ پولیس فوج، قانون عدالت۔ ساری سٹیٹ فورس ان کی تھی۔ اونچی حویلیاں جھونپڑی سے ہاریں تو کیا۔ تجوری تو ان کے اندر تھی۔ اور وہ پرانی ریت کہ زر و زمین کا مالک کسی اور کے فیصلے پسند نہیں کرتا۔ کمی کمین کو تو وہ ان کے گھر کے فیصلے خود نہیں کرنے دیتا۔ باہر کا چوہدری امریکہ خود اس فیصلے پر حیران پریشان بیٹھا تھا۔ اب دونوں زخمی سانپ بس گھول رہے تھے۔ کمیوں نے انہیں ہرا دیا تھا۔ مگر وہ انہیں کچل ڈالنے کی طاقت کے مالک تھے بڑی سے بڑی سازش کرنے کے اہل تھے ابھی۔

ادھر نیا لیڈر بہت ہوشیار اور دلیر تو تھا۔ مگر خود لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اپنے فیوڈل پس منظر کی بنا پر تاریخی عمل کو پورے طور پر سمجھ لینا اور تسلیم کر لینا اس کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ انقلاب کی بات اس کے طبقاتی مفاد سے فوراً ہی متصادم

ہونے لگتی تھی تاریخی عمل کو تسلیم کرنا اس کے بس کی بات اس لیے نہ تھی کہ یہ بات فوراً ہی اس کے طبقاتی مفاد سے متصادم ہونے لگتی۔ تاریخی عمل کو قبول نہ کرتے ہوئے، تاریخ ساز بننے کی کوشش ایسے کردار کا باعث بنی جس میں نئے نئے حیلے ہتھکنڈے آزما کر لوگوں کی حیثیت کٹھ پتلیوں کی بنا دی جاتی ہے۔ تماشا دکھانے والے پھر وہی سٹیٹ کے بلبے ہاتھ۔ بیوروکریسی پولیس اور عوام دشمن قوانین۔ یہ فقط ہمارے ہاں کی بات نہ تھی۔ سامراج کے زیرِ اثر تیسری دنیا کے اکثر لیڈروں کا یہی انداز ہے۔ کہ وہ وقت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو اپنے پیچھے چلا کر بیچ منجھدار چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی تاریخ سازی کے ٹائٹل کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ تاریخ نئے نپولین ہیں۔ اور ردِ انقلاب میں بڑا رول ادا کر رہے ہیں۔

یہی اسی وقت ہمارے ہاں ہوا۔ نئے لیڈر نے رجعت پسندی کی مٹی پر ترقی پسندی کا کھلونا تیار کیا۔ پھر اسے مقبول عام نعروں سے سجایا۔ لوگوں کے مسائل کا ان کی خواہشوں کا اور ان کے خوابوں کا نام لیکر اپنے لیے ووٹ لیے۔ بے شک انہوں نے یہ سب کچھ اپنے اقتدار کی خاطر کیا۔ استحصال کے نظام کو موجود رکھ کر کوئی غریب عوام کو دے بھی کیا سکتا ہے۔ کون دے سکا؟ بھٹو نہ مجیب الرحمان۔

مگر لوگوں کا اُن کے ساتھ چلنا اُس وقت کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ اور لوگ اپنی جگہ سچے تھے۔ انہوں نے اپنے حساب سے ٹھیک فیصلے کئے، سب سے اول انہوں نے مذہب کے بیوپاریوں کو رد کیا۔ روایتی سیاست کی زنجیریں توڑیں۔ پرانی سیاست گری کو خوار و خستہ کیا۔ اور لوگوں نے شخصیتوں کے بت چکنا چور کر کے اس منشور کو ووٹ دے ڈالا جس نے ان کی قوت کو اہمیت کو تسلیم کیا تھا۔ بھلے وہ منشور کسی نے بنایا اور کسی بھی غرض کے لیے۔ مگر اب تو ان کا تھا۔ قوت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ بے شک عوام نے سیاست

کا رنگ بدل ڈالا کبھی تو زندگی کا رنگ بھی گلنار کر دیں گے۔ پاکستان کی تاریخ میں ایک نمائندہ حکومت، ایک جمہوری عمل کے ساتھ، اپنے ووٹ کے ساتھ عوام نے کر آئے ابھی تو انہوں نے اپنا اختیار ووٹ کی پرچی پر ہی لکھا تھا۔ مگر یہ بھی بڑی بات تھی۔ غریب بے وضاعت اور دبے کچلے لوگوں نے پہلی بار سر اُٹھایا اور ایک فیصلہ دے ڈالا۔ یہ فیصلہ بڑے چوہدری کی مرضی کے خلاف تھا۔ سیٹھ کی منشا کے منافی تھا۔ اور ملا کی تو نفی ہو گئی تھی۔ سو قومی اور بین الاقوامی چوہدری بگڑ بیٹھے۔ اور سب نے مل کر لوگوں کے لیے وہی فیصلہ لہو کے گھونٹ بنا دیا۔

ملک کے دونوں حصوں میں سازش پکائی گئی، خانہ جنگی کی کیفیت بنانے کے بعد فوج کشی۔ اس جنگ میں دونوں طرف کے لوگوں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ مگر نقصان عوام کا ہوا۔ عوام نے الیکشن جیت لیا۔ مگر اقتدار تو جرنیلوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کیوں دیتے۔ پھر سیٹھ اور زمین والا بھی ان کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ کچھ دن ٹال مٹول رہی۔ جب انتقال اقتدار کا مطالبہ بڑھا تو انہوں نے بندوقیں اُٹھائیں۔ چڑھائی کر دی۔ "شر پسندوں" کو مار مار ختم کیا۔ باقی جو بچے اُن کے لیے عبرت کا سامان کیا۔ عوام کے نمائندوں کو اقتدار سونپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک شاندار الیکشن کے بعد بھی جمہوریت کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ پورا ایک سال گزرا۔ طویل خلا، اس میں خون کے چھینٹے اُڑتے رہے۔ بارود کی بو پھیلتی رہی جلے ہوئے گاؤں، لمبی لمبی قبریں۔ لٹی عصمتیں۔ بنگال سنہرا، بنگال زخم زخم ٹیس رہا تھا۔ لوگوں نے اتنی بڑی قربانی کس لیے دی ؟

فیصلے کا مہینہ پھر دسمبر تھا۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۱ تک کیا کچھ ہو گیا۔ ہندوستان سے جنگ ہوئی۔ ڈھاکہ فال ہوا۔ دونوں حصے الگ الگ ہو گئے اور دونوں طرف کے عوام ہار گئے۔ فوج کی شکست وقتی طور سے تھی۔ سامراج ایسے ملکوں کی فوجوں کا سربراہ بن چکا ہے۔ جب تک اس کی شکست نہیں ہوتی یہ لشکر عوام کے وطن فتح کرتے رہیں گے۔ اب

اب ایک سال بعد جب دو ملک ہو گئے اور دونوں طرف کے سیاسی قائدین نے حکومتیں بنائیں تو کیا ہوا۔ بنگلہ بندھو لاشوں کے ڈھیر پہ جا بیٹھے اور قائد عوام زخمی لوگوں کے درمیان اکھڑے ہوئے۔ جنگ کے بعد کے سارے مصائب قیدی مہاجر، ٹوٹ پھوٹ، آنسو آہیں بھی کچھ کرچی کرچی تھا۔ مگر وہ جمہوریت کہاں تھی۔؟

عوامی سرکاروں نے کچھ وقت کرچیاں چنیں۔ تھوڑی بہت مرہم پٹی کی مگر پھر وہی کرنا شروع کر دیا جو پہلی سرکاریں کیا کرتی تھیں۔ اپنے کان بند کر لیے اور لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے احکام صادر کیے۔ قوانین بنانے اور بندی خانوں کی توسیع کا کام جاری رکھا۔ مگر خیر، کچھ کام اور بھی شروع ہوئے۔ مشکل یہ تھی کہ سامراجی ان حکومتوں کے ساتھ راضی نہیں تھے۔ تنے ہوئے رسّے پر چلتے چلتے بنگلہ بندھو تو جان دے گئے قائد عوام نے اگرچہ ناراض چوہدریوں کو منا لیا تھا۔ بڑے سیٹھ کی خوشنودی بھی حاصل کر لی تھی۔ ملاؤں کو خوش کرنے کے لیے جتن بہتیرے کیے۔ مگر غریب غربا کو بھی فراموش وہ نہیں کر سکے۔ اگرچہ مجبور تھے، لاچار تھے۔ چوہدریوں وڈیروں نے انہیں گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ اور لوگ۔ ان کے عوام جنہیں کبھی ہمالہ سے بھی اونچے مانا کرتے تھے۔ اب تک اسی طرح کمی کمین، نوکر چاکر بھنگی چوہڑے اور ہاری مزارعے تھے۔ مگر عوامی حکومت انہیں محنت کش پکارتی تھی۔ اور لیڈران کے نام لے کر بلاتا تھا۔ کبھی تو جلسوں میں کرسیوں، صوفوں پر بیٹھے ہوئے شرفا سے توجہ ہٹا کر زمین پر بیٹھی ہوئی مخلوق سے بات کرتے لگتا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ مگر بڑی بات تھی، اور شرفا اسی بات سے نالاں تھے۔ عوام کی خوشی کا تو کیا کہنا ساری تاریخ میں پہلی بار تو یہ ہوا تھا کہ سربراہِ مملکت ان کو اس طرح پکار کر بات کرتا تھا جیسے اپنوں سے کرتے ہیں بس ایک اس بات سے وہ اتنے احسان مند ہوئے کہ ساری بات ہی بھول گئے۔ انہوں نے کھلے دل تسلیم کر لیا کہ حکمران بننے کے بعد قائد عوام کے ہاتھ بندھ گئے ہیں، وہ انہیں روٹی

کپڑا مکان جیسی کوئی شے بھی دے نہیں سکتے۔ نہیں تو یہ سہی یہ چیزیں کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ روٹی کم کھانے کی عادت انہیں صدیوں سے ہے۔ اور چھترے لگا گروہ نسلوں سے جیتے ہیں۔ رہا مکان ٹھکانہ تو انسان کسی طرح بھی جی لیتا ہے۔ جھونپڑی، چھپر خیمہ گھر ہی تو ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ محل دو محلے کہیں دکھائی نہ دیتے۔ انہیں کون تعمیر کرتا۔ یہ سب کچھ تعمیر کرنے والے بے گھر ہی جیتے رہے۔ تھڑ دلی کی بات غریب کبھی نہیں کرتا۔ امیر لوگ تو کمینے ہیں اتنی سی بات کے لیے لڑتے ہیں "چلو جی بڑھنے دو ان کی دولت۔ ہم پھر بھی اپنے قائدِ عوام کے ساتھ ہیں۔ کہ وہ ہمیں اپنا کہتا ہے وہ ہمارا ہے۔ یہی بہت ہے۔"

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ مگر ایک چکر اور چل گیا کہ درمیانہ طبقہ ایک دم عدم تحفظ کا شکار ہو کر ایک دم اپنے قدموں پہ ڈگمگانے لگا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ جاگیردار حکومت کے تحفظ میں تھا خود قائدِ عوام غریبوں سے ملے ہوئے تھے۔ درمیان والے کے ساتھ کون تھا؟ ان کا تحفظ تو اسی صورت میں ہوتا ہے کہ امیروں کا ہاتھ ان کے سر پہ رہے اور خود ان کے پاؤں زمین کی بجائے غریبوں کے ہاتھوں پر ٹکے ہوں۔ اب ہاتھ سے کام کرنے والوں نے اپنے ہاتھ نکال لیے تو یہ ہوا میں معلق ہو کر چیخنے لگے۔ "بھٹو نے چوہڑے چمار سر پہ چڑھا لیے ہیں۔" دراصل زمین پہ قدم رکھتے ہی ان درمیان والوں کا طبقاتی وجود میلا چکٹ ہو جاتا ہے۔ کپڑوں کی سفیدی نہ رہے تو شرفا کی پہچان کیا ہوئی۔ اب اس نئی صورت حال میں، تو غریب بھی اپنے آپ کو انسان سمجھنے لگے۔ انھیں بوکھلا کے رکھ دیا اور نفرت بڑھ گئی۔ غریبوں سے ڈھکی چھپی پرانی نفرت کھل کر سامنے آ گئی اور نئی نفرت قائدِ عوام کے خلاف ان کے دلوں میں پھوٹی۔ یہ بالکل انوکھی صورت حال تھی ورنہ عام حالات میں یہ طبقہ حکمرانوں کا پرستار ہوتا ہے۔ حکمران خواہ کالا چور ہو یا کالا باغ۔ یہ تو پہلی بار ہوا کہ وہ ایک خوبصورت اور ذہین حاکم کے خلاف کھڑی

پکانے میں لگ گئے اور بالآخر بڑی سازش میں جا شریک ہوئے۔ اُس نے حکومت کے دیئے ہوئے گریڈ پلاٹ اور دوسری رعائتیں جو پہلی بار مڈل کلاس کو بخشی گئی تھیں فراموش کر دیئے اور قطعی احسان فراموش ہو گئے۔ اس نفرت کا سبب غریب لوگ تھے مگر نشانہ قائدِ عوام کو بننا پڑا۔ اور آگے چل کر جیسے کہ دیکھا گیا ساری ہنگامہ آرائی کا مقصد فقط اشارہ گیا کہ ایک سبق اُس میں سے نکل سکتا ہے۔ کہ آدمی یا تو صاحب اقتدار ہو جائے۔ یا قائدِ عوام رہے عوام کا قائد جب تک اپنی جون بدل نہ ڈالے اپنی پہچان ختم نہ کرے حکومت کے اعلیٰ مناصب پر برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی نہیں کرتا۔ مڈل کلاسیئے کرتے ہیں، نہ سی آئی اے والے اور کون برداشت کیا گیا! الاندے نہ بھٹو۔ دیکھا جائے تو یہ عجب طرح کی لڑائی تھی۔ اس میں ملک و ملت کی بات بھی کم اُٹھائی گئی۔

تاہم۔ کچھ مسائل قائدِ عوام نے پیدا بھی کیئے۔ انہوں نے غریب امیر کی متوقع جنگ کی روک تھام کے لیے تو بہت سے اقدام کر ڈالے۔ مگر متوسط طبقے کی شرافت اور غریبوں کی دست برد کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہ رکھی۔ نچلے طبقے میں جو بیداری اور جرأت پیدا ہوئی تھی اس کے نتائج متوسط طبقے تک فوری پہنچے جبکہ اوپر والوں کو کوئی فرق ہی نہ پڑا۔ اُوپر والے طبقے کی بات یوں بھی دوسری ہے۔ ایک تو وہ اتنا زود رنج اور زود اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے اتنی بلندیوں پر بیٹھا ہوتا ہے کہ چڑیوں کی اڑائی ہوئی گرد وہاں تک نہیں پہنچتی۔ پھر وہ چھوٹا موٹا کینہ کیوں پالیں۔ ان کے ہاتھ لمبے ہیں اور پاؤں فولادی۔ جب جی چاہے۔ جس کو چاہے کچل سکتے ہیں۔ جب کچل سکتا ہے تو کینہ کیوں پالے۔ زیادہ قوت اور بے پناہ اختیارات اس طبقے کو بڑے دل کا بنا دیتے ہیں۔ اس بڑے دل کے ساتھ کمی کمین کی سرپرستی بھی کر لیتا ہے اور پیٹھ بھی ٹھپک دیتا ہے۔ کبھی تو مائی باپ بن جاتا ہے کبھی رہبر فرزانہ۔ مگر درمیان کا آدمی اِس بڑے پن، سے محروم ہو کر بہت گھٹیا اور

کمینہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ہونے پہ آجائے تو۔

اور یہ ہوا۔ لیکن کچھ اور بھی ہوا۔ محنت کرنے والے مخلوق کو اپنی حیثیت اور اہمیت کا شعور آگیا تھا۔ اب وہ کسی نکمے۔ بیٹھ کر کھانے والے یا چٹے کپڑے پہن کر اترانے والے کو بڑا آدمی ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ان حالات کے ساتھ سیٹھوں کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوا۔ عوامی حکومت نے بے شک مزدوروں پہ گولیاں چلائیں مگر ٹریڈ یونین ازم زورا زور چلا۔ اور کئی قسم کے حقوق مزدور کو دلواتا رہا۔ یہی باتیں سرمایہ دار کے لیے کسی انقلاب سے کم نہ تھیں۔ وہ تو خواب میں فوجی راج کی تمنا کرتے تھے۔ وہ زمانے جب ملک منافع خوروں کی جنت بنا ہوا تھا۔ اور ملک کا محنت کش انسان کے زمرے سے خارج تھا۔ اب ملاں فیوڈل سرمایہ دار اور درمیان والا ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ عوامی حکومت سے بے شمار مراعات پا کر بھی ناراض تھے۔

اسطرح کی صورت حال تھی جب نئے الیکشن کا اعلان ہوا۔ گویا جمہوریت اب پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہو رہی تھی۔ یہ الیکشن بڑا اہم اور اپنی نوعیت کا تھا کہ ایک سیول اور نمائندہ حکومت کی طرف سے کروایا جا رہا تھا۔ جمہوریت کی کھیتی میں کچھ ہریالی پھوٹ رہی تھی۔ حزب اختلاف نے بڑا زور دکھایا۔ کوئی درجن بھر پارٹیاں خم ٹھوک کر سامنے آگئیں۔ بلکہ انہوں نے پاؤں میں اتحادِ باہمی کی زنجیر باندھ لی۔ کہ مقابلے کے وقت کوئی بھاگ نہ سکے۔ حکومت کی مخالفت کا جذبہ تیز تھا۔ جمہوری قدروں کا احترام بہت کم۔ لیکن عجب چکر تھا کہ دائیں بازو، بائیں بازو، اعتدال پسند، انتہا پسند، مذہب کے جنونی اور سیکولر خیالات والے آپس میں جڑے تو نہیں۔ مگر ایک ڈوری میں تو بندھ گئے۔ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جلسے جلوس ہونے لگے۔ دونوں طرف کے لیڈر چیخیے چنگھاڑے۔ دھمکیوں اور گالیوں پہ اُتر آئے۔ مگر یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ابھی اتنی تہذیب کہاں۔ مگر جو نہیں تھا

وہ یہ کہ لوگوں کے لیے دونوں کے پاس کوئی وعدہ نہیں تھا۔ فقط اور فقط مقصد تھا ایک دوسرے کو پچھاڑنے اور مسند پر قبضے کا۔ حکومت اپنی جگہ قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اپنے جاگیردار طبقے کو بڑے پیمانے پر الیکٹ کروا کر اسمبلیوں میں لانے کا اہتمام تھا۔ حزب اختلاف کا رائٹ ونگ تاجروں اور صنعت کاروں کے ساتھ ملا ہوا تھا اور لفٹ والا اُس وقت دھوبی کا کتا بن چکا تھا۔ عوام کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ اس پر بھی پاکستان کے عوام نے بہت سمجھداری کے ساتھ سب کو دیکھا، سب کو سُنا اور اپنا فیصلہ محفوظ رکھا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک رہے یا اس کی جگہ دوسرا آجائے PNA اور PPP ذات گوت تو دونوں کی ایک تھی۔ چلن کا فرق بھی کم ہی تھا۔ ایک ہے کہ استحصال کے عمل کو اصول فطرت سمجھ کر روا رکھتا ہے۔ دوسرا مٹی سے موتی نکال کر دینے والی مخلوق کی طاقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی اپنے ہی مفاد کے طابع رکھنا چاہتا ہے۔ یوں حزب اختلاف اور اقتدار میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ خوش فہمی یہی تھی کہ عوام اس کے ساتھ ہیں۔ دونوں فریقوں نے ایک غلطی بھی کی کہ اپنا ہلا گلا کرنے سے پیشتر کسی پہنچے ہوئے سے فال نہیں نکلوائی کہ وہ سال جمہوریت کے لیے اچھا بھی تھا کہ نہیں۔ خود ہمسایہ ملک کی اتنی بڑی جمہوریت کو اس سال گہن لگا ہوا تھا۔ وہاں ایمرجنسی لاگو تھی اور دستور زباں بندی نہ ہونے کے باوجود بندی خانوں میں رونق بے حساب بڑھ چکی تھی۔ تاہم۔ ہمارے ہاں جمہوری عمل زوروں پہ رہا۔ حکومت نے حزب اختلاف کے حملوں کو بڑی گریس اور بُردباری سے برداشت کیا۔ اگرچہ وہ حملے جمہوری نہیں تھے۔ محض گالی گلوچ ہی تھا۔ PNA کا سالار تو ملّاں تھا۔ ہر قسم کا مُلّا جماعت والا جمعیت والا فقہ والا حدیث والا فتوے والا تبلیغ والا اب میدانِ سیاست میں تھا۔ عوام کا دشمن اور رتھانڈ عوام کا دیری مگر دوٹ مانگ رہا تھا رب رسولؐ کے نام پہ اور کچھ اور ناموں پر بھی۔ یہ سب کے سب ۱۹۷۰ء میں

میں بُری طرح ہار چکے تھے۔ لیکن اب تو ان کے سر پہ دو سائے تھے۔ امریکہ اور سعودی عرب۔ اِن لوگوں کو الیکشن کے ذریعہ عرب امپیریلزم نافذ کرنا تھا۔ ہاتھ کاٹنے۔ گردنیں تراشنے اور عورتوں کو محض کھیتیاں اور لونڈیاں بنانے کے لیئے حکومت چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عوام اور عورتوں کا ووٹ ان کے لیے نہیں تھا۔ یعنی ننانوے پوائنٹ نائین فی صد ووٹ ان کے لیے نہیں تھا۔

۷ مارچ ۱۹۷۷ء کی صبح بہار کے موسم کی صبح تھی، جب سبز رنگ کے ڈبوں میں پرچیاں ڈالنے کا عمل شروع ہوا تھا۔ چھ سال بعد لوگ پھر ووٹ ڈالنے کو نکلے تھے۔ چھ سال بعد، ایک بار پھر میں نے ووٹروں پر نگاہ ڈالی۔ ارے یہ تو وہی لوگ تھے جنہیں ۱۹۷۰ء میں دیکھا تھا۔ وہی نقشہ تھا، وہ اس قدر آباد نہ تھا، جوش و خروش کی کمی تھی چہرے خاموش۔ لیکن تعداد پوری۔ میری ڈیوٹی کا حلقہ گو مختلف تھا۔ مگر حالات ویسے ہی تھے۔ کینال پارک کی کچی بستی غریب محلہ اور بہت امیر کوٹھیاں ایک ہی لسٹ پر درج تھیں۔ ایک پولنگ سٹیشن پر قطار میں لگنا تھا سے

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز!

بس اِس حد تک جمہوریت ضرور تھی۔ لیکن نہیں۔ جناب محمود و ایاز اکٹھے نہیں ہوتے ہوتے بھی کیا کوئی تناسب ہی نہیں تھا۔ سترہ کنال کی وسیع کوٹھی سے ووٹ نکلے تین اور اتنے کنال کی کچی بستی سے ایک ہزار۔ اس وقت میں نے سوچا اگر ووٹوں کے حساب سے بستیوں کو حقوق بانٹے جائیں تو ہمارے اکثر مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں۔ اُس وقت سمجھنے کی بات جو میں نے سمجھی وہ اتنی تھی کہ ۱۹۷۰ء سے لیکر ۱۹۷۷ء تک کیا کچھ نہ ہوا۔ مگر ہمارے ووٹر کے صرف جذبات میں افسردگی آئی تھی۔ باقی حالات وہی تھے۔ کوائف اسی طرح تھے۔ اکثریت کے چہرے ستے ہوئے۔ بال میلے اُلجھے ہوئے۔ پاؤں ننگے یا سلیپر پھٹے ہوئے۔ قطاروں میں لگی ہوئی عورتیں۔ جیسے غلاموں کی کھیپ بیگار پر جا رہی ہو

گود میں اٹھائے انگلی لگے ہڈیوں کے ڈھانچے۔ ریں ریں کرتے روگی بچے ساتھ لیے شیداں برکتے بسو، گلاب جان، سکینہ، نوراں اور ایسی سینکڑوں ہزاروں عورتیں۔ کچی بستی اور گندے نالے کے کناروں سے اُبھر کر اپنا جمہوری حق استعمال کرنے آئی تھیں۔ ان کا کسی سے جھگڑا نہیں تھا۔ کسی سے کوئی اُمید نہ رقابت۔ جس حال میں ہیں اِسی میں رہنے دیا جانے اُن کی بستیوں پر بُل ڈوزر نہ چلائے جائیں۔ چھابڑی ٹیکس نہ لگے۔ ریڑھی کھڑی کرنے کی اجازت دی جائے۔ گلاب جان کو سکول میں مائی کی جگہ مل جائے۔ شیداں کو کوٹھا چھتنے کے لیے چپہ بھر زمین چاہیئے۔ بسو کا بیٹا میٹرک پاس کیئے بیکار بیٹھا ہے۔ کوئی لیڈر سفارش کر دے تو دفتری کی نوکری مل جائے۔ یا پِل میں مزدوری۔ بس ایسے ہی مسائل تھے۔ ان کے اور ایسے ہی کام۔ جمہوریت کیا ہوتی ہے؟ آمریت کے کیا معنی ہیں؟ ان دونوں کا فرق یہ کیا جانیں، کتابوں میں لکھا تو یہ پڑھتے نہیں۔ تجربے سے جاننے کا وقت ابھی آیا کہاں۔ مگر یہ لوگ ووٹ دینے نکل آئے تھے اور فیصلہ بھی اُنھیں کو کرنا تھا۔ یہ فیصلہ ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ہر چند کہ جاہل کہلاتے ہیں۔ مگر فریب نہیں کھاتے۔ محبت اور نفرت کا ہلکا سا فرق بھی پہچان جاتے ہیں ان لوگوں کو ہرگز ووٹ نہیں دیتے جو اللہ رسولؐ کا نام بیچ کر اقتدار کا سودا کرتے ہیں۔ اس آدمی کو پوجنے لگتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو ان کا قائد بتاتا ہے۔ ان سے انہیں کے نام پر ووٹ مانگتا ہے۔ اپنا محل چھوڑ کر کچھ دیر ان کی بستیوں میں آنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ان کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ مگر انہیں انسان مانتا ہے۔

ان باریکیوں کا یہ بھولی بیگمات کیا جانیں جو لنچ کے بعد ووٹ ڈالنے نکلتی ہیں بہت لمبی گاڑی پر بہت اچھی خوشبو لگا کر۔ اس اُمید پر کہ اب گندے لوگوں کا ہجوم چھٹ گیا ہوگا۔ لیکن اگر وہ ہجوم انہیں دکھائی دے جائے تو فوراً ناک پہ رومال جمال لیتی ہیں۔ اور الگ تھلگ کھڑی بے بس ہو کے پولیس کا انتظار

کرتی ہیں۔ کہ وہ گندے لوگوں کی قطار سے الگ کسی راستے سے اندر لے جائے۔ پھر گھر جا کر یہ بیبیاں اس بات پر حیران ہوتے نہیں تھیں کہ وہ کمتر لوگ مذہب سے اتنے بیگانے کیوں ہیں۔ رب رسولؐ کے نام پر ووٹ ڈالنے کی بجائے سوشلزم والوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ویسے الیکشنوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان بھولی بیگمات کے علم وعرفان میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہو کر رہتا ہے۔ ان کی یہ حیرت کہ اللہ میاں نے اتنے سارے غریب کیوں پیدا کر رکھے ہیں؟ اُس وقت دور ہو جاتی ہے۔ جب وہ گارے کیچڑ سے اٹا اٹ گلیوں میں بادلِ نخواستہ محبتِ رسولؐ کی خاطر شوہروں اور بھائیوں کے لیے ووٹ مانگنے جاتی ہیں۔ مگر ان پیاری خواتین نے میری حیرت میں کئی بار بے پناہ اضافہ کیا، جب وہ خود دین کی بجائے جمہوریت کے لیے ووٹ دینے نکلیں۔ اور بہتر جمہوریت کی خاطر ہی انھوں نے ۱۹۷۷ء میں تحریک چلاتے ہوئے۔ بالآخر مارشل لاء کو خوش آمدید کہہ دیا۔

اس وقت تو ہماری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی تھی کہ آخر وہ کونسے شہری حقوق ہیں جن کی کمی اُنہیں لاحق ہوگئی ہے۔ یہ پیدائشی طور پر ہر قسم کے حقوق کے مالک ہوتے ہیں۔ ملک میں جو بھی طرز حکومت ہو سیاہ سفید تو ان ہی رہتا ہے مگر جیسے کہ پہلے وضاحت ہوئی، یہ لوگ آپس میں لڑ بیٹھے تھے۔ اختیارات کی تقسیم پر ہی ان کا جھگڑا ہوا تھا۔ اب یہ بات ان سے کون پوچھے کہ آپس کی بانٹ تقسیم کے معاملے میں اللہ رسولؐ کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت۔ آپس میں لڑتے مرتے رہو۔ جیسے پرانے بادشاہ کرتے تھے۔ اور اگر وڈروں سے کام لینا ہی ہے تو ان کے لیے اپنی نفرت تو کم کرو۔ ڈرانے دھمکانے سے تو کسی کا چانس نہیں بنتا۔ آخر کو ہمارے ہاں اتنی جمہوریت تو ہے کہ بڑے چھوٹے ہر کسی کا ووٹ ایک ہی گنا جاتا ہے۔ ویسے بڑوں کا ایک پر ہزار بھی گن لیا جائے تو بھی جیتے گا وہی جیسے

غریب عزبا نوازیں گے۔ پی این اے والوں نے اپنا پولنگ نشان ہل کو رکھا۔ اور بیگمات زیادہ اسی کو ووٹ دینے آئیں۔ کیونکہ عوام مخالف اتحاد تھا مگر مزے کی بات رہی، وہ بیچاریاں کاروں سے اُتر کر بمشکل تمام اپنی اُونچی ایڑیوں پر چلتیں پولنگ بوتھ تک آئیں اور پھر اپنی مرصّع انگشتریوں سے بوجھل اُنگلیوں میں سنبھال کر مُہر اُس نشان پر لگاتیں جو اُنھوں نے اصلی حالت میں کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ خبر تک نہ تھی کہ چیز جس کے سامنے ہل لکھا ہوا ہے۔ کس کام آتی ہے کندھے پر رکھی جاتی ہے یا زمین پر۔ اُس کی سیدھ کونسی ہے اور الٹ کونسی۔ لکڑی سے بنتا ہے یا دھات سے۔ ویسے ہل کی وہ تصویر بھی ایک مذاق ہی تھا۔ سرمایہ دار دل نے انتخابی نشان ہل رکھا کسان کو دھوکہ دینے کے لیے۔ مگر کسی ٹھیٹھ شہری آرٹسٹ نے اُڑتی چیل جیسی بنا دی۔ کسان آدمی اور عورتیں وہ تصویر پرچی پر دیکھ کر محظوظ تو ہوتے ہوں گے یا نہ ہوتے ہوں گے۔ یہ تو خیر دل لگی کی بات تھی۔ ویسے دل لگی کی باتیں الیکشن کے دنوں میں اور بھی کتنی ساری ہوئیں۔ جنہیں مزے لے لے کر سنانے کا موقع ہی نہ ملا۔ کہ دوسرے ہی دن یعنی ابھی صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن جاری تھے۔ جب دھاندلی دھاندلی!! بائیکاٹ بائیکاٹ!! کا شور اُٹھا۔ اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے الیکشن کے ساتھ ساتھ یہ تیاری بھی جاری تھی۔ PNA ایک دم سے تخریب کاری پر اُتر آئی۔ اور پھر تو چل سو چل۔ بائیکاٹ اس وقت کیا گیا جب ہارنے والوں کو اپنی ہار کا یقین ہوا۔ لوگوں نے ووٹ پھر سے ملّاں کے خلاف دیدیا تمام عورتوں نے اور محنت کشوں نے ووٹ اُدھر ہی دیا جدھر کچھ نہیں تھا۔ مگر ملّا بھی نہیں تھا۔ یہ موقع تھا جب پتہ چلا کہ پاکستان کے عوام بہت سمجھدار اور بالغ نظر ہیں۔ مانا کہ اب قائد عوام کے پاس اُن کے لیے کوئی وعدہ بھی نہیں تھا۔ اور حزبِ اختلاف نے بس اسی بات پر اپنے

آپ کو عوام کے ووٹ کا حقدار بنا لیا تھا۔ اب مایوس ہو کر اُنہوں نے فیصلہ کیا "نہ کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے۔" یہ الیکشن بھی ۱۹۷۰ء کے الیکشنوں کی طرح پھل ہوتے دکھائی نہ دیئے۔ بائیکاٹ ہنگامے اور مار دھاڑ سے بھرپور کارروائی فوراً شروع ہو گئی۔ طبقاتی جنگ کی مخالفت اور امن کی بات کرنے والوں نے نورا اور تشدد کیا گھیراؤ جلاؤ کا کام مذہبی پارٹیوں نے کیا اور ہڑتالیں اُن سرمایہ داروں نے کرائیں، جن کا ہڑتالوں کے نام پر دل ہول جاتا کرتا ہے۔
حسب دستور اُدھر یعنی حکمرانوں کی جانب سے بھی جواب ملا۔ لاٹھی چلی، گولی چلی ٹینک نکل آئے۔ گلیاں سڑکیں گلنار ہوتے لگیں۔ یہ لہو متوسط طبقے کے جوانوں کا تھا۔ جو مذہب کے نام پر قربانی کے لیے بھڑکائے گئے تھے اور خود سینہ کھول کر پولیس کی گولی کے سامنے تن جاتے۔ بوڑھے لیڈر اور مفتی خود تو ہاتھی کے ہودے میں بیٹھ کر کمان کرتے۔ پیچھے سیٹھ لوگ کوٹھیوں میں بیٹھے پروگرام دیتے رہتے۔ بات جو الیکشن میں دھاندلی سے شروع ہوئی تھی۔ شریعت تک پہنچی اور پھر نظام مصطفیٰؐ پر آ کر یکی ہو گئی۔ ویسے یہ پروگرام راتوں رات بنتا تھا۔ الیکشن شروع ہونے تک ان کا نعرہ اور پروگرام جمہوریت ہی تھا۔ اب جمہوریت کے سوا بھی کچھ تھا۔ غصہ تو عوام پر تھا۔ انھوں نے ووٹ ان کو ڈالا نہیں۔ اب بھگتنے کو قائد عوام تھے کہ جنہوں نچلے درجے کے لوگوں کو سر پر چڑھا یا تھا۔ اب ظلم روا رکھنے والے خود ظلم کی داستانیں سُنا رہے تھے۔ وہ ظلم جو جمہوریت کے چند برسوں میں اُن پر ہوئے اور وہ بھی جو آئندہ ہونے والے تھے۔

پہلی بار بہت لمبی تاریخ میں (جو بے شک ظلم کی تاریخ ہے) شرفا کی دُنیا میں ظلم کا احساس کیا گیا، اور ایک حکومت کو ظالم قرار دے کر باقاعدہ تحریک چلائی گئی۔ بظاہر یہ ایک امید افزا بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حیران کُن۔ اس لیئے کہ وہ

طبقہ جو خود بھی ظلم روا رکھتا ہے۔ اور ظلم کو بجا بھی سمجھتا ہے۔ اور حکومتوں کے
رویئے کو الہام کا درجہ دیا کرتا ہے۔ ظلم کے قوانین اور سٹیٹ مشین کو آسمانی
احکامات کے برابر رکھتا ہے، اب نہ صرف نکتہ چیں تھا، بلکہ وہ تو برسرپیکار
تھا۔ بہت سخت حیرت کی بات تھی۔ یہ لوگ مارشل لاء کے تمام مظالم کی حمایت
کروانے والے تھے، اور اب جمہوری حکومت کی اصلاحات بھی ظلم کے برابر دکھائی
دے رہی تھیں۔ جمہوری حکومت میں کون کون تھا؟ وہ بھی اسی طرح کے بلکہ
اُنھیں میں سے تھے۔ یعنی ایک ہی تنے کے دو شاخے۔ مگر ان میں سے جو اقتدار پر
قابض تھا، وہ ظالم ٹھہرا اور جو اقتدار کی خواہش میں نڈھال ہو رہا تھا وہ اپنے
آپ کو مظلوم پکارنے لگا۔ بہانہ جو کام آگیا، وہ جمہوریت کی بحالی تھی۔ مگر بحالی
جمہوریت کے پروگرام میں اور کچھ نہیں تھا۔ بس ایک آدمی کو اقتدار سے ہٹا کر اپنی
حکومت بنانا تھا۔

کئی ہفتے مہینے تحریک چلتی رہی، اس تحریک کے لیڈر ملاں مفتی تھے، فنانسر
صنعت کار اور تاجر اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے طالب علم اس کے پہیئے بنے
رہے۔ ویسے تو صحافی کا ایکشن بھی قابل توجہ ہے۔ آگے پیچھے پاکستان کے صحافی
لوگ کسی ظلم کرنے والے اور ظلم سہنے والے طبقے کی بات نہیں اُٹھاتے۔ سب کچھ ٹھیک
ٹھاک ہی دیکھتے ہیں، سوائے کچھ تھوڑی انفرادی خرابی کے۔ جو ایک ذاتی معاملہ
ہوتا ہے (بقول ان کے) مگر اب اس ظلم کے خلاف جو عوام کے ووٹ والی حکومت
نے سرمایہ دار اور تاجر طبقے پر روا رکھا، بیوروکریسی پہ ڈھایا، صحافی سمیت بھی نے
بڑا محاذ کھول رکھا تھا۔ اس محاذ کی جدوجہد کیا تھی صحافی گالیاں لکھ رہا تھا اور
نظام مصطفیٰ والے شاہراہوں کی بتیاں توڑنے اور بنک جلانے میں لگے تھے۔
حالانکہ بجلی کے قمقموں سے ان کے گھر خوب روشن تھے اور بنکوں میں کھاتے بھی

انہیں کے کھلے ہوئے تھے۔

خوشحال اور خوش بخت لوگوں کا ظلم کے خلاف کھڑے ہونا یا مظلوم لوگوں کا ساتھ دینا ایک اچھی بات ہے۔ لیکن اُن طبقات نے جو ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں ہارنے کے بعد ظلم ظلم پکارنے لگے کبھی کسی ظلم کرنے والے کا ہاتھ نہیں روکا۔ کبھی کسی مظلوم کا احساس نہیں پالا۔ یہاں تو روم جل بھی رہا ہو تو بھی نیرو بانسری بجاتا ہے اور مولوی اپنا حلوہ مانڈا پورا رکھتے ہیں۔ دانشوروں کا حال بھی اچھا نہیں، اُنھوں نے ابھی تک زندگی سے تعارف حاصل کیا نہیں۔ اور سرکاروں کو خوش رکھنا ان کی ترجیح رہی ہے۔ کیونکہ اس طرح دانہ پانی سہل رہتا ہے۔ مگر اب آ کر یہ سب ایکدم باشعور باضمیر اور باخبر سبھی کچھ ہو گئے۔ اُن میں ایکدم سیاسی سوجھ بوجھ آ گئی۔ باہر والوں کو شاید ساری بات کا پتہ نہ ہو۔ لیکن گھر کے بھیدی تو جانتے ہیں کہ پچھلے چند برسوں کے اندر یہاں صدیوں کے حالات میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی تھی۔ ظلم کے جلتے الاؤ میں ایندھن اس طور سے پھینکا گیا کہ اُڑ کر چند چنگاریاں اُن گھروں تک بھی گئیں جن کی دیواریں اُونچی اور چھتیں پکی ہوتی ہیں۔ پھر کچھ کمی اُونچی دیوار والوں کے احترام میں بھی ہوئی۔ وہ اس طرح کہ خدمت گار اور "کمی" ان کے گھروں کا گند تو ہمیشہ کی طرح صاف کرتے ہی تھے۔ مگر وہ پہلے والی انکساری نہیں دکھاتے۔ ان کے بوٹ پالش کرتے وقت "بسم اللہ" کہنے کی بجائے کچھ ناک بھوں چڑھانے لگتے تھے۔ انہیں دُنیا کی ہوا جو لگ گئی تھی۔ مگر مالک لوگ دُنیا کی ہوا کو دیکھنے کی بجائے الزام کے پتھر بیچاری عوامی حکومت کو مارنے لگے۔ شرفا کی محفلوں اور مجلسوں میں اس قسم کے جملے عام طور پر سنے جاتے تھے۔ "اِس دور میں "کمی کمین" سر پہ چڑھ گئے ہیں۔ شریفوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ سارا قصور جمہوریت کا ہے۔ بھٹو نے انسانیت، کو نقصان پہنچایا ہے۔" اُسے سزا ملنی چاہیئے۔ الیکشن کروانے ہی

نہیں چاہئیں ۔"

پھر جب کھلا تصادم ہوا تو سبھی دانت پیس کر اسمبلیوں پر جھپٹے قومی، نہ صوبائی کسی اسمبلی کا اجلاس ہونے نہیں دیں گے۔ اُدھر حکومت نے جمہوریت کی فاختہ کو بچانے کے لیے اپنی پولیس نکال لی۔ سڑکوں کی جنگ میں دو چار لاٹھیاں کھانے کے بعد جمہوریت کے پرستاروں نے فوج کو پکارنا شروع کر دیا کہ وہ آئے اور مارشل لاء لگا دے۔ یہاں کئی باتیں بہت غور طلب ہیں۔ یعنی جب امن بچانے کے لیے۔ قانون کی بالا دستی بحال کرنے اور انتظامیہ کی مدد کے لیے چند شہروں میں فوج نے اپنی صورت دکھائی تو سارے شرفا وکلاء، جج صاحبان۔ معزز شہری اور دانشور، جمہوری اور آئینی قدروں کی پامالی پر دہائی دے اُٹھے۔ ایکدم فوج کے خلاف بولنے لگے۔ وہی فوج جس کے پچھلے مظالم پر یہ خود پردہ پوشی کرتے تھے، اب ایک دم ظالم فوج ہو گئی۔ تب انہیں وہ سارے مظالم یاد آئے جو فوج نے مشرقی پاکستان پر کیے تھے اور بلوچستان پر بھی روا رکھے۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد جب اصلی اور بڑے مارشل لاء کا اعلان ہوا تو سب جمہوریت پسند حزبِ اختلاف فاضل وکلاء، عزتِ مآب اور قانون کے رکھوالے، جج صاحبان اور معزز شہری یہ گیت گاتے سنائی دیئے مارشل لا تیرا شکریہ۔ امریکہ تیری مہربانی، جمہوریت کا تختہ اُلٹ جانے پر یوم نجات منایا گیا۔ عدالت عالیہ جس نے چند ماہ پیشتر جزوی مارشل لاء کے خلاف فیصلہ دیکر اپنے کچھ دھونے دھو لیئے تھے، اب کلی مارشل لا کو جائز اور ضروری قرار دینے کے لیے نظریہ ضرورت گھڑنے پر مجبور ہوئی۔

اس سارے ہنگامے میں اب تک غریب غربا بالکل خاموش اور بظاہر لاتعلق سے دکھائی دیتے رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ ان کی جنگ نہیں تھی

نہ ہی لڑانے والوں میں سے کوئی ان کی طرف کا تھا۔ زردوانے اور زمین والے آپس میں لڑ بانٹ رہے تھے۔ مگر پھر بھی اِس مضحکہ خیز صورتِ حال کو لوگوں نے اچھی طرح دیکھا اور سمجھا تھا۔ اس بات کا پتہ اُس وقت چلا جب الیکشن کے فوجی اعلان کے بعد، محنت کشوں نے بڑے بڑے جلسے کر کے اپنی طاقت کا پتہ دیا اور واضح کیا کہ ان کا ووٹ پھر اسی پارٹی کے لیئے ہوگا۔ جس کی حکومت کو توڑا گیا تھا۔ بقراطوں نے عوام کے اس رویئے کو سمجھنے میں بھاری غلطی کی۔ اور بے معنی جواز ڈھونڈنے شروع کردیئے۔ لیکن حقیقتِ حال کو قریب سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ہاں کی سیاست میں عام لوگوں کے اجتماعی فیصلے اور رویئے کبھی بلا وجہ نہیں ہوتے۔ اس وقت بھی۔ ہر چند کہ عوامی حکومت کو لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ مگر انہوں نے ساتھ ہی ملّاں اور سیٹھ کی نئی بھگت کو بھی سمجھا تھا۔ جمہوریت کے ولدادے بھی پہنچانے گئے تھے۔ کہ یہ مرغی جب تک ان کے لیے سونے کا انڈا دیتی ہے۔ یہ اس کی حفاظت دل وجان سے کریں گے کانٹا بھی چبھ جائے تو سارے ملک میں فساد برپا کر کے رکھ دیں۔ لیکن اگر یہ انڈے کسی دوسرے کے کام آنے لگیں تو سالم کی سالم روسٹ کر کے ضیافت اڑا جائیں

یہی انھوں نے اس وقت کیا۔ یعنی ایک طرف تو وہ منتخب سیول حکومت کے آمرانہ رویوں کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ الیکشن میں ذرا سے گھپلے کو جمہوریت کی صحت کے لیئے مُضر اقرار دیتے پھرے۔ دوسری طرف جب منتخب حکومت کا تختہ اُلٹ کر مارشل لا، کی لعنت ملک پر مسلط ہوئی۔ تو انھوں نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ پستے بادام کے زردے کی دیگیں پکوا کر اُن غریبوں میں بانٹنے لگے، جن کی نفرت میں جل جل کر راکھ ہوتے رہتے ہیں۔ دراصل مڈل کلاسیوں کی سیاست میں نفرت ہی ایک بنیاد تھی اسی بنیاد پہ سارے شرفاء کا اتحاد بنا تھا اور ساری تحریک میں جمہوریت اور نظام

مصطفیٰ محض بہانے تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ عوامی حکومت کی کسی غلط پالیسی کی نشاندہی نہ کی گئی۔ کوئی تجزیہ جو ٹھوس بنیادوں پر کیا گیا ہو سامنے نہ آیا۔ بس ہلاگلا گھیراؤ جلاؤ اور ظلم ظلم کے مبہم الفاظ نعروں کی صورت میں برستے رہے۔ یا پھر وزیراعظم بھٹو کی ذات اور خاندان پر کیچڑ اچھالا گیا۔ یعنی زرد صحافت کا آغاز بھی کچھ شرلیفوں نے کیا۔

عوام ان ساری باتوں کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے مارشل لاء کے زیرسایہ بیٹھنے والوں کو زچ کرنے کا فیصلہ دل ہی دل میں پکا کر لیا۔ اب ذرا مارشل لاء کو دیکھیں جو قومی اتحاد کی جمہوری تحریک کا پھل تھا۔ پرانے وقتوں میں تو سُنا تھا کہ مارشل لا جمہوریت کا قاتل ہوتا ہے۔ لیکن اس دور میں آکر نوائے وقت کے اداریوں نے بتانا شروع کیا مارشل لاء ہی جمہوریت کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اس بات کی اصلیت تو آنے والے وقتوں میں کھلے گی۔ لیکن ہماری تاریخ میں مارشل لاء بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ اور جمہوریت کے دن بہت کم رہے۔ سلسلہ وار دیکھیں تو پانچویں دہائی سے لیکر ساتویں دہائی تک مارشل لاء ہی مارشل لاء نظر آتے ہیں۔ بڑے چھوٹے۔ جزوی کلی سب ملا کر اس شہر بے مثال میں پانچواں، سوہنے دیس پنجاب میں چوتھا اور آل پاکستان لیول پر دیکھیں تو تیسرا بڑا مارشل لاء ہے۔ اب ہم مارشل لا سے مانوس ہو گئے ہیں اور جمہوریت کے مستقبل سے مایوس۔ پرانی نئی اور درمیانی نسلوں کو جمہوریت سے کم اور مارشل لا سے وسیع جان پہچان ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں کے انداز اور کردار بھی غیر جمہوری ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بار بار دہرائے جانے سے مارشل لائی کلچر پیدا ہو رہا ہے۔ تشدد توہین اور چھینا جھپٹی کے رجحانات پاکستانی معاشرے میں بہت بڑھ گئے ہیں اور جمہوریت کی جڑوں کے لیے زمین دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔

سوم جولائی ۱۹۷۷ء کی رات جب امریکہ اپنی آزادی کی سالگرہ کا جشن منا رہا تھا۔ ہمارے شہروں پہ مارشل لاء کی رات اُتر آئی۔ عام خیال یہی ہے کہ ہمارے ملک میں مارشل لاء لگواتے رہنا اسی بڑی طاقت کا کام ہے۔ ایک کے بعد ایک جرنیل میدان میں لا کر عوام کے ساتھ اُن کا میچ ڈلوانا اور خود مزے کرنا ہی اس کا کام ہے۔ ہوگا۔ لیکن اب کی بار صورتِ حال مختلف رہی۔ ایک تو اب کی بار جب مارشل لاء لگا تو مشرقی پاکستان ساتھ نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ لوگوں کو شکست خوردہ فوج سے اب اس طرح کی اُمید نہیں تھی۔ ویسے کچھ انداز بھی ایسے ہی لگے۔ کہ آتے کے ساتھ انہوں نے پھر الیکشن کی راگنی چھیڑ دی۔ شہر کی گلیاں صاف کرانے کی حد تک بھی ہاتھ نہیں ہلایا۔ فوراً کمیشن بٹھا کر الیکشن کروانے کا انتظام کرنے لگے۔ بڑے جرنیل نے کوئی نیا لقب اختیار نہیں کیا۔ بس ۹۰ دن کا پروگرام دے کر الیکشن کی تاریخ پکی کر دی۔ بہت سے لوگوں کے دل سے خدشات نکل گئے۔ "فوج کا انداز اب بدل گیا ہے۔ بنگال کی شکست نے یا بھارت کی قید نے اچھا اثر ڈالا ہے۔ ویسے بھی خون چھپانے کے لیے دستانے پہننا ضروری ہو گیا۔" لوگ ہر قسم کی خیال آرائی کر رہے تھے۔ اتنے میں سیاسی عمل شروع ہو گیا تو باقی لوگ بھی قائل ہو گئے۔ بس ٹھیک ہے۔ جمہوریت کی خانہ آبادی ہوتے ہی فوج کو اپنی بیرکوں میں چلے جانا چاہیے اور سرمایہ دار لوگ جنہوں نے فوجی حکومت کی عمر درازی کے لیے دعائیں اور پیش گوئیاں کی تھیں۔ شرمندہ ہوئے۔ انتخابی عمل زوروں پر آ گیا۔ جلسے جلوس نعرے، احتجاج بڑے بہت بڑے اب انتخاب کے فریق برابر سطح پہ آ گئے تھے۔ قائدِ عوام اب وزیرِ اعظم نہیں تھے۔ اور لوگ خوش تھے کہ الیکشن بہرحال ہونے والا تھا۔

الیکشن کے ابھی دو چار جلسوں کی نوبت ہی آئی تھی کہ ساری بات گڑبڑ ہو گئی۔ پرچہ

یہ لگا کر عوام پھر اسی پارٹی کو ووٹ دیں گے۔ پھر وہی جیتیں گے۔ سرمایہ دار اخبارون
نے اڈیٹوریل لکھنے شروع کیئے اور مذہبی جماعتوں نے دہائی دی۔ اس ملک کے
عوام بہت خود سر ہیں۔ ان کے علاج کے لیے نہ کوئی تعویز ملاں کے پاس ہے نہ
کوئی تدبیر دانشور کے ہاتھ۔ ایک آخری سہارا مارشل لا کا تھا، وہ بھی اب الیکشن
کروانے لگا ہے۔ اور واقعی عوام بڑے پُر اسرار ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی عوام
تھے جو PNA کی تحریک کے دوران بھٹو کی حمایت میں باہر نہیں نکلے۔ بلکہ انھوں
نے وزیر اعظم کو بالکل اکیلا چھوڑ دیا۔ پھر ان کی حکومت معزول ہوئی تو بھی کوئی نوٹس
نہیں لیا۔ مگر جب الیکشن کی بات آئی تو انہوں نے اپنے ہونے کا پتہ دیا۔ اپنے
اس عظیم وجود کا مظاہرہ کیا۔ جس کے بغیر الیکشن کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ بات بات
میں دس بارہ لاکھ کا مجمع ہو جاتا۔ اور صاف صریح اُس گروہ کی مخالفت کرتا جس
میں رد کیئے ہوئے سیاست داں شامل تھے اور ان کے ساتھ جڑے ہوئے سیٹھ
تاجر ملا اور مفتی۔ ان لوگوں نے اپنا الائنس بنا کر الیکشن میں حصہ لیا تھا اور ہار
گئے تھے۔ مگر عوام کی نظروں میں ابھی اتنے رسوا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اب مارشل لا
لگوانے کے بعد اس کی چھتری تلے بیٹھے الیکشن جیت لینے کے خواب دیکھ رہے
تھے۔ ان کی الیکشن (CAMPAIGN) بھی کیا تھی۔ لوگوں سے ووٹ مانگتے۔
اس طرح کہ اگر ہمیں ووٹ دو گے تو ہم تمہیں ایک ایسا نظام دیں گے، جس میں تمہارے
ہاتھ کاٹے جایا کریں گے اور تم سنگسار کیئے جاؤ گے۔ اور اگر تم نے ہمیں ووٹ نہ دیا
تو اگلے جہان میں تمہارے لیے ایک بڑا جہنم ہوگا۔ اور تم اس جہنم کا ایندھن ہو گے
عجیب بھدے اور کوڑھ مغز تھے وہ سیاست کرنے والے۔ یعنی الیکشن جیتنا چاہتے
تھے اور اس طبقے سے نفرت کر رہے تھے، جن کے ووٹ کروڑوں میں ہوتے ہیں۔
اور جیت ہار کی قطعی فیصلہ کرتے ہیں۔ انہیں ابھی تک پتہ نہیں کہ لوگ اَن پڑھ

ہوتے ہیں، مگر لاعلم نہیں۔ بلکہ اتنا گہرا علم رکھتے ہیں کہ اگر چننا ہی پڑے تو دو برائیوں میں سے کمتر درجے کی برائی کو ترجیح دے دیتے ہیں۔ سو اس وقت بھی انہوں نے اُس طرف کو رد کر دیا جس طرف جرنیل بھی کھڑے تھے اور ملّاں بھی۔ اور لگے قائد عوام کی جے بلانے۔ لگتا یوں تھا کہ اب دوسری طرف اُتنے ووٹ بھی نہیں جائیں گے جتنے مارچ کے الیکشن میں چلے گئے تھے۔ کیوں کہ عوام کو پتہ تھا۔ مارشل لا کو کس نے بلایا ہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ چھ مہینوں میں کیا کچھ نہ بدل گیا۔

لوگوں کے تیور دیکھ جمہوریت کے ڈھونگیوں نے ایک بار پھر مارشل لا کا ایپرن جا پکڑا۔ اور صرف دو ہفتے پہلے الیکشن ملتوی کروا دیئے۔ اب احتساب کی باتیں ہونے لگیں پچھلے حکمرانوں کا احتساب ہوگا۔ نہیں صرف ان کا جنہوں نے ووٹ لیکر حکومت بنائی تھی۔ الیکشن کے التوا پر لوگوں کو حیرت نہیں ہوئی۔ لیکن احتساب کے اس قدر محدود ہونے پر کسا نہیں سخت حیرت ہوئی ظلم تو اس زمین پر بہت پرانا ہے۔ عوام کے قاتل تو بہت سارے ہیں۔ مگر حساب کتاب صرف چند برسوں کا۔ بلکہ ایک ہی انسان کا۔ وہی ایک جس کی حیثیت پورے طور سے آئینی اور قانونی تھی۔ مگر خیر یہاں آکر کئی ابہام ختم ہو گئے ظلم اور ظالم کی وضاحت ہو گئی۔ ہر کسی کو پتہ تھا کہ سزا کس کو ملے گی اور کس بات کے لیے۔ عوام کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عوام کو بے نام بے چہرہ اور بے شناخت ہجوم بنا کر تو رکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ جو اس ہجوم کی شناخت بننے کی کوشش کرے یا جیسے عوام خود اپنی شناخت بنانے کا فیصلہ کریں اُسے راستے سے ہٹا دینا بظاہر آسان کام ہے۔ کیا صرف اسی بات کے لیے وہ تحریک چلی تھی جس کا لیڈر ملّاں تھا اور فنانسر سرمایہ دار تھا؟ یہ سوال تاریخ کی سلیٹ پر لکھا جا چکا ہے۔

مگر نوے دن کے اندر اندر ہونے والے الیکشن ملتوی ہو کر قوم کے مقدر دل کی مہر بن گئے۔ اب مارشل لا والوں کو الیکشن کروانے میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں

دیتا۔ پھر کئی نئے کام نکل آتے ہیں۔ ہمسائے ملکوں میں بڑی اہم تبدیلیاں آرہی ہیں ایران کے شہنشاہ کا تخت اُلٹ چکا ہے اور افغانستان میں زمانوں کے بعد آمریت کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اب اس خطے میں سامراج کو جگہ چاہیے۔ وہی جگہ جو ایران میں اس کے لیے تھی۔ اب شاید بہت دنوں تک یہاں الیکشن نہ ہو سکیں۔ یوں بھی، مارشل لا پہلا ہو یا چوتھا۔ اپنا وقت لیتا ہے۔ اپنے کام پورے کرتا ہے۔ اور پھر قدرتی حالات کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔ یہ قدرتی حالات لوگ ہیں۔ لوگوں کے حالات، مسائل اور ان کی سیاست لوگوں کا فیصلہ۔ انہیں کیا چاہیے اور کس طرح حاصل کریں۔ ان کا کام۔ وہ جانیں۔

ہمیں تو صرف انتظار کرنا ہے۔ دیکھیں جمہوریت کی دیوی کب درشن دیتی ہے کب مارشل لاء کا جن اپنا بستر بوریا سمیٹتا ہے۔ کھڑے رہو اور انتظار کرو۔ انتظار کرو۔ اگر نئے لوگوں کو بھی یہی کرنا ہے تو پھر ہم حق بجانب ہوئے۔ یہ کہتے ہیں۔ دیکھائی نسل کے لوگو، تمہارے سامنے بھی وہی ہوا نہ وہی جو ہمارے سامنے ہوا تھا۔ خالی انتظار کرنے سے حالات نہیں بدلتے۔ البتہ انسان بوڑھے ہو جاتے ہیں اور نسلیں کھو جاتی ہیں۔

دسمبر ۱۹۷۷ء

